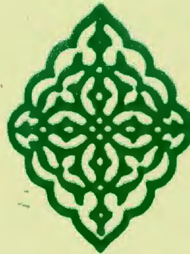
ایرانی ادب

ڈاکٹر ظہورالدّین احمد



مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان ، اسلام آباد
۱۳۷۵ش

PERSIAN LITERATURE

Dr. Zahooruddin Ahmad

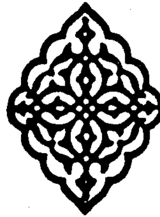


IRAN- PAKISTAN INSTITUTE OF PERSIAN STUDIES,
ISLAMABAD
1996

بسم الله الرحمن الرحيم

ایرانی ادب

ڈاکٹر ظہورالدّین احمد





مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان ، اسلام آباد
۱۳۷۵ش



شناسنامهٔ کتاب

عنوان : ایرانی ادب

تألیف : ذاکتر ظهور الدّین احمد

ناشر : مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان ، اسلام آباد

تیراژ : ۱۰۰۰ نسخه

حروفچینی : عبدالرّشید لطیف ، اسلام آباد

چاپ : وجیهه پرنترز ، راولپندی

تاریخ پخش : ۱۳۷۵ ش / ۱۹۹۶ م

بها : [redacted] روپیه ۵۲۵

انتشارات مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان

شمارۀ ۱۵۳



تأسیس بر مبنای موافقتنامه مورخ آبان ماه ۱۳۵۰ مصوب دولتین ایران و پاکستان

سخن مدیر

خوشبختانه اثری دیگر از محقق و نویسندهٔ گرانقدر آقای دکتر ظهور الدین احمد استاد برجسته زبان و ادبیات فارسی، توسط این مرکز، به مرحلهٔ انتشار می رسد. این اثر، عمدتاً برای بهره برداری و استفادهٔ دانشجویان اردو زبان رشتهٔ زبان و ادبیات فارسی در مقطع فوق لیسانس تدوین شده و نیاز مهمی از آنان را تأمین می کند. البته تاریخ ادبیات فارسی، با توجه به ریشهٔ عمیق، آثار بزرگ، و نویسندگان و سرایندگان متعدد فارسی زبان، به گستردگی خوْد زبان و ادبیات فارسی، وسیع و گسترده است، و بنابر این در این کتاب، همهٔ آن مطالب نمی توانست گرد آوری و ارائه شود، ولی نیاز دانشجویان به متن مختصری برای آشنائی با ادبیات ایران موجب تألیف و انتشار این اثر در این قالب مختصر شده است.

ادبیات معاصر ایران، که بخصوص در ۲۰ سالهٔ اخیر، با تحولات بنیادی اجتماعی و فرهنگی که در ایران رخ داده است، فصل مهم و مفصلی را باید به خود اختصاص می داد، گرچه در این اثر مورد توجه قرارگرفته ولی بخش مختصری در این موضوع عرضه

شده است . البته بررسی مفصل آن را ، نویسنده محترم این کتاب یا دیگر نویسندگان و محققان پاکستانی ، برای آشنائی دانشجویان برعهده خواهند گرفت و ان شاء الله در آینده منشر خواهد شد.

شعرای بزرگ فارسی سرای ایرانی ، نظیر رودکی ، فردوسی ، سنائی ، عطار ، رومی ، سعدی و حافظ و نیز آثار معروف کلاسیک ، از قبیل سیاست نامه، تذکرة الاولیاء و گلستان ، در حد نصاب دورهٔ فوق‌لیسانس زبان وادبیات فارسی برخی دانشگاه‌های پاکستان ، در این کتاب معرفی شده اند. البته چون زبان فارسی نه فقط در سرزمین خاص خود - ایران - بلکه در سایر سرزمین ها و بخصوص در شبه‌قاره هندو پاکستان از سابقه ای هزار ساله برخوردار است، تاریخ این زبان در این خطه ، نیز موضوع مهم و قابل توجه و بررسی برای دانشجویان زبان و ادبیات فارسی در پاکستان است که منبع مورد نیاز این مهم ، " پاکستان مین فارسی ادب "[1] نوشتهٔ مؤلف محترم همین کتاب قبلاً منتشر شده و می تواند برای علاقه مندان و محققان و دانش پژوهان زبان فارسی ، سهم این منطقه را در رشد و گسترش فارسی بنمایاند. به همین جهت است که ، زبان فارسی را فقط زبان ایران نمی دانیم و علاوه بر اینکه زبان فرهنگی و دینی برخی کشورهای دیگر نیز به حساب می‌آوریم ، به عنوان زبان نیاکان خود مردم پاکستان ، پاسداری از آن را ، وظیفهٔ عزیزان پاکستانی شمرده ، و برای دانشجویان پاکستانی زبان و ادبیات فارسی ، نقش عمده‌ای قائلیم که به راهنمائی و کمک اساتید بزرگ و گرانقدر شان ، ان شاء الله این نقش را ایفا خواهند کرد. قطعاً این آخرین اثر ، برای معرفی ادبیات ایران ، نخواهد بود ولی گام مهمی است که تلاش های دیگران را در این مسیر، زمینه سازی کرده خلأ متن مورد نیاز دانشجویان را، تأمین می سازد.

گرچه صلاحیت علمی نویسندهٔ این کتاب که استاد بسیاری از استادان فارسی پاکستان به شمار می آید و تبحر ایشان ، که از سایر

۱ - پاکستان مین فارسی ادب [ادب فارسی در پاکستان] (اردو) پنج جلد، لاهور، ۱۹۶۴، ۱۹۷۴، ۱۹۷۷، ۱۹۸۵ و ۱۹۹۰م.

آثارشان هویداست،[1] موجب اطمینان استادان وَ دانشجویان برای متن قراردادن این کتاب برای درس "ادبیات ایران " است، ولی به هیچوجه آنان را از مطالعه و مراجعه به متون مفصل در این باب به زبان فارسی ، بی نیاز نمی کند و به عنوان کلید و فهرستی برایِ آنان، راه را به سوی اطلاعات و مطالعه بیشتر ، باز می نماید.

از نویسندهٔ محترم که خواهش این مرکز را برای تألیف این اثر پذیرفتند و از همه همکاران محترمی که برای آماده شدن این اثر برای چاپ تلاش های طاقت فرسائی را متحمل شدند بخصوص همکار پژوهشگرمان ، خانم انجم حمید، سپاسگزاری می کنم و توفیق استفادهٔ کامل از این اثر را برای دانشجویان ، از خداوند متعال خواستارم.

علی ذو علم
سرپرست مرکز
مرداد ۱۳۷۵ هـ.ش / ۱۹۹۶م

---

۱ – علاوه به این بعضی از آثار آقای دکتر ظهور الدین احمد بدین شرح اند:
*** نیا ایرانی ادب [ادب جدید ایران] (اردو)، لاهور، چند چاپ از سال ۱۹۵۷ تا ۱۹۹۶م.**
*** ایران شناسی ، لاهور، ۱۹۵۸.**
*** ابو الفضل علامی، احوال و آثار (فارسی ، رسالهٔ دکتری) ، لاهور، ۱۹۷۵م**
*** خلاصهٔ جواهر القرآن فی بیان معانی لغات القرآن از ابو بکر اسحاق ملتانی، تصحیح و تحشیه از آقای دکتر ظهور الدین احمد، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان ، اسلام آباد ، ۱۳۶۴ش.**
*** کتاب دانش ، دو مجلد، مجموعهٔ مقالات ، ۱۹۷۵م.**
*** تصحیح رسائل علامه جلال الدین دوانی شیرازی ، لاهور.**
*** نقد شعر فارسی در شبه قاره ، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان ، اسلام آباد، ۱۳۷۴ ش / ۱۹۹۵م.**
*** مقالات درباره ادبیات انقلاب اسلامی ، مترجم دکتر ظهور الدین احمد، به اهتمام خانه فرهنگ جمهوری اسلامی ایران ، لاهور ، ۱۳۷۴ش / ۱۹۹۵م.**

سخن مدیر *

خوشی قسمتی سے عالی مرتبہ محقق ، مصنف اور فارسی زبان و ادب کے ممتاز استاد جناب ڈاکٹر ظہور الدّین احمد کی ایك اور تصنیف مرکز سے شائع ہو رہی ہے . یہ کتاب خاص طور پر ایم ۔ اے فارسی کے ان طلبا و طالبات کے لیے لکھی گئی ہے جن کا ذریعہ تعلیم اردو ہے ، اور یہ ان کی ایك اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے . بے شك فارسی ادب کی تاریخ اپنی اصل کی گہرائی ، عظیم تصانیف ، اور مصنفوں اور شاعروں کی تعداد کے اعتبار سے خود فارسی زبان و ادب کی طرح بہت وسیع اور پھیلی ہوئی ہے لہذا اس کتاب میں وہ سب مضامین یکجا بیان نہیں ہو سکتے تھے . لیکن طالبعلموں کو ایرانی ادب سے آشنائی کے لئے ایك مختصر متن کی ضرورت تھی اور یہی ضرورت اس مختصر کتاب کی تصنیف اور اشاعت کا باعث بنی ہے .

اس کتاب میں ایران کے عصری ادب کے بارے میں ، بالخصوص

---

* یہ متن سخن مدیر کا اردو ترجمہ ہے ۔

حالیه بیس برسوں میں ایران میں جو بنیادی سماجی اور ثقافتی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں - ایك اہم اور مفصل باب ہونا چاہیے تھا . اگرچه اس کتاب میں یه موضوع زیر بحث آیا ہے . لیکن اختصار سے کام لیا گیا ہے - امید ہے اس کتاب کے فاضل مصنف یا دوسرے پاکستانی محققین اور ادبا ، طلبا کی آشنائی کے لئے اس موضوع کا تفصیلی جائزہ لیں گے اور جو ان شاء اللہ مستقبل میں شائع کیا جائے گا.

اس کتاب میں پاکستان کی بعض یونیورسٹیوں میں ایم - اے فارسی کے نصاب میں شامل ایران کے بڑے فارسی شعرا رودکی ، فردوسی ، سنائی ، عطار ، رومی ، سعدی اور حافظ اور مشہور کلاسیك کتابوں سیاست نامه ، تذکرة الاولیا اور گلستان متعارف ہوئی ہیں . بے شك فارسی زبان نه صرف اپنے خاص وطن ایران میں بلکه دوسرے علاقوں اور خاص طور پر برصغیر پاکستان و هند میں هزار ساله تاریخ رکھتی ہے لهذا پاکستان میں فارسی کے طلبا کے لیے اس خطے میں اس زبان کی تاریخ ایك اہم اور قابل توجه اور لائق تحقیق موضوع ہے . اس موضوع پر اسی فاضل مصنف کی کتاب « پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ » (۱) پہلے شایع ہوچکی ہے ، جس کی مدد سے فارسی زبان کے شائقین اور محققین اس علاقے میں فارسی زبان کی ترویج و ترقی سے باخبر ہو سکتے ہیں - یہی وجه ہے که هم فارسی کو صرف ایران کی زبان نہیں سمجھتے یه نه صرف بعض دوسرے ممالك کی بھی ثقافتی اور مذہبی زبان ہے بلکه خود پاکستان کے لوگوں کے

۱- پاکستان میں فارسی ادب ، پانچ جلدیں ، لاهور ، ۱۹۶۴، ۱۹۷۴، ۱۹۷۷ ، ۱۹۸۵ و ۱۹۹۰م .

اجداد کی زبان بھی ہے - یہی وجہ ہے کہ ہم زبان کا تحفظ خود پاکستانی دوستوں کا فریضہ سمجھتے ہیں اور خاص طور پر اس سلسلے میں فارسی زبان و ادب کے پاکستانی طلبا کا ایک اہم کردار ہے جو ان شاء اللہ وہ اپنے محترم اساتذہ کی مدد اور راھنمائی سے ادا کریں گے . یقینی طور پر یہ ایرانی ادب کے تعارف کے سلسلے کی آخری کتاب نہیں ہوگی . بلکہ دوسروں کے لیے تحقیق کا راستہ ھموار کرنے کے لیے اہم قدم ہے تا کہ طلبا کی ضروریات کا خلا پورا کیا جاسکے .

اس کتاب کے مصنف جن کا شمار پاکستان کے بہت سے فارسی اساتذہ کے استاد کے طور پر ہوتا ہے ، کی علمی صلاحیت اور تبحر ان کی دوسری تصانیف سے ظاہر ہے - (۱) اگرچہ اس کتاب کو ایرانی ادب

۱- جناب ڈاکٹر ظہور الدّین احمد کی بعض دوسری تصانیف درج ذیل ہیں :

* نیا ایرانی ادب، لاهور، یہ کتاب ۱۹۵۷سے ۱۹۹۶ تک متعدد بار طبع ہوئی.
* ایران شناسی ، لاهور ، ۱۹۵۸م .
* ابوالفضل علامی ، احوال و اثار ، لاهور ، ۱۹۷۵م .
* خلاصۂ جواهر القرآن فی بیان معانی لغات القرآن از ابوبکر اسحاق ملتانی ، تصحیح و تحشیه از دکتر ظهور الدّین احمد ، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان ، اسلام آباد ، ۱۳۶۴ هـ.ش.
* کتاب دانش ، دو مجلد ، مجموعۂ مقالات ، ۱۹۷۵م.
* تصحیح رسائل علامه جلال الدّین دوانی شیرازی ، طبع لاهور .
* نقد شعر فارسی در شبه قاره ، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد ، ۱۳۷۴ هـ.ش./۱۹۹۵م.
* مقالات درباره ادبیات انقلاب اسلامی ، مترجم دکتر ظهور الدّین احمد ، به اهتمام خانه فرهنگ جمهوری اسلامی ایران ، لاهور ، ۱۳۷۴ش/۱۹۹۵م.

کے درس کے لیے نصاب میں شامل کرنے سے اساتذہ اور طالب علموں کو اطمینان حاصل ہوگا ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس موضوع پر مفصل فارسی متون کے مطالعہ اور مراجعہ سے بے نیاز ہوجائیں ۔ یہ کتاب ان کے لئے مضامین کی فہرست اور کلید کی حیثیت رکھتی ہے اور مزید معلومات اور مطالعہ کی جانب راستے کی نشاندھی کرتی ہے ۔

میں فاضل مصنف جنہوں نے مرکز کی درخواست پر یہ کتاب لکھی ، اور اپنے تمام رفقا بالخصوص ادارے سے وابستہ محققہ خانم انجم حمید کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مسودے کو طباعت کے لیے تیار کرنے میں طاقت فرسا مساعی کیں ۔ خداوند تعالی سے دعا ہے کہ وہ طالبعلموں کو اس کتاب سے مکمل استفادے کی توفیق عطا کرے ۔

علی ذوعلم
سرپرست مرکز
مرداد ۱۳۷۵ ھ. ش/ ۱۹۹۶م

پیش لفظ

اس کتاب میں فارسی ادب کے وہ اجزاء شامل کئے گئے ہیں جن کا جاننا فارسی ادب کے فارغ التحصیل ہونے والے طالب علم کیلئے ضروری ہے . مندرجات کے مطالعه سے اس بات کا اندازه ہو جائے گا که مجموعی طور پر مشہور شعراء و نثر نگاروں کا تعارف پیش ہوگیا ہے . ایرانی ادب کی تاریخ بے شمار جلدوں میں مرتب ہو سکتی ہے اور دوسرے یه که تمام مصنفین کا احاطه کرنا ایك شخص کے بس کی بات نہیں .

شعراء اور ادباء کے تعارف میں تذکروں ، تاریخوں ، اساتذۂ ادب کی کتابوں اور مقالات سے استفاده کیا گیا ہے . لیکن اس جگه ان کے حوالوں سے کتاب کو ثقیل نہیں کیا . اس طرح نادانسته طور پر اساتذه کے اقوال کو اپنالیا گیا ہے . جس کیلئے معذرت خواه ہوں .

ہر موضوع کے متعلق اتنا کچھ لکھ دینے کی کوشش کی ہے که ایك ایم . اے کے طالب علم کیلئے امتحانی نقطۂ نظر سے کافی ہو .

فارسی ادب کے عام قاری کے لیے مجموعی طور پر اس کتاب کے توسط سے ایران میں فارسی ادب کا اچھا خاصا تعارف ہو جائے گا.

اس کتاب کی اشاعت کے لئے مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان کے سرپرست جناب آقائے علی ذوعلم کا شکر گزار ہوں جن کی سنجیده کوشش سے یه کتاب اچھے طریقے سے شایع ہوئی.

ڈاکٹر ظہورالدّین احمد

لاهور

۱۳۷۵ هـ.ش./۱۹۹۶م

فهرست مندرجات

***

ایرانی ادب

بخش یکم :

قدیم زبانیں

فارسی باستان

موجودہ فارسی کی اصل و بنیاد جن قدیم زبانوں میں ملتی ہے ۔ ان میں سے ایك فارسی باستان ہے ۔ جو ایران میں ھخامنشیوں کے زمانہ سلطنت ۵۵۹- ۳۳۰ ق.م میں سرکاری زبان تھی ۔ یہ زبان خط میخی میں لکھی جاتی تھی ۔ اس زبان کے آثار پتھر پر کندہ کتبوں ، پتھروں ، سونے چاندی کی تختیوں ، نگینوں اور برتنوں پر کھدے ہوئے ملتے ہیں. جن ھخامنشی بادشاہوں کے آثار اس زبان میں موجود ہیں ان کے نام یہ ہیں :

کوروش اعظم (۵۵۹-۵۲۱ ق. م)، داریوش بزرگ (۵۲۱-۴۸۶ ق.م)، خشایار شاہ (۴۸۶-۴۶۵ ق.م)، اردشیر اوّل (۴۶۵-۴۲۵ ق.م)، داریوش دوم (۴۲۹-۴۰۵ ق. م)، اردشیر دوم (۴۰۴-۴۵۹ ق.م)، اردشیر سوم (۳۵۹-۳۳۸ق.م) یہ کتبات مندرجہ ذیل مقامات سے دستیاب ہوئے ہیں :

مرغاب ، تخت جمشید ، نقش رستم (فارس) شوش(عیلام)،کوہ بیستون ، ھمدان ، الوند(ماد)، وان (ارمنستان)اور سوئز (مصر) ۔

سب سے بڑا کتبہ وہ ہے جو کوہ بیستون پر تین قسم کے خط میخی میں اور تین مختلف زبانوں یعنی فارسی باستان ، بابلی اور عیلامی میں کندہ ہے ۔ یہ کتبہ داریوش بزرگ (۵۲۲-۴۸۶ ق .م) کے فرمان سے کندہ کیا گیا تھا ۔ اس میں شہنشاہ نے اپنے چار پانچ سال کے عہد حکومت کے واقعات کو قلمبند کرایا ہے . اور ان حریفوں کی شکست اور قتل کا ذکر کیا ہے .جو اس کے مقابل آئے۔ فارسی باستان ۵۱۵ سطروں میں، بابلی ۱۴۱ سطروں میں اور عیلامی ۹۵۰ سطروں میں ہے ۔

اس زبان کا قدیم ترین نمونہ وہ ہے جو چند چھوٹے چھوٹے جملوں پر مشتمل ہے اور دشت مرغاب (فارس)میں دستیاب ہوا ہے اور کوروش سے متعلق ہے . مرغاب ھخامنشیوں کا سب سے پہلا دارالسلطنت رہا ھے ۔ یونانیوں نے اسے «پاسارگاد» لکھا ہے . داریوش نے اپنا پایۂ تخت اس مقام کو منتخب کیا ہے ، جسے آجکل «تخت جمشید» کہتے ہیں ۔ اور یونانیوں نے «پرس پولیس» (Persc Polics) کے نام سے اس کا ذکر کیا ہے۔ حمد اللّٰہ مستوفی نے نزھة القلوب (۸۴۰ ھ) میں «چھل منار» کے نام سے اس کا

تذکرہ کیا ہے ۔ فارسی باستان کا جدیدترین نمونہ وہ ہے جو اردشیر سوم سے متعلق ہے ۔ اور تخت جمشید میں موجود ہے ۔

خط میخی عیسوی سن کے آغاز سے پہلے ہی ناپید ہوگیا اور اس کی جگہ خط آرامی نے لے لی ۔ اس کے بعد یہ پرانی زبان اور اس میں لکھی ہوئی چیزیں گوشۂ گمنامی میں جا پڑیں ۔ ھخامنشیوں کی تحریریں سحر آمیز نقوش شمار ہوتی رہیں یہاں تک کہ جرمنی کے سیاح کارستن نبوہو (Carsten Nicbuhs)نے مارچ ۱۷۶۵ میں تخت جمشید کے دو کتبوں کی تصویریں بنائیں ۔ گروتفند (Grothfend) نے ۱۸۰۲م میں ان دو تصویروں کے مطالعے کے بعد خط میخی کا انکشاف کیا ۔ اس کے بعد آھستہ آھستہ ڈیڑھ سو سال کے تجسس اور کاوش کے نتیجے میں خط میخی کے تمام کتبات پڑھے جا چکے تھے ۔ اور آج ھم اس زبان کو صرف و نحو تك جاننے کے قابل ہوگئے ہیں . اب تك اس زبان کے چھ سو کے قریب الفاظ معلوم ہوچکے ہیں ۔ جن کا استعمال مذکورہ بالا تحریروں میں ہوا ہے۔ ۱۳۱۲ شمسی ھجری میں تخت جمشید سے کئی ھزار مٹی کی اینٹیں نکلی ہیں ۔ جن پر عیلامی خط میخی میں تحریریں موجود ہیں ۔ ان پر بارہ مہینوں کے نام لکھے ملے ہیں ۔ اس سے پہلے صرف نو نام معلوم تھے۔ اس عیلامی میں بھی فارسی باستان کے چند نئے الفاظ پڑھے گئے ہیں ۔

آثار

فارسی باستان کی کوئی تحریر کتابی شکل میں موجود نہیں البتہ پتھروں پر کندہ تحریریں منکشف ہوئی ہیں ۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :

۱- شہرپاسارگاد میں خط میخی میں ایك عبارت دستیاب ہوئی ہے جن کے الفاظ یہ ہیں « من کوروش ھخامنشی ام » ایك مجسمہ پر یہ عبارت لکھی ہوئی ملی ہے . «من کوروش شاہ بزرگم» ۔

۲- کوہ بیستون میں ایك بہت بڑے پتھر پر دو کتبے درج ہیں ۔ بڑا کتبہ خط میخی میں ھے ۔ اور فارسی قدیم ، عیلامی اور بابلی زبانوں میں ہیں ۔ اور دو ھزار الفاظ پر مشتمل ہے ۔ چھوٹا کتبہ فارسی اور عیلامی زبان میں ہے اور ڈیڑھ سو الفاظ پر مشتمل ہے ۔ ان تحریروں میں داریوش نے اپنی فتوحات کا ذکر کیا ہے ۔ پرویا کی بغاوت فرو کرنے اور دوسرے نوسرکشوں کو شکست دینے کا حال بیان کیا ہے ۔ اس تحریر سے عہد ھخامنشی کی تاریخ کا کچھ حصّہ روشن ہوا ہے ۔

۳- کتبۂ تخت جمشید - تخت جمشید میں ایك شہر آباد تھا ۔ شاھی محلات کے آثار اب تك دیکھے جا سکتے ہیں ۔ یہاں عمارات ہیں اور دوسری جگہوں میں داریوش

خشایار شاہ اور اردشیر کے کتبے باقی رہ گئے ہیں ۔ یہ تین زبانوں فارسی ، عیلامی اور آشوری میں لکھے گئے ہیں ۔ ان کے علاوہ تین ہزار اینٹیں ملی ہیں۔ جن پر خط میخی تحریر موجود تھی ۔ سونے چاندی کی تختیاں بھی دستیاب ہوئی ہیں جن پر خط میخی میں تحریریں کندہ ہیں ۔

۴- آبنائے سویز میں کتبہ - یہ داریوش اوّل کی طرف سے لکھا ہوا ھےاور اسی الفاظ پر مشتمل ہے۔

۵- کتبہ نقش رستم - یہاں بلند پہاڑ پر داریوش اپنے تخت پر دکھایا گیا ہے یہاں بھی اس کے حکم سے تحریر کندہ ہے ۔

۶- شوش کے کتبے - شوش ھخامنشیوں کا سرمائی دارالحکومت تھا ۔ اس کے آثار میں سے اینٹیں ملی ہیں جن پر خط میخی میں تحریریں موجود ہیں ۔ یہ بھی فارسی اور بابلی زبانوں میں ہیں ۔ ایک بڑا کتبہ ملا ہے جو کتبہ بیستون سے دوسرے درجے پر ہے۔ شوش کے محلات اور قلعہ سے مکشوفہ ستونوں ، مجسموں ، تختیوں سنگ مرمر کی میزوں وغیرہ پر بھی چھوٹی چھوٹی تحریریں فارسی ، عیلامی اور آشوری میں لکھی ہوئی ملی ہیں ۔

۷- کرمان میں پتھر کا ایک ٹکڑا ملا ہے جس پر داریوش نے تین زبانوں میں اپنا اور اپنے باپ کا نام کندہ کروایا ہوا ہے ۔

۸- کوہ الوند پر کندہ دو کتبے ملے ہیں . ایک پر اھورا مزدا کی تعریف ہے اور دادا نور اس کے باپ کا نام درج ہے ۔ دوسرا کتبہ خشایار شاہ کے نام سے ہے اور پہلے کتبہ سے مشابہ ہے ۔

۹- ھمدان کے کتبے -

۱- دو پتھروں کی سلیں موجود ہیں ۔ جن پر داریوش نے اپنی حکومت کی حدود کو مشخص کیا ہے ۔

۲- ستون کے نچلے حصے پر اردشیر دوم کا کتبہ جس پر اُس نے اپنے اور اپنے باپ کا نام درج کیا ہے۔ اور اھورا مزدا ، اناھیتا اور میترا کی تعریف کی ہے ۔

۱۰- کتبہ وان - قلعہ کے اندر ایک نہایت صاف و شفاف عمودی پتھر پر خشایار شاہ نے اھورا مزدا کی تعریف کے بعد اپنا تعارف کرایا ہے ۔

۱۱- داریوش کی چھار گوشہ مھر جس پر کندہ ہے « من داریوش شاہ ام » ۔

۱۲-مرمر سیاہ کا ایک باٹ جس پر « منم داریوش شاہ بزرگ پرویتاب ھخامنشی »

کندہ ہے ۔

۱۳- گلدانوں پر خشایار شاہ بزرگ اور اردشیر بزرگ کے نام درج ہیں بعض مہروں پر اس دور کے خاص نام کندہ دستیاب ہوئے ہیں ۔

ان متذکرہ کتبوں کے علاوہ دوسری جگہوں سے بھی کتبے دستیاب ہوئے ہیں ۔ جو دوسری زبانوں میں ہیں ۔ ان میں سے بعض تو ختم ہو چکے ہیں اور کچھ ناقص حالت میں موجود ہیں ۔ بعض اشیاء بھی دریافت ہوئی ہیں جن پر خط میخی میں بادشاہوں کے نام درج ہیں ۔ بیستون اور تخت جمشید کی زبان کے نمونے موجودہ حروف ہجائی میں پیش کئے جاتے ہیں ۔ اور نیچے فارسی ترجمہ دیا جاتا ہے ۔

۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶

۸ ۹ ۱۰ ۱۱ ۱۲ ۱۳

۱۴ ۱۵ ۱۶ ۱۷ ۱۸ ۱۹

۲۰ ۲۱ ۲۲ ۲۳ ۲۴ ۲۵

۲۶ ۲۷ ۲۸ ۲۹ ۳۰ ۳۱

۳۲ ۳۳ ۳۴ ۳۵ ۳۶

تلفظ حروف فوق

۱	۲	۳	٤	۵	٦	۷	۸	۹
آ	ای	او	کا	کو	گا	گو	خا	چا
۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱٤	۱۵	۱٦	۱۷	۱۸
جا	جی	تا	تو	دا	دی	دو	پا	با
۲۰	۲۱	۲۲	۲۳	۲٤	۲۵	۲٦	۲۷	۲۸
فا	نا	نو	ما	می	مویا		وا	وی
۲۹	۳۰	۳۱	۳۲	۳۳	۳٤	۳۵	۳٦	
را	رو	لا	سا	زا	شا	درا	ها	

اوستائی

اوستائی وہ زبان ہے جو زرتشتیوں کی کتاب مقدس اوستا کی زبان ہے ۔ یہ زبان بھی ایرانی الاصل ہے اور موجودہ فارسی کی اصل و بنیاد شمار ھوتی ہے ۔ یہ زبان کئی لحاظ سے فارسی باستان سے مشابہ ہے ۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ زبان کہاں بولی جاتی تھی ۔ شمال مغرب میں یا آذربائیجان میں جو زرتشت کی جائے پیدایش تھی ۔ یا شمال مشرق یعنی بلخ میں جہاں زرتشت نے گشتاسپ کے پاس پناہ لی ۔ اور جس سرزمین سے ان کے پیرو پیدا ہوئے اور رفتہ رفتہ ان کی تعلیمات دوسرے علاقوں میں پھیل گئیں ۔ چونکہ یہ زبان زرتشتیوں کے عقاید و عبادات و اعمال کی زبان رہی ہے اس لئے اس دین کے پیرووں کی اپنی زبان میں اس زبان کا دخیل ہونا لازمی تھا ۔ چنانچہ ساسانیوں کے زمانۂ سلطنت میں پہلوی زبان میں اوستا کی جو تفسیر لکھی گئی اس میں اوستائی کے سینکڑوں الفاظ مستعمل ہیں. یہ زبان جس خط میں لکھی جاتی تھی تاحال اس کا کوئی سراغ نہیں ملا ۔ اوستا جس خط میں لکھی گئی ہے وہ خط آرامی سے ماخوذ ہے . اور ساسانیوں کے عہد سلطنت میں وضع کیا گیا تھا ۔

زبان اوستائی دنیا کی قدیمترین زبانوں میں شمار ھوتی ہے اور سنسکرت اور ویدوں کی زبان کے ہم پلہ ہے ۔ تاریخی اعتبار سے زرتشت کا زمانہ پندرہ سو سال قبل از مسیح سے کمتر نہیں ھوسکتا ۔ گویا یہ زبان تقریباً تین ہزار سال پرانی ہے ۔ یعنی موجودہ فارسی الفاظ کی سند تین ہزار سال پہلے کی زبان میں موجود ہے . موجودہ اوستا مندرجہ ذیل حصوں پر مشتمل ھے ۔ یسنا ، ویسپرد ، یشتھا ، وندیداد ، خُردہ اوستا سب سے اصل حصہ گاتھاھا ھے ۔ ساسانیوں کے عہد سلطنت میں اکیس نسك (اجزاے کتاب) موجود تھے ۔ عربوں اور تتاریوں کے حملوں میں کافی حصہ ضائع ھوگیا اور اب ایك چوتھائی حصہ باقی ہے ۔ اوستا کے بہت سے اصلی الفاظ تفسیر پہلوی اور دوسری پہلوی تحریروں میں باقی رہ گئے ہیں ۔ ان تمام ماخذات میں زبان اوستا کے چھ ہزار الفاظ موجود ہونگے ۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ اوستا کے قطعات پہلے سینہ بسینہ چلے آتے تھے ۔ پھر ایك خط میں لکھے گئے . ھخامنشیوں کے اواخر میں کتاب کی صورت میں مدون و مرتب تھے ۔ حملۂ سکندر (۳۳۱ ق .م) کے وقت شاھی دبیرخانہ اور گنجینہ شیزگان میں دو نسخے محفوظ تھے ۔ اوّل الذکر تو شاھی محل کے ساتھ جل کر راکھ ھوگیا ۔ دوسرا بچ گیا جو یونانیوں کے تصرف میں آیا اور بعد میں جس کا ترجمہ یونانی میں ہوا ، اشکانیوں کے

عہد سلطنت میں بلاش اولؔ (۵۱-۷۸ء) کے حکم سے اوستا کے متفرق اجزاء کو جمع کیا گیا۔ اردشیربابکان (۲۲۴-۲۴۱ء) نے دوبارہ اوستا کو مدون کرایا اور خزانہ شاھی میں محفوظ کیا۔ شاپور اولؔ کے عہد سلطنت (۲۴۱-۲۷۲ء) میں طب، نجوم، جغرافیہ اور فلسفہ کے افکار، ہندی اور یونانی ماخذوں سے حاصل کرکے اوستا میں پڑھائے گئے۔ چونکہ مذہب میں بہت سے اختلافات رونما ھوچکے تھے۔ اس لئے شاپور دوم (۳۰۹-۳۷۰ء) نے آوزبدمار سپندان کو حکم دیا کہ وہ ان اختلافات کو رفع کرنے کی غرض سے تجدید نظر کرے۔ چنانچہ اس نے دینداروں کی ضرورتوں کے مدنظر مطالب اقتباس کرکے خردہ اوستا مرتب کی۔

اوستا جس خط میں لکھی گئی اس کے حروف تہجی کو دین دبیری کہتے تھے۔ اشکانیوں اور ساسانیوں کے زمانوں میں زبان اوستا متروك ہوچکی تھی۔ اسلئے خیال پیدا ہوا کہ نئے خط میں اسکو محفوظ کر لیا جائے تا کہ دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ جائے لیکن وقت کی زبانوں یعنی پہلوی اشکانی اور پہلوی ساسانی کے مروجہ رسم الخط بڑے ناقص اور پیچیدہ تھے اور ان کا درست پڑھنا غیر یقینی تھا۔ مثلاً علامت «ا» کو و، ن، ر، ل پڑھا جا سکتا ہے۔ اسلئے علمائے دین نے پہلوی سے ملتا جلتا ایك خط نکالا جس میں حروف کی تعداد چوبیس ہے۔ ہر صامت اور مصوّت کیلئے الگ الگ علامت مقرر ہے۔ اسلئے خط اوستائی کا شمار دنیا کے بہترین خطوں میں ھوتا ہے۔ اس خط کی برکت سے اوستا کا حرف حرف محفوظ ہو گیا۔

پہلوی کتابوں کی روایت کے مطابق عہد ھخامنشیوں کی اوستا ایك ھزار فصل پر مشتمل تھی اور اکیس کتابوں یا نسکوں میں منقسم تھی۔ سکندر کے حملے میں اس کا بہت سا حصہ ضائع ہوگیا۔ ساسانیوں کے زمانے میں جب دوبارہ منتشر شیرازوں کو اکٹھا کیا گیا۔ تو صرف ۳۴۸ فصلیں دستیاب ہوئیں۔ ان کو بھی پرانی تقسیم کے مطابق اکیس نسکوں میں منقسم کیا گیا۔ پروفیسر ویسٹ کی گنتی کے مطابق اس کے کلمات کی تعداد ۳۴۵۷۰۰ تھی۔ عربوں اور مغلوں کے حملوں سے اس کا اور بھی حصہ ضائع ہو گیا۔ موجودہ باقی ماندہ اوستا ۸۳۰۰۰ الفاظ پر مشتمل ھے۔ ۱۳۲۵ء کا لکھا ہوا اوستا کا قدیم ترین نسخہ کوپنھاگ میں موجود ہے۔

موجودہ اوستا پانچ حصوں میں منقسم ہے ۔ ۱- یسنا، ۲- ویسپرد، ۳- وندیداد، ۴- یشتہا اور۵- خردہ اوستا۔

۱- یسنا

اوستا کا بڑا اہم حصہ ہے۔ یسنا کے معنی ستائش پرستش، نماز اور

جشن ہیں ، جشن اسی لفظ سے مشتق ہے ۔ سنسکرت میں یجنہ اور پہلوی میں یزشن ہے ۔ یہ حصّہ بہتر فصلوں پر مشتمل ہے ۔ ہر فصل کوھائیتی یاھا یا ھات کہتے ہیں ۔ پارسی لوگ جو اپنی کمر کے گرد زنار کی طرح کُستی کو تین مرتبہ لپیٹتے ہیں ۔ وہ انہیں بہتر «ھا» کی مناسبت سے سفید اون کے بہتر دھاگوں سے بنی ہوتی ہے ۔ ان بہتر فصلوں میں سترہ فصلیں وہ ہیں جو گاتھا کے نام سے مشہور ہیں اور یہ اوستا کا قدیم ترین حصّہ ھے ۔ صرف و نحو اور زبان و فکر کے اعتبار سے یہ حصّہ اوستا کے باقی حصّوں سے مختلف ہے ۔ گاتھا کے معنی سرود یا گیت کے ہیں ۔ یہ لفظ پہلوی میں گاسا ہے اور سنسکرت میں گاثا ، گاتھا خود پانچ حصّوں پر مشتمل ہے ۔

۲- ویسپرد

یہ کلمہ دو لفظوں سے مرکب ہے ویسپ + رد ۔ ویسپ کے معنی ہیں تمام ۔ اور رد کے معنی ہیں دلیرودانا ۔ رد کلمہ اوستائی رتو سے ماخوذ ہے ۔ یہ مستقل کتاب نہیں ہے بلکہ یسنا کے ملحقات میں شمار ہوتی ہے ۔ اور مراسم مذہبی میں یسنا کے بغیر پڑھی نہیں جاتی ۔ اس کی فصلوں کو کروہ کہتے ہیں جو کلمہ اوستائی کرتی سے ماخوذ ہے جس کے معنی فصل یا باب کے ہیں ۔

۳- وندیداد

اس کا اوستائی نام وی دئوداتہ (Vidaevadata) تین لفظوں سے مرکب ہے۔ وی معنی ضد ۔ دئو یعنی دیو اور داتہ یعنی داد یعنی قانون مجموعی معنی ہوئے دیو یعنی شیطان کے خلاف قانون ۔ اس کی ہر فصل کو فرگرد کہتے ہیں ۔ اور وہ بائیس فصلوں پر مشتمل ہے پہلی فصل میں زمین و ممالك کی آفرینش کا بیان ہے ۔ دوسری میں داستان جم ہے ۔ تیسری میں دنیا کی راحت و ناراحت کا بیان ہے ۔ باقی دینی احکام پر مشتمل ہیں مثلاً قسم کھانا ، وعدہ کرنا اور عہد توڑنا ، جسم اور پانی کو پاك و صاف رکھنا ، توبہ اور کفارہ ، خیر کے آداب ، لاش اور مردار سے پرہیز ، مرغ کا بیان جو لوگوں کو اپنی بانگ سے خدا کی حمد و ستائش کیلئے بیدار کرتا ھے ۔ آخر میں کتے کی صفات بیان کی ہیں اور اس کو عزیز رکھنے کی نصیحت درج ھے ۔

۴- یشتہا

یہ بھی یسنا سے ماخوذ ہے ۔ لیکن اسکے معنی اس نیایش اور فدیہ کے ہیں ، جو پروردگار امشاسپندان اور ایزداں کیلئے مخصوص ہو ۔ یشت اپنی پہلی صورت میں ھجائی اشعار کا عمدہ نمونہ تھے لیکن اب چونکہ تفسیر کا حصّہ بھی متن میں شامل ہوگیا ھے اسلئے وہ پہلا وزن قائم نہیں رہا ۔ لیکن اب بھی آٹھ آٹھ دس دس ھجا پر

مشتمل موزوں اشعار ترتیب دیئے جاسکتے ہیں ۔ کل اکیس یشت ہیں :

۵- خردہ اوستا

یعنی چھوٹی اوستا ۔ آذر بد مہر اسپند موبد موبدان نے شاپور دوم (۳۱۰-۳۷۹ء) کے عہد میں اس کو مرتب کیا ۔ یہ گویا ایک زرتشتی کیلئے مختصر انجیل ہے ۔ جس میں سال کے مذہبی تہواروں ، متبرک دنوں اور دن کے مختلف اوقات میں نمازوں اور دعاؤں کا ذکر ہے۔ صدرہ پہنتے۔ کستی باندھنے ۔ بیاہ شادی اور ماتم کی تمام رسوم سے بحث کی گئی ہے ۔ اس کتاب کا تمام متن اوستائی میں نہیں ہے بلکہ پازند میں ہے اور بہت بعد کے زمانے کا اضافہ ہے ۔

خردہ اوستا کی کچھ نمازیں نیایش کے نام سے مذکور ہیں اور وہ پانچ ہیں :

۱- خورشید نیایش ۲- مہر نیایش ۳- ماہ نیایش

۴- اردو یسود نیایش ۵- آتش بہرام نیاش ۔

ان نیایشوں کے بعض حصّوں میں خورشید یشت ۔ ماہِ یشت ، آبان یشت اور بہرام یشت کے اشعار بھی شامل ہیں ۔

اس کتاب کے ایک حصے کا نام سیروزہ ہے اور یہ دو ہیں ۔ ایک بڑا اور دوسرا چھوٹا ۔ اسکا ہر قطعہ تیس دنوں میں سے ایک دن کے فرشتے سے منسوب ہے اور اسی نام سے پکارا جاتا ہے ۔ چند ایک اور نمازیں ہیں جو مختلف جشنوں کیلئے مخصوص ہیں ۔ ان کو آفرینگان کہتے ہیں ۔ یہ کلمہ آفرین سے مشتق ہے جس کے معنی دعا و نیایش ہے ۔

زند

یہ لفظ اذنتی (azanti) سے مشتق ہے جس کے معنی شرح و بیان و تفسیر ہے ۔ زبان پہلوی کے رواج سے پہلے خود زبان اوستائی میں ہی اوستا کی تفسیر لکھی گئی تھی ۔ لیکن وہ متن کے ساتھ خلط ملط ہوگئی کہ اصل منظوم متن ہی غیر یقینی ہوگیا اور یہ حملہ اسکندر میں اوستا کے ساتھ ہی ضائع ہوگئی ۔ جب دوبارہ اوستا کے منتشر اوراق جمع ہوئے تو یہ تفسیر بھی ساتھ ہی محفوظ رہی۔ بلاش اوّل شاہ اشکانی (۵۱- ۷۸ء) کے عہد میں جب اوستا تدوین ہوئی تو اس کا ترجمہ پہلوی زبان (اشکانی) میں ہوا ۔ اور تبھی سے تفسیر پہلوی یعنی زند شروع ہوئی اور ساسانی عہد کے اواخر تک جاری رہی ۔ ظاہر ہے کہ اشکانیوں کے زمانے میں لکھی ہوئی تفسیر پہلوی اشکانی میں تھی ۔ پھر ساسانی پہلوی میں منتقل ہوئی ۔ اس وقت موجودہ زند پہلوی ساسانی میں ہے ۔ تفسیر کا زیادہ مفصل حصّہ وندیداد اور یسنا سے متعلق ہے ۔ زردشتیوں کا اعتقاد ہے کہ اوستا اور زند دونوں آسمان سے نازل ہوئی ہیں ۔

پازند

یہ دو لفظوں سے مرکب ہے پا+ زند ۔ پا کلمہ اوستائی پائیتی سے ماخوذ ہے ۔ جس کے معنی خلاف یا صاحب کے ہوتے ہیں ۔ اصطلاحاً اس سے مراد تفسیر زند ہے یعنی زبان پہلوی میں سے ھز وارش کا عنصر خارج کرکے فارسی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ۔ اسی طرح پازند بھی گویا خود ایك زبان بن گئی ہے ۔ خیال ہے کہ دوسری تیسری صدی هجری میں لکھی گئی ہوگی ۔ پازند ایك لحاظ سے پہلوی اور موجودہ فارسی میں ایك واسطه ہے ۔ پازند کو کبھی خط اوستائی میں لکھتے تھے اور کبھی خطِ فارسی میں اس زمانے کا فارسی خط مبھم ہے اور بعض ایسے نامانوس الفاظ استعمال ہوئے ہیں کہ ان کا سمجھنا دشوار ہے اور خط کا پڑھنا اور بھی مشکل ہے ۔ البتہ جو خط اوستائی میں ہے وہ بڑی اہم ہے ۔ اس قسم کی بہت سی کتابیں موجود ہیں لیکن ان میں سے تین کتابیں یادگار ہیں :

دانائی مینوخرد ، ائوگمدئچا ، ایاتکارجا ما سپیك ۔

مینوخرد دینی کتاب ہے اس کا پہلوی متن بھی موجود ہے ۔ اسلئے متن اور تفسیر کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے ۔

پہلوی

پہلوی کو فارسی وسطی یا فارسی میانہ بھی کہتے ہیں ۔ اس میں اور موجودہ فارسی میں کوئی زیادہ فاصلہ نہیں هے ۔ یہ سرزمین پارت کی زبان تھی ۔ یہ پارت وھی مقام ہے جو فارسی باستان میں پرثوَہ (Parthava) تھا ۔ اور هخامنشیوں کے کتبوں میں اسی نام سے مذکور ہے ۔ پرثو سے مراد موجودہ خراسان ہے ۔ پہلوی اقوام پارت کی زبان تھی ۔ اشکانیوں کا خاندان بھی اسی قوم میں سے تھا ۔ اسی لئے پہلوی بھی ان کی سرزمین پرثو سے منسوب ہوئی ۔ پرثو سے پرتو ، پرھو ، پلھو بنا اور بعد میں پہلو ہوگیا ۔ پارتھیوں کے بعد پہلوی اشکانیوں اور ساسانیوں کے دورۂ سلطنت کی رسمی زبان شمار ہوتی رہی ۔ اشکانی پہلوی ، آذربائیجان ، خراسان ، اصفھان ، کردستان ، سواحل غربی بحر خزر اور ارمنستان میں رائج تھی ۔ اور ساسانی پہلوی جنوب و مغرب ایران میں درباری زبان رہی ۔ اس کو فارسی میانہ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ زبان هخامنشیوں کے اختتام اور اسلام کے آغاز کے درمیانی عرصہ کی رائج زبان رہی یعنی ۲۵۰ قبل مسیح سے لیکر ۶۵۱ عیسوی تك یعنی خاندان اشکانیان کے بادشاہ اوّل اشك کے عهد سلطنت سے ساسانیوں کے آخری بادشاہ یزدگرد سوم کے قتل تك اس زمانہ کے بعد بھی تیسری چوتھی صدی هجری تك اس زبان میں کتابیں لکھی گئیں ۔ بارہ تیرہ سو سال کے اس عرصہ میں ہے

شمار تصانیف و تألیفات کے باوجود بہت مختصر سی کتابوں کی تعداد اس زمانے تک پہنچی ہے ۔ فاتح اقوام کے حملوں سے ذخیرہ کتب ضائع اور برباد ہوگیا ۔ پہلوی کتابوں کے ناپید ھو جانے کی وجہ ایك یہ بھی ہوئی کہ خطِ پہلوی کی بجائے خطِ عربی مقبول ہوگیا ۔ اور بتدریج خط پہلوی کا رواج ختم ھوگیا اور لوگ اس کو بھول گئے . چند زرتشتیوں کے سوا کوئی اور شخص اس خط کو نہیں پڑھ سکتا تھا ۔ اس لئے بچی کھچی تحریریں گوشۂ گمنامی میں پڑی رہیں ۔

دورۂ اشکانیان (۲۵۰ ق .م سے ۲۲۴ عیسوی تك) کی زبان پہلوی سے سوائے چند ناموں اور چند مختصر تحریروں کے کچھ باقی نہیں رہا ۔ اکثر وھی تحریریں ہیں جو سنگی کتبوں پر ساسانی پہلوی کے ساتھ ساتھ کندہ ہیں ۔ جو کچھ کتبوں ، سکّوں، مہروں ، نگینوں ، برتنوں اور کتابوں کی صورت میں ہم تك پہنچتا ہے وہ عہد ساسانیاں سے لیکر ھجری سنہ کی ابتدائی صدیوں کے زمانے سے متعلق ہے ۔

اشکانی پہلوی زبان و خط کا قدیمترین نمونہ دو قبالوں کی صورت میں موجود ہے جو اور امان کردستان سے برآمد ہوئے ہیں ۔ ان پر سال ۱۲۰ ق . م درج ہے ۔ مجمل التواریخ کے مؤلف نے لکھا ہے کہ عہد اشکانیاں میں ستر کتابیں موجود تھیں ۔ ان میں سے صرف چار باقی ہیں ۔ کتاب مروك ۔ کتاب سند باد ، کتاب یوسیفاس، کتاب سیماس ۔ ایك اور رسالہ نخل و بزمیں مناظرہ سے متعلق ہے ۔ اور نثر و نظم سے مرکب ہے ۔ ۱۹۴۸ میں شوش سے ایك اور سنگی کتبہ برآمد ہوا ہے جو اردوان پنجم (۲۱۳-۲۲۶ ء) کے عہد سلطنت سے متعلق ھے ۔ یہ تحریر بھی پہلوی اشکانی میں ہے ۔

ساسانی پہلوی کی پس ماندہ دینی کتابوں میں سے تفسیر اوستا ہے ۔ جس کا کافی حصہ ضائع ہوچکا ہے اور جو کچھ باقی ہے وہ تفسیر پہلوی یسنا ، تفسیر پہلوی ویسپرد ،تفسیر پہلوی وندیداد ، تفسیر پہلوی یشتہا کا کچھ حصہ ۔ تفسیر پہلوی پنج نیایش و دو سیروزہ اور خردہ اوستا کی چند عبادات وغیرہ ہیں ۔

تقریباً پانچویں صدی ھجری تك پہلوی کتابیں لکھی جاتی رہی ھیں . عربی خط سے آشنائی کے بعد پہلوی رسائل فارسی میں ترجمہ ہوئے مثلاً ،واتکارزریران ، کارنامۂ اردشیر پاپکان وغیرہ . . بعض کہانیاں جزو شاھنامہ بن گئیں ۔ فخر الدّین گرگانی نےدورۂ اشکانی کی کہانی « ویس و رامین » کو منظوم کیا ۔ ساتویں صدی ھجری میں زرتشت بھرام پژدو نے ارداویرافنامہ کو پہلوی سے شعر فارسی میں ترجمہ کیا ۔

تفسیر کے علاوہ پہلوی کتبے ہیں جو شاھان ساسانی کے زمانے سے یادگار رہ گئے ۔ یہ پتھروں پر کھدے ہوئے کتبے نقش رجب رستم حاجی آباد اور غارشا پور (فارس) اور

طاق بستان و کرمانشاہ کے نزدیک موجود ہیں ۔ان میں سب سے بڑے اور اہم وہ دو کتبے ہیں ۔ جو شا پور (۲۴۱-۲۷۲ء) کے زمانے سے متعلق ہیں جو حاجی آباد اور کعبہ زرتشت میں کندہ ہیں ۔ چار کتبے کرتیر کے ہیں ۔ جو شاپور اور بہرام دوم کے عہد میں موبدان موبد تھا ۔پہلا کتبہ نقش رجب میں ہے ۔ دوسرا کعبۂ زرتشت میں شاپور کے کتبے کے نیچے ۔ تیسرا نقش رستم میں ۔ چوتھا مشہد میں ۔ موخر الذکر مقام پر بہرام دوم (۲۷۵-۲۹۲ ء) کے کتبے بھی موجود ہیں ۔ اکثر یہ کتبے تین خطوں اور تین زبانوں میں کندہ ہیں : یعنی پہلوی ، اشکانی یا پارتی ۔ پہلوی ساسانی یا پارسیك اور یونانی میں۔ ایك بہت بڑا اہم کتبہ عراق میں سلیمانیہ کے جنوب میں پایکولی کے مقام پر ملا ہے ۔ ۱۸۳۶ء میں ایچ . سی . راونسن نے اس کو دیکھا تھا ۔ پھر ۱۹۱۱ء میں ہرتفیلڈ(Hertzfeld) نے تحقیق و تفتیش کرکے اس خط کو پڑھا ۔ کتبوں پر کندہ خط کتابی خط سے مختلف ہے اور اس کا پڑھنا بہت مشکل ہے ۔

ملك الشعرا بہار نے سبك شناسی کی جلد اول میں تمام موجود پہلوی کتابوں کی فہرست تیار کی ہے . ان میں سے اکثر کا موضوع تفسیر اوستا دینی یا اخلاقی ہے اور چند کتابیں ادب و تاریخ اور ساسانی تمدن سے متعلق ہیں۔

چند مشہور کتابوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں :

کارنامۂ اردشیر پاپکان ، یادگار زریران ، خسرو گواتان وریدگی ، درخت آسوریك ، ویچارشن چترنگ (ماتیکانی چترنك) ماتیکان بزاز، واتستان ، فرہنگ اوئیم ، فرہنگ پہلویك ، شہرستانہای ایران ، ارواویرافنامہ ، اندرز آذر باو مہرا سپندان ، اندرز پیشنگان ، اندرزاو شزواناك ، پند نامك زرتشت ، پند نامك وزرگ مہر ، اندرز خسرو گواتان ، چیتك اندرزپوریوتکیشان، خرداد روز خرو رو نیماہ ، وینکر و ماتیکان ، گجستگ ابایش یوشت خریان ، بندھشن ، (دین آگائیہ) نامکیہای منوچہر. واتستان وینیك ، چیتکہای زاوسپرم ، شکند گمانیك ویچار،شایست نشایست ، نیرنگستان ، ہیرپتتان پہلوی روایات ، اودیہای سیستان (شگفتی ھای سیستان) وغیرہ ۔

ہزوارش

پہلوی تحریروں میں خواہ وہ پتھروں پر کندہ ہیں یا اوستا کی تفسیریں ہیں قبل از اسلام لکھی گئی ہیں یا بعد میں ۔ ان میں آرامی زبان کے ہزاروں الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ۔ وہ آرامی زبان میں لکھے گئے ہیں لیکن آرامی تلفظ میں نہیں پڑھے جاتے بلکہ پڑھتے وقت ان کے ہم معنی پہلوی الفاظ بولے جاتے ہیں ۔ ان کو ہزوارش کہتے ہیں ۔

گویا وہ علامات ہیں جن سے مراد خاص معنی لئے جاتے ہیں ۔ مثلاً انگریزی میں e.g. لکھتے ہیں اور اسکو for example پڑھتے ہیں حالانکہ اصل لفظ exampli gratia ہے ۔

اسی طرح آرامی کلمات کے مقابل میں پہلوی کلمات کو پڑھتے ہیں . مثلاً ملکا لکھتے ہیں اور اس کو شاہ پڑھتے ہیں ۔ خود لفظ هزوارش یا زوارش مصدر اوزدار تن سے لیا گیا ہے۔ جس کے معنی بیان کرنا ۔ شرح کرنا یا تفسیر کرنا ہے ۔ تورخان (چینی ترکستان) سے جو پہلوی زبان میں تحریریں برآمد ہوئی ہیں اُن میں هزوارش کا عنصر نہیں ۔ هزوارش یعنی آرامی کلمات کا ماخذ واصل سامی زبانیں مثلاً سریانی ، عربی یا ان سے اوپر بابلی ، آشوری اور اکدی زبانیں ہیں ۔ آرامی کے هم معنی الفاظ عربی میں بھی موجود هیں ۔ آرامی کے یه الفاظ برهان قاطع میں بھی دئیے گئے ہیں ۔

پہلوی میں هزوارش کے دخیل ہونے کی قابل قبول یہی وجه معلوم هوتی ہے که سلاطین کے دفاتر میں لکھنے پڑھنے کا کام آرامی دبیروں کے ہاتھ میں تھا ۔ ایرانی شرکائے کار تھے لیکن اکثریت انہی کی تھی ۔ بادشاہ لڑائیوں میں مصروف رہتے یا شکار کھیلتے اور عیش کی محفلیں آراسته کرتے ۔ اس لئے آرامیوں کو اپنی زبان کے الفاظ داخل کرنے کا موقع ملتا رہا ۔ ایك وجه یه بھی ہے که عوام میں آرامی خط کا رواج بھی تھا ۔ اس لئے خط کے ساتھ زبان کے الفاظ کا دخیل ہو جانا بھی بعید نه تھا ۔ تقریباً ایك هزار یا اس سے زیادہ هزوارش کے الفاظ موجود هونگے جو ادبی اور غیر ادبی تحریروں میں موجود ہیں۔

بخش دوم :

سامانی دور میں فارسی ادب کا جائزہ

ایران میں سامانی دورِ حکومت ۲۶۱-۳۸۹ ھ تک رہا ۔ اس کے حکمرانوں میں نصر بن احمد ، نوح بن منصور اور منصور بن نوح زیادہ اہم اور مربّی علوم و فنون رہے ۔ ان کے وزراء ابو الفضل بلعمی اور ابو علی بلعمی خود بھی صاحبِ علم و فضل اور مروّجِ علوم و فنون تھے سامانی خالص ایرانی نسل تھے اسلئے انہوں نے فارسی زبان اور ایرانی تمدن و معاشرت کے احیاء اور ترویج کیلئے کوشش کی ۔

نثر

اس زمانے میں سلاطین و امرا کی سرپرستی میں مندرجہ ذیل کتابیں نثر میں تألیف ہوئیں :

۱- کتاب عجائب البرّ و البحر یا عجائب البلدان - از ابو المؤید بلخی ۔ یہ کتاب ایران اور بیرون ایران کے شہروں سے متعلق مفید اطلاعات فراہم کرتی ہے ۔

۲- الابنیه عن حقایق الادویه- از ابو منصور موفق هروی.دوا شناسی کے موضوع پر ۔

۳- ترجمه تاریخِ طبری - از ابو علی محمّد بلعمی در سال ۳۵۲ ھ ۔ محمّد بن جریر طبری کی تاریخ الرسل و الملوك کا فارسی ترجمه مع اضافات ۔

۴- ترجمه تفسیر طبری ، محمّد بن جریر طبری کی تفسیر جامع البیان فی تفسیر القرآن کا فارسی ترجمه منصور بن نوح کے حکم سے چند فقها نے مل کر کیا ۔

۵- مقدمۂ شاهنامۂ ابو منصوری از ابو منصور معمّری . یہ ابو منصور محمّد بن عبدالرزاق کے شاهنامه کا دیباچه ہے ۔

۶- شش فصل اور استخراج - مؤلف محمّد بن ایوب حاسب طبری ، اس دور کی فارسی نثر سادہ اور روان ہے ۔ جملے مختصر واضح اور ابہام و تنقید سے پاك ہیں ۔ افعال کی تکرار نہیں ۔ عربی الفاظ و اصطلاحات کم تعداد میں استعمال ہوئیں . اس کو نثر مساوات کہا جا سکتا ہے ۔

۷- شاهنامه ابو المؤید بلخی (قرن چهارم)۔

۸- شاهنامه ابو علی محمّد بن احمد البلخی ۔

۹- شاهنامه ابو منصور محمّد بن عبدالرزاق ۔

۱۰- شاهنامه سے مربوط داستانیں ۔

اخبار رستم منظوم از فردوسی ، اخبار بهمن منظوم از ایرانشاه بن ابی الخیر،

گرشاسپ نامه ، اخبار سام ، اخبار کیقباد ، مقدمۂ شاھنامه ابو منصوری ۔

شاعری

سامانی دور میں شعراء کی بھی بہت قدر و منزلت ہوئی ۔ اس دور کے مندرجه ذیل شعراء کے نام ملتے ہیں ۔ جو یقیناً اپنے زمانے میں نامور اور مقبول ھونگے اور درباروں سے وابسته ھونگے ۔ اور اپنی تصنیفات کی وجه سے مشہور ھونگے ۔ رودکی (م ۳۴۹ ھ) دقیقی، ابو شعیب ھروی ، کسائی مروزی ، ابوالعباس ربنجنی، ابو المؤید بلخی ، ابو شکور بلخی ۔ مسعودی مروزی ، منجیك ترمذی وغیرہ ۔

اس دور کا سب سے بڑا شاعر رودکی ہے ۔ جسے آدم الشعراء کہا جاتا ہے ۔ جو اپنے قصاید قطعات اور مثنوی کلیله و دمنه کی وجه سے معروف ہے ۔ کسائی نے کہا :

رودکی استاد شاعران جهان بود

عنصری نے کہا : غزلهای من رودکی وار نیست

اس کے حکیمانه اقوال میں سے یه شعر مشہور ہے ؛

زمـانه پندی آزاده وار داد مرا زمانه را چونکو بنگری همه پنداست

اس دَور کا دوسرا معروف شاعر دقیقی مقتول ۳۶۸ ھ ہے ۔ اس نے نوح بن منصور کے حکم سے ابو منصوری کے شاھنامه کو منظوم کیا ۔ وہ صرف گشتاسپ اور ظھور زرتشت سے متعلق ایك ھزار شعر کہه سکا ۔ فردوسی نے اپنے شاھنامه میں ان اشعار کو اپنا لیا ۔ دقیقی اپنے قصاید اور قطعات کی وجه سے بھی شہرت رکھتا تھا ۔ ابو اسحاق کسائی مروزی غزنوی دَور تك زندہ رہا ۔ اس نے اشعار میں اپنے مواعظ و نصایح کی وجه سے شہرت حاصل کی ۔

مسعودی مروزی کا منظوم شاھنامه بھی قابلِ قدر تھا لیکن اب ناپید ہے ۔

اس دور کے مثنوی نگاروں میں ابو شکور بلخی کا نام سر فہرست ہے جس کی مثنوی « آفرین نامه » کا تذکرہ ملتا ہے ۔ دوسری مثنوی «کلیله و دمنه» ہے جسے رودکی نے عربی مآخذ سے فارسی مثنوی میں منظوم کیا ۔ اس مثنوی کے چند اشعار فرہنگوں ، تذکروں اور بیان و معانی کی کتابوں میں ملتے ہیں ۔

اس دور کی شاعری میں عیش و نشاط ، ملّی غرور، آزادی افکار اور بزم و رزم کی دلچسپاں عیاں ہیں شاعری ایرانی فکر و روح کی آئینه دار ہے ۔

اس دور میں شاعری کی لغوی خصوصیات یه ہیں :

۱- عربی صرف و نحو اور بلاغت کے قوانین کا اثر کم ہوا۔

۲- عربی الفاظ کا استعمال کم ہوا ۔
۳- اشعار میں پختگی آئی ۔ مضامین میں تنوع پیدا ہوا ۔
۴- قصیدہ کے آغاز میں تشبیب کے طور پر عشقیہ مضامین ، مناظرِ فطرت اور اجتماعی تربیت کے موضوعات داخل ہوئے ۔
۵- ھجو و ھزل کو بھی رواج ہوا ۔
۶- لفظی اعتبار سے قدامت کے آثار موجود ہیں ۔ مثلاً : پہلوی الفاظ ابدء ، ایدون اور ابا کا استعمال ۔ مصرعوں کے اوّل واؤ عطف کا استعمال ۔ اماله و اشباع ۔ عربی جمع کے ساتھ فارسی جمع کی علامت کا اضافه، تخفیف مشدّد اور تشدید تخفیف، کاف تصغیر کا استعمال ۔

علمی فضیلت دکھانے کیلئے شعراء قرآن ، حدیث اور ضرب المثل کی طرف اشارہ کرتے ہیں . صنایع بدایع کا استعمال عام ہوا ۔

رودکی [1]

تذکروں اور تاریخوں میں نام اور کنیت کے اختلاف کے ہوتے ہوئے قریب العصر شہادت کی بنیاد پر رودکی کا پورا نام و کنیت ابو عبداللّٰہ جعفر بن محمّد رودکی صحیح مانا گیا ہے ۔ وہ رودك ، سمرقند کے نواح میں پیدا ہوئے ۔ مختلف قیاسات کی رو سے سال ولادت ۲۶۹ ھ متعین ھو سکا ہے ۔ سال وفات پر تقریباً اتفاق ہے یعنی ۳۲۹ ھ ، تخلص بھی مقام ولادت کی وجہ سے رکھا گیا ۔

رودکی شاهان سامانی میں سے امیر اسمعیل (۲۷۹-۲۹۵ھ) احمد بن اسمعیل (۲۹۵-۳۰۱ھ) اور نصر بن احمد (۳۰۱-۳۲۹) کے درباروں سے وابستہ رہا ، زیادہ عرصہ نصر بن احمد مربّی علم و فن کی خدمت میں گزرا اور اسکے انعام و اکرام سے مالا مال رہا. دولتمندی اور خوشحالی کی زندگی بسر کی ۔ رودکی کے متفرق اشعار جو دستیاب ہوئے ہیں ان کی رو سے ان کے ممدوحین کے نام حسب ذیل ہیں :

نصر بن احمد ، امیر ابو جعفر ، ابو طیب مصعبی، ابو الفضل محمّد بلعمی، عدنانی ، امیر علی محمّد بن محمد بن عبید اللّٰہ بلعمی ۔

۱- تفصیل کے لئے دیکھئے : محیط زندگی و احوال و اشعار رودکی ، سعید نفیسی ، تهران .

رودکی کے بعض معاصر شعراء مندرجہ ذیل تھے :

فرالاوی ، ابوالعباس ربنجنی ، ابوالمثل بخارائی ، ابو اسحق جویباری ، ابو الحسن اعمی ،طخاری، خبازی نیشاپوری ، ابوالحسن کسائی ، دقیقی ، ابو زرعہ گرگانی ، استغنایی نیشاپوری ، ابو عبداللّٰہ جنیدی ، عمارہ مروزی ، رابعہ دختر کعب ، ماکان کاکی .

رودکی سمرقند سے بخارا گیا اور ہر بادشاہ کے ہمراہ خراسان میں اس کے سفروں میں ہمراہ جاتا رہا ہوگا ۔ ایك سال ہری میں قیام تھا اور بادشاہ وہاں کی بہاروں اور پھلوں سے اس قدر متأثر ہوا کہ واپس جانے کا نام نہیں لیتا تھا ۔ بقول مصنف چھار مقالہ امراء کی فرمائش پر رودکی نے مشہور قصیدہ :

بوی جوی مولیان آید همی   یاد یار مهربان آید همی

لکھا اور گا کر سنایا تو بادشاہ اتنا متأثر ہوا کہ اسی وقت بخارا روانہ ہوگیا .

خدا نے رودکی کو خوش لحن عطا کیا تھا . اس نے ابو العبیك بختیار سے بربط بجانا سیکھا اور اس طرح موسیقی میں بھی مہارت حاصل کی ۔

رودکی تاریخ قدیم ایران ، تاریخ اسلام اور جغرافیاے عالم سے آگاہ تھے ۔ وہ مذاہب اور امثل و حکم سے آشنا تھے ۔ ان کے کلام میں پند و نصایح اور حکیمانہ نکات موجود ہیں جن سے زندگی پر ان کی گھری نظر کے نشانات ملتے ہیں .

انہیں علم عروض پر کافی دسترس حاصل تھی اور مثنویوں میں مختلف بحور استعمال کی ہیں .

رودکی اپنے حکیمانہ افکار کی وجہ سے فارسی شعراء میں ممتاز ہے . ناصر خسرو نے مندرجہ ذیل شعر میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے :

اشعار زهد و پند بسی گفتست   آن تیره چشم شاعر روشن بین

رودکی نے زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق گفتگو کی ہے . دنیا کی ناپائیداری، زمانے کی ناسازگاری اور فرد و معاشرے کی اصلاح کیلئے اچھی اور کام آنے والی نصیحتیں کی ہیں . اس نے خود کہا ھے :

زمـــانه پندی آزاده وار داد مرا   زمانه را چونکو بنگری همه پند است

اس کے حکیمانہ نکات کی چند مثالیں یہ ہیں :

چهار چیز مر آزاده را ز غم بخرد   تنِ درست ، خوی نیك و نام نیك و خرد

این جهان پاك خواب کردار است   آن شناسد که دلش بیدار است

محمّد عوفی نے لباب الالباب میں لکھا ہے کہ رودکی مادرزاد نابینا تھا لیکن اس قدر ذہین تھا کہ آٹھ سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا اور قرأت بھی سیکھی ۔ بعد میں لباب کی پیروی میں بھارستان ، ھفت اقلیم اور مجمع الفصحاء میں بھی انھیں مادرزاد نابینا قرار دیا گیا ۔ لیکن اس کے اشعار میں ایسی تشابیه موجود ہیں جو آنکھیں رکھنے والا مشاہدہ کرکے ہی لکھ سکتا ہے ۔ مثلاً :

لاله میان کشت بخندد همی ز دور   چون پنجهٔ عروس به حنا شده خضیب

چونکہ متأخر شعراء نے بھی اسے تیرہ چشم لکھا ہے ، خیال ہے کہ عمر کے آخری حصّے میں وہ بینائی سے محروم ھوگیا ہو ۔ ایک قیاس یہ ہے کہ نصر بن احمد کے وزیر ابو الفضل بلعمی سے خفا ہو کر اسے وزارت سے ہٹا دیا تھا اور اس کے قریبی متعلقین کو بھی سزایں دی تھیں ۔ ممکن ہے رودکی کو بھی نابینا کر دیا گیا ھو ۔ رودکی کے اشعار سے معلوم ھوتا ہے کہ عمر کے آخری تین سال نامرادی و اندو ھناکی میں گزرے ۔

بسا که هست درین خانه بودم و شادان   چنانکه جاه من افزون بود از امیر و ملوك
کنون همانم و خانه همان و شهر همان   مرا نگویی کز چه شده است شادیی سوك

تذکرہ نگاروں اور متأخر شعراء نے رودکی کی دولتمندی کا ذکر کیا ہے ۔ رودکی نے خود بھی لکھا ہے کہ اس کے پاس بے شمار درم تھے ۔ وہ خوبصورت غلام خرید سکتا تھا ۔ ہر قسم کے مال و اسباب میسر تھے ۔ ایک جگہ کہا ھے :

امروز به اقبال تو ای میر خراسان   هم نعمت و هم روی نکو و سیار

تصانیف :

۱- **دیوان اشعار** – رشیدی سمرقندی نے لکھا ہے :

شعر او را بر شمردم سیزده ره صد هزار   هم فزون آید اگر چونانکه باید بشمری

سیزده ره صد هزار یعنی ایک ملیون سیصد هزار یعنی ھمارے محاورے میں تیرہ لاکھ یہ سراسر مبالغہ ہے ۔ اگرچہ بہت سے دانشوروں نے لکھا ہے کہ اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے ۔ لیکن اب اس کا کوئی مجموعۂ کلام میسر نہیں ۔ سعید نفیسی نے مختلف ذرایع سے جو کلام جمع کیا ، اس کے اشعار کی تعداد ۹۶۰ ہے ۔

۲- **مثنوی کلیله و دمنه** – یہ کتاب اصل میں سنسکرت میں تھی ۔ ابن المقفع نے عربی میں اس کا ترجمہ کیا ۔ ابو الفضل محمّد بلعمی وزیر نصر بن احمد سامانی نے اس کو فارسی نثر میں لکھا ۔ پھر بادشاہ کے حکم سے رودکی نے اسے منظوم کیا ۔ یہ مثنوی بحر رمل مسدس مقصور میں ہے ۔ کتاب مفقود ہے ۔ سعید نفیسی نے اس کے ۱۱۵ ابیات کا سراغ لگایا ہے ۔

۳- **سند باد نامه** - نوح بن منصور سامانی کے حکم سے خواجہ عمید ابو الفوارس نے پہلوی سے فارسی میں ترجمہ کیا ۔ کلیلہ و دمنہ کی طرح یہ بھی بحر رمل میں ہے ۔ اس کتاب کے بعض مضامین رودکی کے متفرق دستیاب اشعار میں ملتے ہیں ۔ اس لئے گمان ہے کہ رودکی نے سندبادنامہ بھی منظوم کیا ہو ۔

۴- **چھ مثنویاں** - کلیلہ و دمنہ اور سندباد نامہ کے علاوہ مختلف اشعار کے تجزیے سے معلوم ہوا ہے کہ رودکی نے چھ اور مثنویاں لکھی تھیں ۔ جن میں سے «دوران آفتاب» کا نام کتابوں میں مذکور ملتا ہے ۔

قصیدہ سرائی :

بڑے بڑے استاد قصیدہ گو شعراء مثلاً عنصری ، منوچھری ، ناصر خسرو ، خاقانی وغیرہ نے رودکی کو استاد مانا ہے ۔ اور اس کی تعریف کی ہے ۔ دقیقی نے کہا ہے :

کرا رودکی گفته باشد مدیح امام فنون و سخنور بود
دقیقی مدیح آورد سوی او چو خرما بود برده سوی هجیر

رودکی کے مدحیہ قصیاید عصری زبان کے اعتبار سے فصیح ہیں اور معانی کے لحاظ سے بھی دل انگیز ہیں اور ان کا اسلوب خوب و دلپسند ہے ۔ مثلاً ذیل کے اشعار :

دیر زیاد آن بزرگوار خداوند جان گرامی بجانش اندر پیوند

ای جان خداوندان بر جان تو پیوند مکروه تو ما را ننمایاد خداوند

گه کس بودی کـه زی تو ام بفگندی خویشتن انـدر نهادی بفلاخن

قصیدہ گو شعراء عموماً مدحیہ قصیدہ کی ابتدا میں عشقیہ ، خمریہ ، مضامین لاتے ہیں ۔ یا مناظر فطرت کا نقشہ کھینچتے ہیں ۔ اس تمہیدی حصے کو اصطلاح میں تشبیب یا نسب کہتے ہیں ۔ اس کے بعد شاعر گریز کرکے ممدوح کی تعریف کرتا ہے ۔ اس ابتدائیہ کو منزل بھی کہا جاتا تھا ۔ سامانیوں اور غزنویوں کے زمانے میں غزل صنف سخن کی حیثیت سے الگ نہیں لکھی جاتی تھی ، رودکی نے زبان و بیان اور لطف معانی میں مہارت کی بنا پر نہایت عمدہ غزلیں لکھی ہیں ۔ عنصری جیسا ملک الشعراء اس باب کا اعتراف کرتا ہے ۔

غزل رودکی وار نیکو بود غزلهای من رودکی وار نیست
اگرچه بکوشم به باریك وهم بدین پرده اندر مرا بار نیست

خمریات

تشبیب کا پہلا مرغوب موضوع شراب ، محفل نشاط ، راگ رنگ ، نشأ و مستی ہے ۔ اس میں رودکی نے کمال سخن دکھایا ہے ۔ شراب کی تعریف میں جن تشبیہات کو استعمال کیا ہے۔ وہ نادر و غریب ہیں ۔ ایك قصیدے میں انگور کے پکنے ، مٹکوں میں بند رکھنے اور شراب بننے کے تمام ادوار کو بیان کیا ہے ۔ وہ قصیدہ اپنے مبتکر تخیل اور بیان کی وجہ سے متأخر شعراء کیلئے نمونہ ثابت ہوا . قصیدہ یہ ہے :

مادر می را بکرد باید قربان بچۂ او را گرفت و کرد به زندان

شراب کی تعریف میں اس کے مندرجہ ذیل اشعار قابل ملاحظہ ہیں :

رودکی چنگ بر گرفت و نواخت باده انداز کو سرود انداخت
هر دو یك گوهرند لیك بطبع این بیفسرد و آن دگر بگداخت
نا بسوده دو دست رنگین کرد نا چشیده بتارك اندر تاخت

مناظر فطرت

تشبیب کا دوسرا عمومی موضوع مناظر فطرت کا بیان ہے . خصوصاً اس کو بہاریہ تشبیب کہا جاتا ہے ۔ رودکی نے اس کے بیان میں بھی استادانہ مہارت کا ثبوت دیا ہے ۔ شاعر باغ و بہار کی رعنائیوں میں ڈوب کر اپنے مشاہدات بیان کرتا ہے ۔ قاری اس کو پڑھ کر لطف اندوز ہوتا ہے ۔ نمونے کے دو شعر یہ ہیں :

آمد بهار خرم با رنگ و بوی طیب با صد هزار نزهت و آرایش عجیب
باران مشکبوی ببارید نو به نو و ز برف بر کشید یکی حلۂ قصیب

تغزلات

تشبیب کا تیسرا موضوع غزل ہے جسے رودکی نے نہایت سلیقے سے استعمال کیا ہے ۔ وصف محبوب ، اس سے گلہ و شکوہ اور ہجر و فراق میں غم و اندوہ کو بیان کیا ہے ۔ اس کے کرشمہ و نیاز اور البیلے پن کا تذکرہ کیا ہے ۔ تشبیب میں غزل کی تمام خوبیاں موجود ہیں ۔ اگرچہ کہیں کہیں متروك الفاظ اور نامانوس قوافی نظر آتے ہیں ۔ چند مثالیں یہ ہیں :

عشق را گر پیمبری لیکن حسن را آفریدگار توئی

پیشم آمد بامدادان آن نگارین از کدوخ در رخ از باده لعل و با دو چشم از سحر شوخ

ع – به تو باز گردد غم عاشقی نگارا

ای مایۂ خوبی و نیك نامی روزم ندهد بی تو روشنایی

فلسفۂ عیش و نشاط

یہ قدرتی جذبہ بھی ہو سکتا ہے ۔ کہ آدمی کو مال و دولت اور خوشحالی نصیب ھو تو وہ چاہتا ہے کہ غم و عنا کو دور کرے ۔ غم دوش اور فکر فردا کو فراموش کرکے حال سے فائدہ اٹھائے اور مزے کی زندگی گزارے ۔ لیکن زندگی کا ایك نظریہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایك شخص زندگی کو اسی رنگ سے دیکھے ۔ یونانی فلسفی اپیکور کا بھی یہی نظریہ تھا ۔ رودکی کے بعض اشعار سے بھی اسی نظریے کی بو آتی ہے ۔ مثلاً :

شادزی با سیہ چشمان شاد   کہ جہان نیست جز فسانہ و باد
ز آمدہ تنگدل نباید بود   و ز گذشتہ نکرد باید یاد
دایر است این جہان افسوس   بادہ پیش آر ھر چہ بادا باد

مرثیہ

مرثیہ کے ضمن میں جو اشعار ملتے ہیں ، ان میں جذبات کا خلوص و سوز موجود ہے ۔ اور بیان بھی توانا ہے ۔ شہید اور مرادی سے متعلق اسکے مندرجہ ذیل اشعار سے مرثیہ کی سوزناکی ظاہر ہے :

کاردان شہید رفت از پیش   و آن ما رفتہ گیر و می اندیش
از شمار دو چشم یك تن کم   در شمار خرد ہزاران بیش

مرد مرادی نہ همانا کہ مرد   مرگِ چنان خواجہ نہ کاریست خرد
جان گرامی بہ پدر باز داد   کالبد تیرہ بہ مادر سپرد

***

بخش سوم :

غزنوی دور میں فارسی ادب کا جائزہ

ایران میں غزنوی دورِ حکومت ۳۵۱سے ۴۲۹ ھ.ق تک رہا ۔ اس کے بعد غزنوی حکومت کا سلسلہ لاھور ہی منتقل ھوگیا ۔ اور غزنوی سلاطین کی حکومت ۵۸۴ ھ.ق تک قائم رہی ۔ غزنوی سلطنت کے نامور بادشاھوں میں سے سبکتگین، محمود ، مسعود ، ابراھیم ، بهرام شاہ اور خسرو ملك ہیں ۔ سلطان محمود نه صرف خود عالم تھا بلکه علوم و فنون کا مربّی تھا ۔ اس نے مفتوحه علاقوں سے علماء و فضلاء و شعراء کو اپنے دربار میں جمع کیا . اور انعام و اکرام سے نوازا . اسے اغواء کننده علماء بھی کہا جاتا ہے ۔ اس کے دربار میں شعراء کا اجتماع تھا ۔ جن میں سے عنصری ملك الشعراء تھا ۔ دوسرے شعراء میں سے فردوسی ، فرخی ، منوچهری ، عسجدی، غضائری اور رشیدی معروف ہیں ۔ لاھور پایتخت سے وابسته شعراء میں سے مسعود سعد سلمان اور ابو الفرج رونی جلیل القدر شمار ہوتے ہیں ۔

شاعری

اس دور میں قصیده سرائی کو زیاده عروج هوا اور نامور قصیده گو منظر عام پر آئے . ابو القاسم حسن عنصری (۴- ۴۳۱) محمود ، محمّد اور مسعود کا درباری شاعر تھا . وہ لفظوں کے در و بست ، مضمون آفرینی ، پرواز تخیّل اور علمی فضیلت کی وجه سے سرآمد روزگار تھا ۔ اس کے اشعار کا نمونه حسب ذیل ہے :

جهد کن تا چون سخن گردی نوی باشد سخن　　رنج بر تا چون سحر گردی نکو باشد سحر
زود خفتن و از دیر خاستن هرگز　　نه ملك یابد مرد و نه بر ملوك ظفر

علی بن جولوغ فرخی (۱-۴۲۹ ھ.ق)اپنے زمانے میں قصیده گو شعراء کی صفِ اوّل میں شمار هوتا ہے . بیان کی سادگی ، خلوص اور بحور میں نغمگی کی وجه سے مقبول تھا . مندرجه ذیل اشعار میں شاعری کے متعلق اپنا نقطه نظر پیش کیا ہے :

با کاروانِ حُلّه برفتم ز سیستان　　با حلّه ای تنیده ز دل بافته ز جان
هر تارِ او برنج بر آورده از ضمیر　　هر پود او به جهد جدا کرده از روان

ابو النجم احمد منوچهری (۴- ۴۳۲ ھ.ق) ابتدا میں عرب شعراء کے زیر اثر عربوں کی تلمیحات و اصطلاحات استعمال کرتے تھے ۔ بعد میں سادگی اور سنجیدگی کی طرف لوٹ آئے . دونوں روشوں میں مہارت کا ثبوت دیا ہے ۔ قبل الذکر رویے میں عربی کے ثقیل الفاظ بھی حسن کارانه طریق سے استعمال کئے ہیں ۔ اور مؤخر الذکر میں اپنے علم

و فضل و دانش کو پوری موسیقیت کے ساتھ بیان کیا ہے اور مسمط کی اختراع کی وجہ سے نام پیدا کیا ۔ ان کے دو شعر درج ہیں :

غرابا مزن بیشتر زین نعیقا که مهجور کردی مرا از عشیقا

پیش از آن گیتی ما را بزند یا بخورد ما ملك وار مراو را بزنیم و بخوریم

رزمیہ مثنوی سرائی

ابو القاسم فردوسی (۴- ۴۱۱ ھ) اس دور کا بلند پایہ شاعر ہے جس نے اپنی تیس سالہ زندگی کا سرمایہ شاھنامہ کی صورت میں یادگار چھوڑا ہے ۔ فارسی رزمیہ شاعری کا عظیم ترین اور سب سے جامع اور حسین نمونہ ہے ۔ یہ ایران کی منظوم تاریخ ہے ۔ اس میں ایرانی تہذیب و تمدن کی روایات ، مذہبی و ملی رسوم ، پند و حکمت کے جواہر موجود ہیں ۔

یہ طویل ترین مثنوی اپنے خالق کی قدرتِ زبان، کردار شناسی ، دیانتِ فکر پر شاہد ہے اس کا قول ہے ۔

بسی رنج بردم درین سال سی عجم زنده کردم بدین پارسی

ابو المجدود حسن سنائی غزنہ میں پیدا ہوئے ۔ اور یہیں ۵۳۰ ھ میں فوت ہوئے ۔ اس لئے بہتر ہے کہ اسے بھی غزنوی دور کا شاعر شمار کیا جائے ۔ ان کی زندگی کا پہلا دور قصیدہ سرائی کا تھا ۔ بعد میں زندگی میں انقلاب آیا تو تصوّف و عرفان کی طرف مائل ہوئے ۔ اور سات عرفانی اور اخلاقی مثنویاں لکھی ہیں ۔ حدیقة الحقیقة ، طریق التحقیق ، سیر العباد الی المعـــاد ،عقل نامہ ، غریب نامہ ، عشق نامہ ، کارنامہ. مسعود سعد سلمان کا مستزاد شہر آشوب اور دردِ اخلاص سے بھری ہوئی حبسیہ نظمیں فارسی ادب میں اوّلیت کا درجہ رکھتی ہیں ۔

مجموعی طور پر اس دور کی شاعری کی نمایاں خصوصیات یہ ہو سکتی ہیں ۔ شاعری میں تنوّع اور تازگی آئی ہے ۔ بحور بھی نرم و ملائم استعمال ہوئی ہیں ۔ الفاظ و تراکیب کے انتخاب میں تناسب معنی کا خیال رکھا گیا ہے ۔ موضوعات بھی نئے داخل ہوئے ہیں ۔ مثلاً عشق اور اس کے لوازم مناظرِ قدرت اور اس کی رنگارنگی ۔

اس دورمیں فصاحتِ الفاظ ، وزن سے خارج مصرع اور دوسرے عیوب کم ہوئے ۔ سبکِ خراسانی کی خصوصیات میں سے وہی چیزیں پائی جاتی ہیں جو سامانی دور میں تھیں ۔ لفظی صنایع کے استعمال میں اضافہ ہوا ۔

قصیدے کی تشبیب میں مناظرِ فطرت کے علاوہ محبوب کے چہرے ، گیسو اور

رخسار کی تعریف ، ہجر کا شکوہ ، وصال کا سرور، چراگاہوں ، کھنڈروں کا بیان ، کبھی کبھی زہد و تقوی اور ترک دنیا کا سبق ممدوحین کی بزمِ نشاط ، شکار ، میدان جنگ اور دور دراز منازل سفر کا حال بیان ہوا ہے ۔

نثر

اس دور کی مشہور تألیفات حسب ذیل ہیں :

۱- **التفهیم لاوائل صناعة التنجیم** : از ابوریحان البیرونی (۴-۴۲۰ ھ) علمِ ہندسہ ، ریاضی ، نجوم اور ہیئات کے موضوع پر کتاب سادہ اور دلکش عبارت میں لکھی گئی ہے ۔

۲- **دانشنامۂ علائی** : فلسفہ و منطق کے موضوع پر ابو علی سینا کی تألیف ہے اس میں فلسفہ کی عربی اصطلاحات کو فارسی قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے ابن سینا کے رسائل معراجیہ ، نفسیہ بھی فارسی میں ہیں ۔

۳- **تاریخِ بیہقی** : از ابوالفضل بیہقی (۴-۴۷۰ ھ) اس کا صرف ایک حصہ مسعود کے زمانۂ حکومت کے واقعات پر منحصر ہے ۔ زبان کی سادگی اور فصاحت قابل توجہ ہے ۔

۴- **زین الاخبار** : از ابو سعید عبدالحی گردیزی ۔ آفرینش عالم سے لے کر سلطان مودود بن مسعود تك کے حالات پر مشتمل ہے ۔ اس دَور کے اسلوبِ نثر میں آیاتِ قرآنی اور امثال کا ذکر شروع ہوگیا ہے ۔ عربی الفاظ کی کثرت ہے ۔ تألیفات ابن سینا اور بیرونی میں سبكِ علمی وجود میں آیا ۔

شعراء

فرخی سیستانی (۱)

ابو الحسن علی بن جولوغ فرخی سیستان کا رہنے والا تھا۔ سالِ ولادت معلوم نہیں ۔ سالِ وفات ۴۲۹ ھ.ق ہے فرخی کے والد امیر خلف بانو کے غلام تھے ، فرخی ایك دھقان کا

۱- تفصیل کے لئے دیکھئے : چھار مقاله ، عروضی سمرقندی ، مقالۂ شاعری ۔

ملازم تھا ۔ سالانہ چند من غلہ اور سو درم نقد ملتے تھے ۔ فرخی نے شادی کی تو خرچ بڑھا۔ امیر ابو المظفر چغانی کے لطف و کرم کا چرچا سنا تو قصیدہ لکھ کر چغانیان گیا ، امیر کے کدخدا عمید اسعد نے ایك دیہاتی کی زبانی ایسا عمدہ قصیدہ سن کر یقین نہ کیا اور کہا امیر داغگاہ میں ہے ۔ اس موضوع پر قصیدہ لکھ کر لاؤ . تا کہ وہاں اس کے سامنے پیش کیا جا سکے . چنانچہ فرخی نیا قصیدہ لکھ کر لایا جو پسند کیا گیا ۔ داغگاہ پہنچ کر فرخی نے دونوں قصیدے سنائے اور انعام پایا ۔ گھوڑوں کے علاوہ دو خیمے ، تین خچر ، پانچ غلام اور پہننے کیلئے کپڑے عنایت ہوئے اور فرخی کے امیرانہ ٹھاٹھ ہوگئے ۔ ۳۱۱ ھ.ق کے لگ بھگ فرخی سلطان محمود غزنوی کے دربار سے وابستہ ہوا . فرخی ابھی جوانی کے عالم میں تھا ۔ سلطان محمود کے پاس اس کی بہت قدر و منزلت ہوئی . سفر و حضر میں بادشاہ کے ساتھ رہتا ۔ وہ محمّد بن سلطان محمود اور امیر یوسف بن ناصر الدّین کا بھی مرغوب خاطر تھا ۔ فرخی سلطان مسعود بن محمود کے دربار سے بھی وابستہ رہا۔

فرخی تین بار دریائی سفر میں سلطان محمود کے ساتھ رہا ۔ سومنات اور قنوج کی فتوحات میں شریك تھا ۔

دولتشاہ نے لکھا ہے کہ فرخی «ترجمان البلاغت» کا مصنف تھا ۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے ترجمان البلاغت کا اصل مصنف محمّد بن عمر الرادویانی ہے ۔ یہ کتاب شائع بھی ہو چکی ہے .

فرخی نے تقریباً ۲۵ اشخاص کی تعریف میں قصاید لکھے ہیں ۔

دیوان فرخی زیادہ تر قصاید پر مشتمل ہے . صرف ۴۵ رباعیاں ہیں اور اتنی تعداد میں قطعات یا قصاید کے اجزاء ہیں اور کچھ پراگندہ اشعار ہیں . فرخی کی درباری عمر قصیدہ سرائی میں گزر گئی ۔ مندرجہ بالا تفصیل سے ظاہر ہے کہ اس کے قصاید کے بیشتر مخاطب سلطان محمود ، سلطان محمّد ، امیر یوسف بن ناصر الدّین،سلطان مسعود بن محمود اور کچھ وزراء ہیں ۔ مدحیہ قصاید کے علاوہ ایسے بھی قصاید ہیں جن میں دوسرے موضوعات کا بھی ذکر ہے ۔ مثلاً :

وصف باغ ، کاخ و مجلس و دریاچۂ کاخ ، ذکر سفر سومنات و فتح و شکستن سومنات. فتح هزار اسپ، شکار جرگه ، جشن مهرگان ، جشن سده ، تهنیت بر عید و بهبود یافتن از مرض و ولادت پسر اور جوانی و عیش مدحیہ قصاید کا نمونہ وہی ہے جو قصیدہ کی ہیأت کیلئے مقرر ہے یعنی تشبیب ، گریز ، مدح ، مدعا اور دعا ۔ فرخی نے بعض قصاید میں تشبیب لانے کا اہتمام نہیں کیا ۔ براہ راست مدح شروع کر دی ہے . فرخی

کی اکثر تشابیب بہاریہ ، عشقیہ اور خمریہ ہیں ۔ بہاریہ میں گل و باغ ، سبزہ و باران ، آفتاب و آسمان ، دامن کوہ اور سبزہ زاروں کا ذکر کرتا ہے.عشقیہ میں سراپائے محبوب بیان کرتا ہے اور اس سے گلہ و شکوہ ، خمریہ میں محفل عیش و نشاط سجاتا ہے ۔اور کیف و مستی کی آرزو کرتا ہے ۔ ان تشابیب کے چند واضح نمونے ملاحظہ کیجئیے :

بہاریہ

برآمد نیلگون ابری ز روی نیلگون دریا چورای عاشقان گردان چو طبع بیدلان شیدا

عشقیه

دوست دارم کودك سیمین بر بیجاده لب هر کجا زیشان یکی بینی مرا آنجا طلب
خاصه با روی سپید و پاك چون تابنده روز خاصه با موی سیاه و تیره چون تاریك شب

خمریہ

روزه از خیمۂ ما دوش همی شد بشتاب عید فرخنده فراز آمد با جام شراب

قصیدہ گو عموماً بدنام ہے کہ اسے اپنی معیشت کی خاطر ظالم و سفاك ، بخیل و بزدل کی تعریف و توصیف کرنی پڑتی ہے۔ اور مبالغہ سے کام لے کر ممدوح کی انا کی تسکین کا سامان فراہم کرنا پڑتا ہے ۔جس دربار میں بہت سے قصیدہ سرا شعراء موجود ہوں وہاں مدحیہ مواد فراہم کرنے کیلئے نئے سے نیا انداز پیدا کرنا پڑتا ہے ۔ فرخی خود کہتا ہے :

فسانه گشت و کهن شد حدیث اسکندر سخن نو آر که نو را حلاوتیست دگر

فرخی کے اکثر ممدوحین وہ ہیں جو واقعی سپہ سالار، جری ، فاتح ، غازی ، فیاض و مربی تھے ۔ اسلئے ان کی تعریف میں شاعر کا اخلاص شامل ہے ۔ فرخی کے قصاید میں شاعرانہ مبالغہ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے ۔ کہ اس نے جھوٹ اور مبالغہ و اغراق سے کم کام لیا ہے ۔ مثلاً جب وہ سلطان محمود کی تعریف کرتا ہے تو قصیدہ کی اٹھان سے ہی جوش و ولولہ معلوم ہوتا ہے مثلاً :

هر سپاهی را که چو محمود باشد شهریار یُمن باشد بریمین و یُسر باشد بر یسار
بدین خرمی جهان ، بدین تازگی بهار بدین روشنی شراب ، بدین نیکویی نگار

سلطان محمود کی وفات پر جو اس نے مرثیہ لکھا ہے ۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی ایك نایاب چیز کھو گئی ہے اور اس کے بغیر دنیا تاریك و بے رونق نظر آتی ہے ۔

شهر غزنین نه همانست که من دیدم پار چه افتاد است که امسال دگرگون شده کار

فرخی نے لشکر شاہی کے ساتھ تین مرتبہ ہندوستان کا سفر کیا ۔ سفر کی صعوبتوں ، جنگوں اور فتوحات کا حال خود مشاہدہ کیا ۔اس نے اپنے بعض قصاید میں ان احوال و کوائف کو بیان کیا ۔ جن سے اس زمانے کی تاریخ کے بعض گوشوں کی تحقیق پر روشنی

پڑتی ہے . اسی طرح بعض دوسرے قصاید سے شاہی محلات ، باغات ، مجالس نشاط ، روایتی جشن اور روش شکار کے متعلق حاصل ہوتی ہیں ۔ تاریخ کا طالب علم اس زمانے کی معاشرتی و ثقافتی زندگی کے مطالعه و جائزه میں ان قصاید سے مدد لے سکتا ہے ۔

فرخی سبك خراسانی کا نمایندہ شاعر ہے ۔ غزنوی دور میں سامانی دور کے شعراء کی فنی خصوصیات میں کچھ تبدیلیاں آگئی تھیں ۔ شاعری میں تنوع اور تازگی آئی ہے ۔ بحور بھی نرم و ملائم استعمال ہوئی ہیں ۔ الفاظ و تراکیب کے انتخاب میں تناسب معنی کا خیال رکھا گیا ۔ موضوعات بھی نئے داخل ہوئے ۔ عشق اور اس کے لوازم ، مناظر قدرت اور اسکی رنگارنگی ، شراب و بوس کنار کا اعلان تشابیب میں نمایاں ہے ۔ صنایع لفظی و معنوی کا اضافه ہوا ۔ تشابیه حسی کے بجائے عقلی بھی آنے لگیں ۔

کلام فرخی بظاہر سہل و ساده و رواں اور اسکی بحور موسیقی سے ہم آہنگ نظر آتی ہیں ۔ اس کی ایك وجه تو یه ہے که شاعر کی طبیعت فطرتاً اتنی موزوں ہے که نئے بنائے ڈھلے ڈھلائے مصرعے نکلے چلے آتے ہیں۔ اس کے باوجود قافیه ردیف کی قید اور وزن کی پابندی اور مناسب الفاظ کا انتخاب اور صنایع لفظی کا خیال شاعر کو محنت پر مجبور کرتا ہے .وہ زبان و محاورے کی درستی کا خیال رکھتا ہے ۔ مخاطب و قاری تك ابلاغ کی سہولت پر بھی توجه دتیا ہے ۔ سب سے زیادہ اپنے کلام میں سوز و اخلاص کو بھی داخل کرتا ہے تا که دوسروں کے اذھان و قلوب متأثر ہوں ۔ ناقدین نے کلام فرخی کو سہل ممتنع کہا ہے ۔ لیکن وہ خود شعر کی تخلیقی کاوش سے آگاہ تھا جیسا که مندرجه ذیل اشعار میں اس نے نظریه شعر کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے :

با کاروان حله برفتم ز سیستان   با حلّه ای تنیده ز دل بافته ز جان
هر تار او برنج برآورده از ضمیر   هر پود او به جهد جدا کرده از روان

فرخی خود رود بجانا جانتا تھا اور خوش لحنی سے شعر بھی پڑھتاھوگا . اس استعداد کی بنا پر اس کے اشعار موسیقیت سے ہم آہنگ ہیں اور پڑھنے میں بھی لطف و لذت پیدا کرتے ہیں ۔

فردوسی

ابو القاسم منصور بن حسن متخلص به فردوسی طابران طوس کی ایك بستی «پاژ» میں پیدا ہوئے . سال ولادت قیاساً ۳۲۹/ ۳۳۰ ھ نکلتا ہے ۔ فردوسی نے ختم شاھنامه کے متعلق لکھا :

ز هجرت شده پنج هشتاد بار   که گفتم من این نامۂ شاهوار

اور اپنی عمر کے متعلق کہا ہے :

چو سال اندرآمد به هفتاد و یك   همی زیر شعر اندر آمد فلك

۴۰۰ سے ۳۷۱ منہا کرنے سے ۳۲۹ سال حاصل ہوتا ہے ۔ فردوسی نے انہی ابیات میں قحط سالی کا ذکر کیا ہے۔ جو ۴۰۲/۴۰۱ میں واقع ہوا ۔ اسلئے سال ولادت ۳۳۱ کے آس پاس بھی ہوسکتا ہے ۔

فردوسی طوس کا دہقان یعنی اچھا خاصا زمیندار مالك جائداد غیر منقولہ تھا اور جوانی میں خوشحال زندگی بسر کرتا تھا ۔ اس کے اپنے قول کے مطابق بڑھاپے میں وہ پراگندہ حال ہوگیا ۔

فردوسی کو تاریخ ایران سے گہرا شغف تھا ۔ وہ شعر کہنے کی بھی عمدہ صلاحیت رکھتا تھا ۔ اس نے بیژن و گرازان کی داستان منظوم کی ۔ جو قابل تحسین و آفرین قرار دی گئی . کسی مہربان دوست نے ایران کی پوری تاریخ منظوم کرنے کا مشورہ دیا اور فردوسی عزم لے کر اس کیلئے معلومات فراہم کرنے کیلئے بلخ ، مرو ، نیشاپور ، ہرات وغیرہ شہروں میں گیا اور معلومات جمع کیں . بعد میں ایك منثور نامۂ خسروان : دفتر پہلوی میسر آگیا جسے اساس بنا کر اس نے نظم کرنا شروع کیا فردوسی نے غزنین میں ٹھہر کر ۴۰۰ ھ تك شاھنامہ مکمل کیا ۔ بعد میں بھی اضافے کیے اس محنت و کوشش میں وہ بوڑھا ہوگیا . اس کے دوستوں نے مشورہ دیا کہ اسے بڑے بادشاہ کے نام منسوب کرو. فردوسی کی بھی خواہش تھی کہ اسے عمر بھر کی محنت کا معقول صلہ ملے ۔ اور عمر کا آخری حصّہ آرام و راحت سے گزرے چنانچہ وہ ۶۶/۶۵ سال کی عمر میں ۳۹۵/۳۹۴ ھ میں سلطان محمود کے دربار میں غزنہ پہنچا ۔ اور شاھنامہ کا کچھ حصہ پڑھ کر سنایا ۔ وزیر ابوالعباس فضل بن احمد کی حمایت سے کامیابی کی امید ہوئی ۔ لیکن افسوس کہ حاسدوں کی بدگوئی اور اپنی بدنصیبی کی وجہ سے متوقع صلہ نہ ملا اور وطن واپس آگیا ۔ بعد میں کئی سال پھر بادشاہ کو فردوسی کے کام کی عظمت کا خیال پیدا ہوا ۔ اس نے اسے ساٹھ ہزار دینار طوس بھجوائے ۔ لیکن اسی وقت فردوسی کا جنازہ دوسرے دروازے سے باہر نکل رہا تھا ۔ بقول دولت شاہ فردوسی ۴۱۱ ھ میں فوت ہوا ۔

بعض کا خیال ہے کہ سلطان محمود متعصب تھا ۔ شیعہ ہونے کی وجہ سے فردوسی انعام سے محروم رہا . اس کا ثبوت موجود نہیں . اس کے دربار میں عیسائی ، یہودی ، آتش پرست اور ھندو موجود تھے ۔ غضایری اور البیرونی جیسے شیعہ شاعر و

دانشور موجود تھے ۔ ایک مرتبہ غضایری کو پیلبار انعام ملا ۔ شاھنامہ کے تمام اصیل نسخوں میں خلفائے ثلاثہ کی منقبت میں اشعار موجود ہیں ۔ ایک شیعہ مصنف سے خلفا کی تعریف مستبعد ہے ۔

بقول نظامی فردوسی نے ہجو لکھی اور وہ سپہبد شہریار کے پاس طبرستان گیا اور اسے کہا کہ تمہارے اجداد کی تاریخ مرتب کی ہے ۔ میں آپکے نام منسوب کرتا ہوں ۔ اس نے کہا کہ میں سلطان محمود کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا ۔ ہجو مجھے دے دو تا کہ اسے دھو ڈالا جائے یا ضایع کر دیا جائے ۔ شہریار نے انعام و اکرام سے نوازا ۔ اور فردوسی نے ہجو شہریار کے حوالے کر دی ۔ یہ بیان مشکوک ہے اٹھتر اسی سال کی عمر میں طبرستان جانا درست معلوم نہیں ھوتا ۔ دوسرے شہریار کی شخصیت بھی غیر واضح ہے ۔ آل باوند میں شہریار ثالث ۳۹۷ میں فوت ہوجاتا ہے ۔ اسلئے اس کے پاس جانا ناممکن ہے ۔

ایک روایت یہ ہے کہ فردوسی سلطان محمود کے بھائی نصر بن ناصر الدّین سبکتگین کے پاس گیا اور اسے بادشاہ کے پاس سفارش کرنے کیلئے کہا تا کہ بادشاہ کی غلط فہمی دور ہو اور اسے تیس سالہ محنت کا معقول معاوضہ مل سکے ۔ یہ بیان درست ھوسکتا ہے ۔ کیونکہ فردوسی نے بعض مقامات پر اس سپہ سالار خراسان یا والی سجستان کی تعریف میں اشعار کہے ہیں ۔

بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ سلطان محمود نے فردوسی کو شاھنامہ لکھنے پر مأمور کیا اور ایک شعر کے بدلے ایک دینار دینے کا وعدہ کیا ۔ یہ بیان صحیح نہیں ۔ فردوسی کے اپنے بیان کے مطابق وہ طوس میں بیس سال تک لکھنے میں مصروف رہا ۔ بعد میں کسی عالیقدر بادشاہ سے منسوب کرنے اور بڑا صلہ حاصل کرنے کا آرزومند تھا ۔

سخن را نگہداشتم سال بیست بدان تا سزاوار این گنج کیست

فردوسی محب وطن شاعر تھے ۔ ایران کی سرزمین سے انہیں بے پناہ عقیدت و ارادت تھی ۔ وہ ایران کیلئے ھر چیز قربان کرنا چاہتے ہیں ۔

چو ایران نباشد تن من مباد بدین بوم و بر زندہ یك تن مباد
همه سر بسر تن به کشتن دهیم ازان به که کشور به دشمن دهیم

هجو سلطان محمود

چھار مقالہ قریب ترین مأخذ ہے جس میں مذکور ہے کہ فردوسی نے متوقع انعام سے محروم ہو کر سلطان محمود کی ہجو لکھی ۔ سپہبد شہریار کے کہنے پر ضایع کر دی گئی ۔ اب اس کے مندرجہ ذیل چھ ابیات باقی رہ گئے ہیں ۔

مرا غمز کردند کان پر سخن به مهر نبی و علی شد کهن

اگر مہرشان من حکایت کنم — چو محمود را صد حمایت کنم
پرستار زاده نیاید بکار — و گر چند باشد پدر شہریار
ازین در سخن چند رانم همی — چو دریا کرانه ندانم همی
به نیکی نبد شاه را دستگاه — وگرنه مرا بر نشاندی بگاه
چو اندر تبارش بزرگی نبود — ندانست نامِ بزرگان شنود

دیباچۂ بایسنغری مؤلفه ۸۲۹ ھ میں سو ابیات کی پوری ہجو موجود ہے ۔ حافظ محمود شیرانی نے بڑی جستجو و تحقیق سے ہجو کے اڑتالیس اشعار کے متعلق ثابت کیا ہے کہ وہ شاهنامه یا غیر از شاهنامه سے مأخوذ ہیں ۔ دیباچه نگار نے مختلف کتابوں سے اشعار لے کر اور باقی خود جوڑ کر ہجو تیار کی ہے ۔ (فردوسی پر چهار مقالے).

چهار مقاله مؤلفه ۵۵۰ ھ کے بیان سے ظاہر ہے کہ مصنف کے زمانے سے پہلے ہی ہجو وضع ہو چکی تھی ۔ کتاب میں مندرج سخت ہجویه شعر :

پرستارزاده نیاید بکار — وگر چند باشد پدر شہریار

یه شعر خود شاهنامه سے لیا گیا ہے ۔ اور یه انوشیروان کا قول ہے ، دیکھیے :

« پاسخ نامۂ خاقان از انوشیروان و فرستادن مهران ستاد را برای دیدن و آوردن دختر خاقان» (۱) ۔

دوسرا اعتراض یه ہے که « پرستارزاده » کی تعریض سلطان محمود پر منطبق نہیں ہوتی کیونکه اس کی ماں شاہ زابل کی شاہزادی تھی ۔ اسی لئے سلطان محمود کو زابلی بھی کہتے تھے ۔

پہلے دو اشعار سے ظاہر ھوتا ہے که فردوسی اهل تشیع هونے کی وجه سے انعام سے محروم رہا۔ لیکن فردوسی اس کی وجه حاسدوں کی بدگوئی اور اپنی بدقسمتی بتاتا ہے :

چنین شهریاری و بخشنده ای — بگیتی ز شاهان درخشنده ای
نکرد اندرین داستانها نگاه — ز بدگوئی و بخت بدآمد گناه
حسد برد بدگوی درکار من — تبه شد بر شاه بازار من

تصانیف

۱- شاهنامه . ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل بحر متقارب میں مثنوی .

۲- یوسف و زلیخا . منسوب به فردوسی ، محمود شیرانی نے اس مثنوی کا طویل تجزیه کرکے ثابت کیا ہے که اس کی زبان شاهنامۂ فردوسی سے مختلف ہے ۔ دیکھئے

۱- شاهنامه مطبوعه ۱۲۶۲ ھ ، جلد چهارم ، ص ۸۹۶ ۔

فردوسی پر چھار مقالے ۔

۳- مجموعۂ غزلیات و قطعات مرتبہ ڈاکٹر ایتھے ، مختلف تذکروں اور تاریخوں سے برگزیدہ کلام ۔

فردوسی نے اس بارے لکھا ہے :

ز هجرت شده پنج هشتاد بار — که گفتم من این نامۂ شاهوار

اس وقت اسکی عمر ۷۱ سال تھی :

چو سال اندر آمد به هفتاد و یك — همی زیر شعر اندر آمد فلك

جب اس نے سلطان محمود کے نام شاہنامہ منسوب کیا ۔ اس وقت اس کی عمر ۶۵ سال تھی ۔

چنین سال بگذاشتم شصت و پنج — به درویشی و زندگانی و رنج

اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ فردوسی ۳۹۵/۳۹۴ ھ.ق میں دربار میں حاضر ہوا. اس نے ایك جگہ لکھا ہے کہ کتاب لکھنے میں تیس سال صرف کیے ہیں ۔ دوسری جگہ پنتیس سال کا بھی ذکر کیا ہے :

بسی رنج بردم درین سال سی — عجم زنده کردم بدین پارسی

۴۰۰ سے ۳۵/۳۰ منھا کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے ۳۶۵ یا ۳۷۰ میں شاہنامہ باقاعدہ لکھنا شروع کیا تھا ۔

مآخذ شاہنامہ

فردوسی کے اپنے بیان کے مطابق وہ دفتر پہلوی/ نامۂ خسروان کی تلاش میں بخارا گیا. مرو اور ہرات بھی گیا ۔ مرو میں آزاد سرو سے داستان شغاد حاصل کی ۔ بلخ میں موبد سے خسرو پرویز کی گرفتاری کے حالات معلوم ہوئے ۔ بہت سے دوسرے اشخاص سے اطلاعات حاصل کیں ۔ منثور شاہنامہ ابو منصوری مل گیا تو وہ صحیح معنوں میں پورے شاہنامہ کی بنیاد بنا ۔

شاہنامہ شروع کرنے سے پہلے وہ بیژن و گرازان کی حکایت منظوم کرچکا تھا ۔ جس سے اس کو مقبولیت حاصل ہوئی تھی ۔

دقیقی کا گشتاسپ نامہ بھی اسکی نظر میں تھا ۔

فردوسی نے متذکرہ بالا دو کتابوں کے علاوہ اپنے مآخذ میں کسی اور کتاب کا نام نہیں لیا. حالانکہ سامانی دور میں یعنی فردوسی کے قریب العصر زمانے میں مندرجہ ذیل شاہنامے تدوین ہو چکے تھے :

شاہنامہ مسعودی مروزی . شاہنامہ ابو المؤید بلخی . شاہنامہ ابو علی بلخی.

شاهنامه منصور المعمری ۔

پهلوی میں خدای نامك کے عنوان سے سلاطین ایران کے احوال و کوائف پر کتابیں موجود تهیں ۔ ان کے عربی میں ترجمه ہوئے مثلاً :

سیر الملوك از عبدالله بن مقفع، سیر الملوك از محمّد بن جهم البرمکی ۔ سیر الملوك از هشام بن القاسم ، سیر الملوك از بهرامشاه بن مروانشاه اور سیر الملوك از بهرام اصفهانی.

پهلوی کی دوسری کتابوں میں سے واتکار زریران اور کارنامك ارتخشتر پاپکان بهی قابل ذکر ہیں ۔

محمّد بن جریر طبری نے اپنی کتاب تاریخ الرسل و الملوك المشهور به تاریخ طبری میں ساسانی عهد کے سلاطین کا حال لکها ہے .

ممکن ہے فردوسی ان میں سے بعض کتابوں کو بهی دیکها ہو .

تألیف شاهنامه

فردوسی نے ۳۸۴ ھ میں ایك مختصر شاهنامه لکها تها ۔ جیسا که اس کے بیان سے ظاہر ہے :

سر آمد کنون قصهٔ یزد گرد　بماه　سفندارند　روز ارد
ز هجرت شده سیصد از روزگار　چو هشتاد و چار از برش بر شمار

فتح بن علی البغدادی اصفهانی نے (۶۲۰-۶۲۴ ھ) میں شاهنامه کا عربی میں ترجمه کیا ۔

یه ترجمه اسی پہلی تحریر کا ترجمه ہے .

فردوسی نے ۳۸۴ ھ کے بعد اضافات کے ساتھ تکمیل جاری رکهی اور ۴۰۰ ھ کو مکمل کیا ۔

ز هجرت بشد پنج هشتاد بار　که گفتم من این نامهٔ شاهوار

اس کے بعد بهی فردوسی نے ترمیم و تصحیح کا سلسله جاری رکها ۔ جیسا که ذیل کے شعر سے ظاہر ہے ۔

کنون عمر نزدیك هشتاد شد　امیدم به یکبار برباد شد

مشمولات شاهنامه

ابتدا میں آفرینش جهان ، آفرینش مردم ، آفرینش آفتاب ، آفرینش ماه پر اظهار خیال کیا ہے بعد میں ستایش پیغمبر و یارانش ، ستایش ابو منصور محمّد بن عبدالرزاق ، سلطان محمود اور امیر نصر بن ناصر الدّین برادر سلطان محمود کے متعلق مدحیه اشعار لکهے ہیں . اس کے بعد اصل تاریخ شروع ہو جاتی ہے ۔ شاهنامه میں پیشدادی ،

لکھے ھیں . اس کے بعد اصل تاریخ شروع ھو جاتی ہے ۔ شاھنامہ میں پیشدادی ، اشکانی اور ساسانی عہد کے سلاطین کے احوال و کوائف بیان کیے گئے ہیں ۔ ذیل میں ان بادشاہوں کے نام درج ہیں ۔ جن کے متعلق کتاب میں تفاصیل موجود ہیں ۔

شاھنامہ کی تاریخی اہمیت

موجودہ دور میں مکتوبہ اور مکشوفہ آثار کی بناپر ایران کی اصلی و صحیح تاریخ مرتب کرنے میں مدد ملی ہے ۔ قدیم سلاطین میں سے سلسلۂ مادی (۷۰۱-۲۵۵ ق .م) سلسلۂ ھخامنشی (۲۵۶-۳۳۰ ق .م) اشکانی یا پارتی (۲۵۵ ق . م - ۲۰۸ م) تک کے حکمران ایران پر متصرف رہے ۔ شاھنامہ فردوسی میں ان خاندانوں کے بادشاہوں کا کوئی تذکرہ نہیں . صرف اشکانی بادشاہوں کے دو پادشاہ اردوان اور بھمن کا نام ملتے ہیں. البتہ ساسانی خاندان کے تمام بادشاہوں کا مسلسل و مرتب حال موجود ہے یعنی اردشیر بابکان سے یزدگرد سوم تک ۔ شاھنامہ کا یہ حصہ قدیم مآخذ پر مبنی ہونے کی بنا پر تاریخی اہمیت کا حامل ھے ۔

ایرانی سلاطین کے احوال و کوائف کے علاوہ اس زمانے کی تہذیبی و معاشرتی زندگی پر روشنی پڑتی ہے یہ حصّہ آج کل کسی ملک کی تاریخ کا اہم جزء سمجھا جاتا ہے ۔ شاھنامہ سے خاص طور پر بادشاہ کی شخصیت ، نظام دادرسی ، جنگ و صلح کے طریق ، تعلیمات دینی ، عسکری نظام ، شہری آبادی ، زراعت ، نظام خراج و مالیات ، آداب و رسوم دربار ، تقریبات جشن ، شکار ، چوگان بازی ، مذھب زرتشتی اور دوسری قسم کی انفرادی و اجتماعی معلومات حاصل ہوتی ہیں ۔

پیشدادی اور کیانی بادشاہوں کے نام اور کوائف اساطیری اور افسانوی ہیں ۔ اصلی تاریخ سے ان کا تعلق نہیں، محققین نے ان ناموں کی اصلیت کا سراغ اوستا اور سنسکرت سے لگایا ہے ۔ بعض داستانیں یونانی داستانوں سے مشابہ ہیں . رستم کی شخصیت کے دور رس کے کارنامے ما فوق الفطرت ہیں ۔ لیکن فردوسی نے انہیں دلکش انداز میں پیش کیا ہے ۔ سلاطین پیشدادی وطن کے عظیم الشان بادشاہ تھے ایران میں قومیّت و وطنیت کے احیاء کے زمانے میں ایرانی کیومرث ، جمشید ، فریدون ،منوچھر ، خسرو ، سھراب ، جیسے نام رکھنا عز و افتخار سمجھتے تھے ۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں یہ نام غیر اسلامی سمجھے جاتے تھے ۔

شاھنامہ کی ادبی اہمیت

شاھنامہ کی زبان سامانی دور کی زبان کا تسلسل ہے ۔ ابو شکور بلخی ، دقیقی اور رودکی کی زبان میں بھی کم و بیش وہی خصوصیات ہیں جو فردوسی کی زبان میں

موجود ہیں . فردوسی نے بھی ارادۃً عربی الفاظ کے استعمال سے اجتناب کیا ہے ۔ ایک اندازے کے مطابق شاھنامۂ میں پانچ فیصد عربی الفاظ ہونگے۔ شاھنامہ کی وجہ سے اس زمانے کی دلپذیر زبان محفوظ رہ گئی ہے ۔ جو آج بھی عام فہم ۵۵ ہزار اشعار میں بہت کم الفاظ سست و رکیك ملیں گے جو صاحب ذوق پر ناگوار گزریں ، بیان میں تکرار ہے کیونکہ اصل کے ساتھ مطابقت رکھنے کی وجہ سے شاعر کی مجبوری بھی تھی ۔ وہ بعض طویل قصوں کو اختصار سے بھی بیان کرنا چاہتا تھا ۔ جہاں شاعر نے کسی واقعہ کے متعلق ذاتی تأثرات بیان کیے ہیں وہاں کلام حسین متین اور دلنشین ہے ۔ شاھنامہ میں تقریباً ایك ہزار ضرب الامثال لائے گئے ہونگے ۔ ان کے استعمال سے ان کی توضیح و تفہیم میں مدد ملتی ہے ۔

پاکی زبان اورعفت بیان فردوسی کے کلام کی جان ہے .پورے شاھنامے میں ایک شعر بھی تہذیب و اخلاق سے گرا ہوا نہیں ۔ وہ الفاظ کے در و بست کا خاص خیال رکھتا ہے ۔ الفاظ و تراکیب میں شکوہ و وقار ہے ۔

اسلوب بیان

شاھنامہ کا عام اسلوب سادہ، رواں اور متین ہے لیکن کہیں کہیں صنایع لفظی کا بھی اِلتزام کیا ہے لیکن روانی میں خلل واقع نہیں ہوا اورتصنع و تکلف پیدا نہیں ہوا ۔ مثلاً لف و نشر مرتب کے استعمال کیلئے یہ دو اشعار بہترین مثال ہیں ۔

بروز نبرد آن یل ارجمند به شمشیر و خنجر به گرز و کمند
برید و درید و شکست و ببست یلان را سر و سینه و پا و دست

فردوسی کے کلام میں صنعت تضاد ، اشتقاق اور مراعات النظیر کا استعمال بڑا خوبصورت ہے ، رزمیہ شاعری میں واقعات جنگ اور لوازم جنگ کا حسین و دلپسند نقشہ پیش کرنا کمال فن شمار ہوتا ہے ۔شاعر کو جزئیات پر بھی نگاہ رکھنی پڑتی ہے ۔ موقع و محل اور وقت کے تقاضوں کو بھی مدِّنظر رکھتا ہوتا ہے ۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ قوت متخیلہ سے کام لے کر شعری لطافتوں کو بھی برقرار رکھنا پڑتا ہے ۔ اس نقطہ نظر سے فردوسی اپنی مثال آپ ہے ۔ شاھنامہ میں اس قسم کے نقوش جا بجا ملتے ہیں ۔

رزمیہ شاعری میں شاعر ایجاز و اختصار سے کام لیتا ہے ۔ ایجاز بیان گویا اعجاز بیان ہے ۔ بادشاہ نے ایك حریف کو یہ پیغام بھیجا ہے کہ اگر وہ صلح پر آمادہ نہیں ہوتا تو پھر جنگ کیلئے تیار ہو جائے ۔ فردوسی نے ایك شعر میں مضمون باندھ کر ایسا رعب و دبدبہ کا اظہار کیا کہ باید و شاید ۔

اگر جز به کام من آید جواب من و گرزم و میدان و افراسیاب

رزمیہ شاعری

فردوسی کے شاہنامہ کو جو شہرت عام اور قبول دوام حاصل ہوا وہ کسی اور شاہنامے کو نصیب نہ ہوسکا ۔ بلا شبہ یہ فارسی رزمیہ شاعری کا عظیم ترین اور سب سے جامع اور حسین نمونہ ہے ۔ رزمیہ عناصر کے ذیل میں یہ باب قابل ذکر ہے کہ اس رزمیہ تاریخ میں زیادہ تر بادشاہوں اور پہلوانوں نے بے گناہوں اور مظلوموں کے انتقام لیے ہیں ۔ اس طرح جنگ و قتال میں ہیجان اور نفرت و عداوت کے جذبات میں شدت کا اظہار ہوتا ہے جن کے بیان میں شاعر کو نفسیات میں مہارت اور قادر الکلامی کا ثبوت دینا پڑتا ہے چنانچہ شاہنامہ فردوسی میں ہوشنگ نے سیامک کا، فریدون نے جمشید کا ، منوچہر نے ایرج کا ، کیخسرو اور رستم نے سیاؤش کا، اسفندیار نے لہراسب کا ، فرامرز نے رستم کا اور بہمن نے اسفندیار کا انتقام لیا ہے ۔

فردوسی میدان جنگ کا نقشہ ، پہلوانوں کے اوصاف ، فردی اور مجموعی جنگوں کے مناظر اس فنی مہارت سے پیش کرتا ہے کہ اس کے نقوش قاری کی چشم تصور کے سامنے مجسم ہوجاتے ہیں ۔ فردوسی نے میدان جنگ اور لشکروں کے تصادم کے جو احوال و کوائف بیان کیے ہیں ، ان سے لشکر کشی سے اس کی گہری واقفیت کا اظہار ہوتا ہے ۔ فردوسی دکھاتا ہے کہ میدان جنگ میں عجیب غوغا برپا ہے ۔ پہلوان ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے ہیں ۔ گھوڑے اچھل کود رہے ہیں ۔ ہتھیاروں کے تصادم سے بے پناہ شور ہو رہا ہے ۔ پہلوانوں کے نعروں سے زمین لرز رہی ہے ۔ پکڑو اور مارو کی آوازیں آ رہی ہیں ۔ گرد و غبار سے فضا تاریک ہے ۔ کشتوں کے پشتے لگے ہیں ۔ گرزوں کی ضرب سے پرے کے پرے ٹوٹ رہے ہیں ۔ تیروں کی بوچھاڑ ہے ۔ اعضائے انسانی کٹ کٹ کر زمین پر گر رہے ہیں ۔ صحرا میں سیل خون رواں ہے دو پہلوانوں کے درمیان لڑائی میں گرز ، خنجر ، کمند اور نیزہ استعمال ہوتا ہے ۔ کبھی گھوڑوں سے اتر کر دست بدست کشتی لڑتے ہیں ۔ فردوسی نے ایسے دو تین مقابلوں میں بڑے تنوع سے کام لیا ھے ۔ وہ ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ دلکش و زیبا پیش کرتا ہے ۔ ایک کا دوسرے سے تعارف کراتا ہے ۔ لڑائی کے انجام سے آگاہ کرتا ہے ۔ موت کا خوف دلاتا ہے ۔ دو جنگجو پہلے ایک دوسرے پر تیر چلاتے ہیں ۔ پھر نیزے مارتے ہیں۔ پھر تلواروں کے ساتھ نبرد آزما ہوتے ہیں یا گرزوں سے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے ہیں آخر میں کشتی لڑتے ہیں ۔ اس قسم کے دو تین مقابلوں میں فردوسی نے کمال مہارت سے نقشہ کشی کی ہے ۔ رستم و سہراب ، رستم و افراسیاب ، اسفند یار و دیو سپید کے مقابلوں میں اس نوع کی توصیف نگاری فردوسی کا شاہکار شمار ہوتی ہے ۔

گروہی اور متحارب فوجوں کی آویزشوں کا حال کہیں مختصر اور کہیں تفصیل سے ہے ۔ خصوصاً ایران و توران کے درمیان لشکر آرائیوں کا حال تفصیل سے لکھا ہے ۔ فوجوں کی حرکات منظم اور با شکوہ ہوتی تھیں ۔ ہر دستے کا الگ پرچم اور ہر پرچم کا الگ نشان ہوتا تھا ۔ پرچموں اور ہتھیاروں پر مختلف جانوروں کی تصویریں ہوتی تھیں.

شاھنامه میں بعض جگه ایسے مواقع آئے ہیں جہاں دو کرداروں میں باہمی عداوت و نفرت یا غصه و خشم کا اظہار ہوا ہے اور صورت ڈرامائی انداز اختیار کر گئی ہے . بادشاہوں ، پہلوانوں ، بڑوں چھوٹوں ، مردوں عورتوں میں گفتگو ہوئی ہے ۔ شاعر جو انسانی نفسیات سے آگاہ ہے مختلف طبقوں کی سطح عقل کو جانتا ہے اور وہ کردار کے منه میں وہ الفاظ ڈالتا ھے اور ایسی زبان میں ان سے بات کہلواتا ہے جو اس کی فطرت، عمر اور مرتبے کے مطابق ہوتی ہے ۔ شاھنامه میں اس قسم کی مثال وہ ہے جہاں مسلمانوں کا سفیر شاہ ایران کو دعوت اسلام دیتا ہے یا جنگ کرنے کیلئے تیار رہنے کی تہدید کرتا ہے ۔ بادشاہ سادہ لباس عرب کو جواب دیتا ہے ۔ جس سے اس کے کبر و نخوت و تحقیر ظاہر ہوتی ہے ۔

ز شیر شتر خوردن و سوسمار　　عرب را بجای رسید است کار
که تخت کیان را کنند آرزو　　تفو بر تو ای چرخ گردان تفو

شاھنامه میں صرف جنگوں کا بیان ہی نہیں بلکه ایسی داستانیں بھی آئی ہیں جن میں عشق و محبت کے نرم و ملائم جذبات کا بھی اظہار ملتا ہے مثلاً زال و رودابه ، سیاؤش و سودابه اور منیژہ و بیژن ۔ ان عشقیه کہانیوں میں رزمیه کے علاوہ بزمیه شاعری کے بھی نمونے ملتے ہیں ۔ محبت کے کردار شاہوں ، سالاروں اور پہلوانوں کے متعلق ہیں ان کی محبت کے طور طریق بھی اپنے زمانے کے مطابق جرأتمندانه اور بہادرانه ہیں. فردوسی نے جذبات نگاری میں بھی مہارت کا ثبوت دیا ہے ۔ دردناک مواقع پر المیه احساسات کو سلیقے سے بیان کیا گیا ہے ۔ مثلاً رستم و سہراب کے قصے میں سہراب کی موت پر اس کی ماں کے المناك قلبی احساسات کی ترجمانی کی ہے ۔

شاھنامه کی ایك نمایاں خصوصیت یه ہے که اس میں جنگوں اور کہانیوں کے ضمن میں نیك اخلاق کی تبلیغ کی گئی ہے ۔ زندگی میں کام آنے والی باتیں مؤثر اور بلیغ انداز میں بیان کی گئی ہیں . جھوٹ کی برائی ، سچ کی خوبی ، قول کی پختگی ، پاس وفا ، بردباری ، حسد و حرص ، غضب و غرور اور تعجیل کے بد نتائج ، بخشش و نیکنامی اور آبرومندی کا خیال ، جنگ و جدل اور غیر ضروری خونریزی سے پرہیز ، عدل و انصاف اور دوسری نیکی و شرافت کی باتیں فردوسی نے حکیمانه انداز میں بیان کی ہیں ۔

انسان دوستی ، وفاداری اور وطن پرستی کیلئے اس کے پند و موعظت یادگار حیثیت رکھتے ہیں .

نقائص شاهنامه

شاهنامه میں چند ایسے اشعار ہیں ۔ جن کا مفہوم متعین نہیں ۔ بعض اشعار میں قافیه درست نہیں ۔ بعض اشعار اور مصراع کلی یا جزوئی طور پر دوسری جگه مکرر آئے ہیں . ممکن ہے کاتبوں کی تحریف و تصحیف سے بعض غلطیاں پیدا ہوگئی ہوں . تاریخی غلطیاں تو اصل کتاب میں موجود ہوں گی ۔ فردوسی نے تحقیق کیے بغیر ان کو نقل کر دیا ہے . چونکه پورا شاهنامه مکمل ہونے میں تیس پینتیس سال لگ گئے . ترمیم و اضافه بھی ہوتا رہا ، ہو سکتا ہے بعض واقعات کے بیان میں بھول چوک ہوگئی ہو . مثلا رستم کی موت کا کوئی ذکر نہیں ۔ سکندر کو عیسائی کہا ہے کیانی عہد میں قیصر روم کا نام لیا ہے ۔ شاعر بھول گیا ہے که جو واقعات بیان کیے جا رہے ہیں . وہ قبل از اسلام کے عہد سے متعلق ہیں . ما فوق الفطرت باتوں کا تو شمار نہیں . انہیں کس طرح یقین کیا جا سکتا ہے ۔ رستم و اسفندیار کے هفت خوان ، جمشید کی بیٹیاں هزار سال گزر جانے کے بعد فریدون پر بھی فریفته نظر آتی ہیں ۔

بعض واقعات کو خواہ مخواہ طول دیا گیا ہے ۔ اگر ان کو مختصر کیا جاتا تو اور بھی دلنشین ہوتا.

حکیم سنائی (۱)

ابو المجد مجدود بن آدم متخلص به سنائی کا تاریخ ولادت ۴۶۳ یا ۴۷۳ ھ کے قریب ہے. شهر غزنین میں پیدا ہوئے ۔ سنائی نے غزنین کے علاوہ سالها سال بلخ، سرخس، هرات اور نیشاپور میں بسر کیے ۔ بلخ سے ماں باپ اور بیوی بچوں کو چھوڑ کر حج کعبه کیلئے روانه ہوئے اور وہیں واپس آئے ۔ ۵۱۸ ھ میں غزنین واپس گئے ۔ زندگی کے آخری سال غزنه میں ہی گزارے ۔ خواجه عمید احمد بن مسعود تیشه نے گھر بار اور سامان راحت مهیا کیا اور متفرق اشعار جمع کرنے کیلئے آماده کیا ۔ مقدمه دیوان اور حدیقه میں ابن مسعود تیشه کی بہت تعریف کی ہے ۔

۱- تفصیل کے لئے دیکھئے :دیوان سنائی غزنوی ، مرتبه مدرس رضوی ، تهران ، ۱۳۴۱ ، مقدمه . دیوان حکیم سنائی مرتبه مظاهر مصفا ، تهران ، ۱۳۳۶ ھ .ش ، مقدمه . احوال و آثار حکیم سنائی ، خلیل الله خلیلی ، کابل ، ۱۳۱۵.

سنائی تفسیر ، حدیث ، فقه اور ادبی علوم میں ماہر تھے۔ حکمت ، کلام ، فلسفه ، هیأت ، نجوم ، هندسه اور طب میں بھی مہارت رکھتے تھے ۔ تعبیر خواب میں بھی درك رکھتے تھے ۔ ان تمام علوم کی اصطلاحات ان کے اشعار میں موجود ہیں ۔

سنائی نے امام ابو حنیفه اور امام شافعی کی تعریف کی ہے ۔ اور ان کے مسلك کو حق کہا ہے ۔ سنائی شیخ یوسف همدانی کے مرید تھے جو مشهور عالم تھے اور مشایخ کبار میں شمار ہوتے تھے ۔

سنائی کے معاصر محمّد علی ارقام مرتب حدیقة الحقیقت نے دیباچے میں ۱۱ شعبان ۵۲۵ ھ سنائی کا سال وفات لکھا ہے اور اسے ہی قریب صحت ماننا چاہیے ۔

سنائی کو حکیم و شیخ کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے ۔ شعراء ، علماء ، اور عرفاء میں اس کو عالی رتبه سمجھا جاتا ہے ۔ فضل بن یحیی معروف به عارف زرگر قاضی هرات نے سنائی کے متعلق لکھا ہے :

شعر تو روحانیان گر بشنوند از روی صدق بانگ برخیزد ازیشان کی سنائی مرحبا
حجتی بر خلق عالم زین دو فعل خوب خویش شاعری بی ذلّ طمع و پارسائی بی ریا
عیسی عصری که از انفاس روحانیت هست مردگان آز و معلولات غفلت را شفا
بس طبیب زیرکی زیرا که بی نبض و دلیل در دهر کس را ز راه نطق می سازد دوا

امام محمّد غزالی ، مختاری غزنوی ، علی بن هیصم اور پسر شهابی جیسے معاصر شعراء نے بھی سنائی کی مدح و ستایش کی ہے ۔ متأخر شعراء میں سے خاقانی ، ابو العلا گنجوی ، مولانا روم اور غزالی مشهدی نے بڑھ چڑھ کر تعریف کی ہے ۔ عطار ، سعدی ، نظامی ، بیدل اور اقبال نے اس کی پیروی کی ہے ۔

سنائی نے اپنی ابتدائی زندگی میں وزراء ، امراء ، قضاة و صدور کی مدح و ستایش میں قصاید لکھے ہیں اور ان سے مال و متاع کیلئے صلے کی خواہش کی ہے ۔ اس زمانے میں رکیك ہجو و ہزل پر بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن تغییر حال کے بعد علو ہمت اور اخلاق حمیده کی تلقین کی ہے ۔

سنائی کی زندگی میں انقلاب آنے سے متعلق تذکروں اور تاریخوں میں کئی اسباب و وجوه کا ذکر کیا گیا ہے ۔ لیکن وہ فرضی و جعلی ہیں ۔ نفحات الانس اور مجالس العشاق میں مذکور یه واقعه زیاده مقبول رہا ہے ۔ ایك میخوار مجذوب نے کہا ۔ سنائی حکیم و داتا ہوتے ہوئے حقیر دنیوی متاع کیلئے نالایق امراء کی تعریف کرتا ہے ۔ اور اپنی کور دلی کا ثبوت پیش کرتا ہے ۔ سنائی سخت متأثر ہوئے اور قصیده سرائی ترک کر دی ۔

تألیفات

۱- کلیات سنائی مرتبه مدرس رضوی میں قصاید، ترکیب بند ، ترجیع بند، غزلیات ،

قطعات ، رباعیات ، زهدیات اور قلندریات شامل ہیں ۔

۲- حدیقة الحقیقة (مثنوی) جو الهی نامه اور فخری نامه سے بھی معروف ہے ۔ کامل نسخه ۱۲ ہزار ابیات پر مشتمل ہے ۔

۳- طریق التحقیق ، حدیقه کی طرح اس مثنوی میں بھی حقایق و معارف کا بیان ہے ۔ ۸۹۶ ابیات پر مشتمل ہے ۔ اور حدیقه کی بحر میں ہے ۔

۴- سیر العباد الی المعاد (مثنوی) ۔ کل ابیات ۷۷۰ ہیں ۔ حدیقه کی بحر میں ہے ۔

۵- مثنوی کارنامه بلخ یا مطایبه نامه ، ابیات کی تعداد ۴۹۷ ہے ۔ مدرس رضوی نے مجله فرہنگ ایران زمین میں ۱۳۳۶ ھ. ش کو شایع کیا ۔

۶- عقلنامه ۔ یه سب سے چھوٹی مثنوی ہے اور ۱۹۵ ابیات پر مشتمل ہے ۔

۷- مثنوی عشقنامه ۔ کل ۵۷۶ ابیات ہیں ۔ پند و موعظت ، عشق و محبت و روح ، حدوث و قدم اور حکایات و تمثیلات پر مشتمل ہے ۔

۸- سنائی آباد ۔ یه مثنوی صفات باری تعالی ، نعت رسول ، مراتب عقل ، وجد و رقص و سماع ، مرشد و مرید ، رباط و صومعه ، توکل و قناعت ، صبر و شکر و توبه وغیره مضامین سے بحث کرتی ہے ۔

۹- تحریمة القلم یا تجربة العلم ۔ ۲۰۲ ابیات پر مشتمل ہے ۔ استاد مجتبی مینوی نے مجله فرہنگ ایران زمین میں شایع کر دیا ہے ۔

۱۰- مقدمه نثر حدیقه ۔

۱۱- مکاتیب سنائی ۔ ڈاکٹر نذیر احمد (ہند) نے شایع کر دیا ہے ۔ کابل ، ۱۹۷۷.

شاعری

سنائی نے مثنوی ، قصاید ، غزلیات ، ترکیب بند و ترجیع بند ، مقطعات اور رباعیات پر طبع آزمایی کی ہے ۔

قصیدہ گوئی

یه سارا کلام سنین کی ترتیب سے مدون نہیں کیا گیا ۔ کیونکه اس میں بعض متضاد عقاید و افکار کا اظہار ہوا ہے ۔ ہو سکتا ہے که سنائی کسی ایك بات کے معتقد ہوں اور بعد میں اپنا نقطه نظر بدل لیا ہو ۔ تذکرہ نگار لکھتے ہیں که سنائی تقریباً اپنی پہلی چالیس ساله زندگی تك عام درباری شعراء کی طرح مدح و ستایش کرتے تھے اور انعام و صله سے اپنی معاش مہیا کرتے تھے ۔ ان کے ممدوحین میں چار سلاطین ، ستره وزراء و صدور ، اکیس علماء ، عرفاء و قضاة اور پندره شعراء شامل ہیں ۔ ان ممدوحین میں اکثر ایسے نظر آتے ہیں ۔ جو واقعی عالی رتبه ، عالی صفات ہیں جو قابل مدح و ستایش

ہیں . اسلئے سنائی نے بڑے بڑے القاب سے ان کی تعریف کی ہے ۔ رواج کے مطابق مبالغہ تو شیوۂ بیان میں شامل تھا . لیکن شاعر اپنی تمام فطری و فنی و علمی صلاحیت کے باوجود معمولی انعام پائے اور اپنے علم و فن کو بیچنے والے خوشامد پرست کہلائے ۔ معلوم ہوتا ہے جب سنائی کو احساس ہوا اور ساتھ ہی انہوں نے اہل زمان کے پست اخلاق و بد اعمال کا مشاہدہ کیا تو دنیوی زندگی سے بیزار ہوئے اور زہد و تقوی و سلوك کی طرف مائل ہوئے اور ان کی شاعری نے ایك نیا رخ اختیار کیا ۔

سنائی نے اکثر مدحیہ قصاید میں تشبیب کے بغیر ہی مدح و ستایش شروع کردی ہے ۔ کہیں کہیں رواج کے مطابق تشیب بھی لائے ہیں . عموماً مجلس ناز و نوش کا ذکر ہے یا محبوب کے ناز و ادا کا ذکر کیا ہے ۔ کہیں کہیں باغ و بہار کا نقشہ پیش کیا ہے ۔ مثلاً :

ساقیا می ده که جز می نشکند پرهیز را تا زمانی کم کنم این زهد رنگ آمیز را

ما در طلب زلفِ تو چون زلف تو پیچان ما در هوس چشمِ تو چون چشم تو بیمار

مدحیہ قصاید کی وجہ سے بھی سنائی کا مقام و مرتبہ اچھے قصیدہ سراؤں میں ہو سکتا ہے ۔ وہ قصیدہ میں سبك خراسانی کا ہی نمایندہ شمار ہو سکتا ہے ۔ فرخی اور منوچہری کے آس پاس کھڑا ہو سکتا ہے ۔ اس میں وہ تمام صفات پائی جاتی ہیں جو ان شعراء میں ہیں . عربی میں مہارت ہونے کی وجہ سے بعض جگہ عربی مصرعے لکھے ہیں ۔ اور ایك قصیدے میں قرآنی آیات لانے کا اہتمام کیاہے ۔ چھوٹی بڑی بحروں کو ہنرمندی کے ساتھ استعمال کیا ہے ۔ اسے معلوم ہے کہ شاعر بننا بڑا مشکل کام ھے اور اسی لئے کہا ہے :

عمرها باید که یك کودکی از روی طبع عالمی گردد نکو یا شاعری شیرین سخن

تخلیق شعر میں جو محنت کرنا پڑتی ہے ۔ اور خون جگر پینا پڑتا ہے. اس کا بھی ان کو احساس ہے :

چون برهِ سخن درون آیم خواهم که قصیده ای بیارایم
ایزد داند که جانِ مسکین را تا چند عنا و رنج فرمایم
صد بار به قعر در شوم تا من از عهدۂ یك سخن برون آیم

مدح سرائی کے علاوہ سنائی نے زندگی کے دوسرے موضوعات کو فکر سخن میں شامل کیا ہے ۔ صحیح معنوں میں وہاں سنائی کی عظمت کے نشان ملتے ہیں ۔ انہوں نے زندگی کے ہر شعبے کے متعلق بات کہی ہے اور حکیمانہ نکات کے ساتھ تبصرے کیے

ہیں ۔ انہوں نے اپنے تمام علوم و تجارب کو کام میں لا کر آدمی کو اس کا اعلی مقام دکھایا ہے اور اسکی اصلاح و ارتقاء کیلئے حکمت و موعظت کے جواہر پیش کیے ہیں ۔ ان قصاید میں توحید ، تواضع اهل دل ، ترک دنیا و زخارف ۔ تحریص بسوی زهد و انزوا ۔ مقام اهل توحید ، اخلاق عالیه ، اغنای طبع و اعتلای همت ، عظمت انسان اور دینی احکام پر اظهار نظر کیا گیا ہے ۔ ان مثبت افکار کے مقابل میں شکایت روزگار و بیوفائی مردم ، مذمت اهل عصر ، نکوهش اصحاب قال و اصحاب صورت اور اجتماعی زندگی کی خرابیوں کی نشاندہی کی ہے ۔

عظمت آدم اور همت بلند کے متعلق سنائی کے مندرجہ ذیل اشعار معروف ہیں :

چرخ و اجرام چاکران تواند تو از ایشان طمع مدار مدار
حلقه در گوش چرخ و انجم کن تا دهندت به بندگی اقرار

هزارہا ایسے شعراء ہیں ۔ جنھوں نے ساری عمر قصاید لکھے یا غزل سرائی کی ۔ وہ یا تو دوسروں کی مدح و ستایش میں لگے رہے یا عشق کی روایتی رومانویت میں کھوئے رہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ۔ وہ گویا انسانوں میں زندگی بسر نہیں کر رہے تھے اور ماحول اورسماج کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا اور نہ انہوں نے گردِ و نواح کے بسنے والوں کو متأثر کیا ۔ سنائی ایسے شاعر ہیں جنھوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر اپنے زمانے کے لوگوں کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا ہے ۔ خاص طور پر مسلمانوں کو مخاطب کرکے ان کی برائیاں گنوائی ہیں ۔ انفرادی بھی اور اجتماعی بھی ۔ قصاید میں ان کی مثالیں دیکھیے :

راهِ دین پیداست لیکن صادق دین دار کو یك جهان معشوق بینم عاشق غمخوار کو
عالمی پر ذوالخمار است از خمار خواجگی ای دریغا در جهان یك حیدر کرار کو
معلفِ اسپان تازی را خران بگرفته اند در چنین تشویش ملك ، ای زیرکان افسار کو
بوبکر و عمر و عثمان و علی بینم همی آن حیا و حلم و عدل و صدق آن هر چار کو
سر بسر دعوی ست مرد ، مرد معنی دار کو تیزبینی ، پاکدستی ، رهبری ، غمخوار کو

جهان یکسر همه پر دیو و پر غولند و امت را که یارد کرد جز اسلام و جز سنت نگهبانی
مسلمانان ، مسلمانان ، مسلمانی مسلمانی ازین آئین بی دینان پشیمانی پشیمانی

منسوخ شد مروت و معدوم شد وفا زین هر دو مانده نام چون سیمرغ و کیمیا

سنائی نے مسلمانوں کی صرف خرابیوں کی نشاندہی نہیں کی بلکہ ان کی اصلاح کیلئے مشورےبھی دئیے ہیں ۔ اصل دین کو اپنانے ، شرع محمدّی پر عمل کرنے اور قرآنی احکام پر سرِ تسلیم خم کرنے کی تعلیم دی ہے ۔ اور ساتھ ہی اهل توحید کی خوبیاں بتائی ہیں اور اخلاق عالیه کی خصوصیات بتائی ہیں ۔ مثلاً :

تکیه بر شرع محمّد کن و بر قرآن کن زانکه عروهٔ وثقای تو جز قرآن نیست
مگذر از حکم آیة الکرســـــــی سنگ بفگن چــو یافتی یاقوت

همچو مردانت قدم در راه دین باید نهاد دیـده بر خط هدی للمتقین باید نهاد
نفس فرعون است و دین موسی و توبه چون عصا رخ بسوی جنگ فرعون لعین باید نهاد

شراب حکمت شرعی خورید اندر حریم دین که محرومند زین عشرت هوس گویان یونانی

چو علمت هست خدمت کن چو دانایان که زشت آید گرفته چینیان احرام و مکی خفته در بطحا
چو علم آموختی از حرص آنگه ترس کاندر شب چو دزدی با چراغ آید گزیده تر برد کالا

مردکی گردد بگرد هفت کشور نامور تا بود این هفت حرف اوصاف ذاتش با خبر
مهر جود، حرص فضل و ملك عقل و دست عدل خلق خوب و طبع پاك و یاد نیك و بذل زر

سنائی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں ۔ جنہوں نے تصوف و سلوك کو ایك طریقت کے طور پر باقاعدہ پیش کیا ۔ خاص طور پر مثنوی حدیقة الحقیقة اس کا ثبوت ہے ۔ لیکن انہوں نے قصاید میں بھی جا بجا ان بنیادی باتوں پر عمل کرنے کی نصیحت کی ہے جو اھل تصوف و طریقت کیلئے لازم ہیں ۔ مثلاً :

خود را ز میان خـود بردار ازیراك کس بر تو درین ره ز توئی تو بتری نیست

از پوست برون آی و همه دوست شو زیرا کانگه کـه همـه دوست شوی هیچ نمیری

بمیر ای حکـیم از چنین زندگانی کزین زنـدگانی چـو مردی بمانی
به بستانِ مرگ آی تا زنده گردی بسوز این کفن ژنـدهٔ باستانی

شاید سنائی پہلے شخص ہونگے جنہوں نے می و میکدہ ، رند و خرابات جیسی اصطلاحات کو مضامین تصوف کیلئے استعمال کیا ۔ ذیل کے اشعار میں یہ روش نمایاں ہے ۔

تا معتکف راهِ خرابات نگردی شایستهٔ ارباب کرامات نگردی
از بند علایق نشود نفس تو آزاد تا بندهٔ رندان خرابات نگردی
تا خدمت رندان نگزینی بدل و جان شایسته سُکانِ سماوات نگردی

سنائی نے انسانی عظمت کو یاد دلانے کیلئے اور آدمی کو اس کا کھویا ہوا مقام واپس دلانے کیلئے اسے بار بار کچوکے دیے ہیں اور اپنے قصاید میں بہت سے مواقع پر اس

موضوع پر اظہار فکر و نظر لکھا ہے ۔ گویا ان کے فکر کی یہ بھی مہم بالشان خصوصیت ہے جس نے سنائی کو بھی با عظمت بنا دیا ہے ۔ مثلاً :

ای ایزدت از رحمت آفریده در سایهٔ لطفت پرورید‌ه
در مجلس تو جبرئیل ساقی بر درت مگس گیر بر تنیده

سنائی کے وہ قصاید اپنے علم و فضل ، عز و احترام اور صدق و خلوص کے اعتبار سے شاندار ہیں ۔ جو انہوں نے حمد و ثنائے خداوندی اور نعت رسول مقبول کے متعلق لکھے ہیں ۔ وہ موضوع کی مناسبت سے اپنے اندر الفاظ و ھیأت کا بھی شان و شکوہ رکھتے ہیں۔ مثلاً :

ای منزه ذاتِ تو عما یقول الظالمون گفت علمت جمله را مالم تکونوا تعلمون
زهی پشت و پناه هر دو عالم ســرو ســالارِ فرزندان آدم

غزلگوئی

مطبوعہ دواوین کے اعتبار سے سنائی پہلے شاعر ہیں جنہوں نے غزل کو صنف سخن کی حیثیت سے اپنایا ۔ ان سے پہلے اور انہوں نے خود بھی قصاید میں غزل کو تشبیب کا جزو بنایا ۔ زمانے کے رواج کے مطابق ان کا محبوب بھی ترک و سپاہی زادہ ہے ۔ اس کے گیسو ، ابرو ، چشم ، رخسار ، زنخدان ، خط ، قد و قامت کی تعریف کی ہے اور تشبیہات و استعارات جنگی آلات و شکار سے مستعار لیے ہیں .مثلا تیر، کمان، دام، ناوك ، سناں ، چاہ وغیرہ . سنائی کا محبوب « پسر » ہے نو غزلیں ایسی ہیں جن کی ردیف میں « ای پسر» آیا ہے ۔ دوسری غزلوں میں اسے « ای دلبر» «جانا » « ای یار» « پسرا » « ای دوست » « ای جاناں » بھی کہا ہے ۔ شاید دو جگہ معشوق کی بجائے « معشوقه » آیا ہے . اور فارسی شاعری میں شاید پہلی دفعہ عورت مطمح نظر عشق ٹھری ہے درج ذیل شعر ملاحظہ ہو :

معشوقه که او چابك و چالاك نباشد آرامِ دلِ عاشق غمناك نباشد

ایك غزل میں کلاہ دوز اور پسر قصاب کی بھی تعریف کی ہے .

غزل کے دوسرے مضامین میں ہجر و وصال ، بے وفائی ، شکایت ، محفل می و مینا ۔ بزم نشاط و موسیقی جیسے موضوعات پر اکثر طبع آزمائی کی ہے ۔ مثلاً یہ چند اشعار ایك غزل کے ملاحظہ ہوں :

ای ببر کرده بیوفائی را منقطع کرده آشنائی را
ببر ما امشبی قناعت کن بنما خلقِ انبیائی را

اکثر غزلوں میں شراب کی خواہش کا بھی ذکر ہے اور بوسہ و کنار محبوب سے

لطف اندوز ہونے کی بھی ہوس ہے ۔ مثلاً :

می دہ ای ساقی کہ می بہ درد عشق آمیز را　　زندہ کن در می پرستی سنت پرویز را
نرگس و شمشاد سوسن مشك و سیم و ماہ و گل　　تا بہ ہنگام سحر ہر ہفت در برداشتم

لیکن اس قسم کے خیالات محض تجریدی تصورات ہیں ۔ حقیقت سے ان کا تعلق نہیں یہ محض موضوعات غزل ہیں . مثلاً وہ کہتے ہیں :

بھوا و بشھوت نفسی　　جان پاکیزہ را نیا لودم

اور پھر ،

می شوق ملك نوش از حقیقت　　کہ تا گردد دل و جان تو خرم

بعض غزلوں میں عشق و عاشقی سے متعلق مختلف احوال و کوائف بیان کیے ہیں . مثلاً :

عشق بازیچہ و حکایت نیست　　در رہِ عاشقی شکایت نیست
حسن معشوق را چو نیست کران　　درد عشاق را نہایت نیست
عالم علم نیست عالم عشق　　رویت صدق چون روایت نیست
ہر کہ عاشق شناسد از معشوق　　قوت عشق او بغایت نیست

آغاز عشق یك نظرش با حلاوت است　　اتمام عشق جز غم و جز آہ سرد نیست

سنائی نے نصیحت کی ہے ۔ اگر ہو سکے تو عشق کے پاس نہ جاؤ :

اینست نصیحت سنائی　　عاشق مشوید گر توانید

قطعہ نگاری

قطعات ایك طرح سے مختصر قصاید ہوتے ہیں ۔ ان میں عموماً مختصر طور پر عقاید و افکار کا اظہار کیا جاتا ہے ۔ ان میں تعزیت ، تہنیت اور مرثیت کے مضامین بھی آ جاتے ہیں. لیکن تاثرات زیادہ ہوتے ہیں۔ سنائی کے قطعات میں قصاید کی طرح، مذمت دنیا ، شکایت روزگار ، مذہب اھل الزھد ، مذمت دنیاداران ، تصوف ، استغنا عن الخلق و ہجو اور اجتماعی خرابیوں پر تبصرے اور شاعر کے اپنے احوال و کوائف بیان ہوئے ہیں ۔

سنائی نے بعض قطعات میں اپنی اور اپنے زمانے کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے ۔ تخلیق شعر کی مشکلات سے بھی آگاہ کیا ہے ۔ اپنے زمانے میں شعراء کی نا قدری کی طرف بھی اشارہ کیا ہے ۔ مثلاً :

حقا کہ بہ لفظ ملح و شعر و معانی　　در زیر فلك ہیچکس یار ندارم
دارم سخنان چو زر اندر دل چون شمس　　چہ باکم اگر بدرۂ دینار ندارم

با این همه هنر و فضل و کفایت با جان عزیز تو که تلوار ندارم

چند قطعات میں مسائل تصوف کا بھی بیان ہے ۔ سنائی راہ سلوك طے کرنے کی تلقین کرتے ہیں ۔ اور تصوف کے اعلیٰ مقامات کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔ موت و حیات اور کفر و ایمان کے روایتی معانی سے بلند و بالا رہنے کی نصیحت کرتے ہیں ۔

ای برادر ، در رہ معنی قدم هشیار زن در صف آزادگان چون دم زنی بیدار زن
گام زن مردانه وار و بگذر از موت و حیات دو کون اندر گذر لبیك محرم وار زن
سالکان اندر ملامت اسب شادی تاختند یك قدم اندر ملامت گر زنی ، بیدار زن

سنائی کے اسلوب کی خصوصیات

۱- ایك جدت پسند شاعر جو نئے سے نئے مضامین پیدا کرنا چاہتا ہے. اپنی ذهنی صلاحیت اور فارسی زبان پر تسلط کی بنا پر اظہار کیلئے نئی نئی صورتیں نکالتا ہے. اس کی ایك صورت یہ ہے کہ وہ الفاظ کو کچھ اس طرح جوڑتا ہے اور ترتیب دیتا ہے. کہ وہ نئی سے نئی تراکیب بن جاتی ہیں ۔ سنائی نے اپنے خلاق ذهن سے عجیب عجیب تراکیب بنائی ہیں جو گوناگون خیالات کو ظاہر کرنے میں مدد دیتی ہیں ۔ مثلاً :

نقشبند عقل و جان ، مهجوران آب و گل ، دیو سرای استخوانی ، چار دیوار عشق ، صادقان گرم رو ، دولتکدۂ چرخ ، خورشید زر افزای ، لب بوسه خواه ، شیر آفرین گلشن روحانیان ، غله دار آز ، طرفداران الهی نهنگ کفر و دین ....

۲- سنائی اکثر مطالب کو مسلسل بیان کرتے ہیں ۔ ان کے ہاں کبھی کبھی دو دو تین ابیات ایك موضوع کے اظہار کیلئے باہم پیوستہ ہوتے ہیں ۔

۳- سنائی اپنے خیال یا فکر کی تائید میں حکایت یا تمثیل لاتے ہیں ۔

۴- سنائی صوفیانہ ، قلندرانہ اصطلاحات استعمال کرتے ہیں ۔ مثلاً : طامات ، خرابات، لباسات ، تلاش ، زند وغیرہ اور خود ہی بعض جگہ ان کی تشریح کرتے ہیں ۔

۵- سنائی بعض کلمات کو تکیہ کلام کی طرح یا خود ساختہ یا خود معنی پیدا کردہ استعمال کرتے ہیں ۔

۶- سنائی نے پند و موعظت کو ایسے سلیس و سادہ اور عام فهم انداز میں پیش کیا ہے کہ پڑھنے والے کے ذہن کو فوراً متأثر کرتا ہے اور یاد رکھنے میں مدد دیتا ہے .مثلاً :

منشین با بدان که صحبت بد گرچه پاکی ترا پلید کند
آفتاب ار چه روشنست او را پاره ای ابر ناپدید کند

۷- سنائی نے اپنے قصاید میں اکثر ردیف لانے کا التزام کیا ہے ۔ اور یہ تسلط زبان کیلئے شاهد عادل ہے ۔

۸- سنائی نے ضرب الامثال اور عوام میں متداول محاورات کو ایسی روانی و دلنشینی سے بیان کیا ہے کہ وہ سنائی کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ علامہ دھخدا کی امثال و حکم میں سولہ سترہ امثال ہونگی جن کے استناد کیلئے سنائی کے اشعار پیش کیے گئے ہیں .مثلاً: آب بہ پستی گراید ، آب و روغن بهم می آمیزد، زیره بکرمان بردن ، خورشید به گل اندودن ، خفته را خفته کی کند بیدار ، آخر چه سئوالست ! خوش باش۔

۹- سنائی کی تشابیہ عام ہیں فطرت سے لی گئی ہیں۔ کہیں کہیں مرکب قریب و بعید ہیں لیکن شگفتہ اور دلپسند ہیں۔ عموماً سنائی کا بیان سادہ ، واضح و صریح ہے۔ زیادہ آرایش و پیرایش سے کام نہیں لیا گیا لیکن صنایع لفظی سے زیادہ کام لیا ہے اور عموماً تجنیس ، قلمی ، مراعات لفظی ، تضاد و طباق و ترصیح کو کام میں لایا گیا ہے۔

۱۰- ڈاکٹر مظاہر مصفا نے بہت سی مثالیں پیش کی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنائی عام دستوری روایات سے انحراف کر جاتے ہیں۔ بعض الفاظ میں حرکت کو ساکن اور ساکن کو متحرک بعض کو تخفیف اور بعض کو حذف کر جاتے ہیں اور بعض کو شدّہ عربی جمع کو ها کے ساتھ جم الجمع بنا لیتے ہیں .تکرار حروف بھی کئی جگہ نظر آتا ہے۔

۱۱- متقدمین میں سے عنصری اور منوچھری خاص طور پر سنائی کے مدنظر رہے ہیں۔ کئی ایسے قصاید ہیں جو انھی کی روش کے مطابق لکھے گئے ہیں۔ معاصرین میں سے سنائی کے قصاید مسعود سعد سلمان ، مختاری ، امیر موسی ، ابوالفرج رونی کے قصاید کے ہم وزن اور ہم طرز نظر آتے ہیں۔

مثنوی سرائی

سنائی کی زیادہ شہرت اس کی مثنویوں کی وجہ سے ہوئی . شیخ عطار اور مولانا روم جیسے شعراء و عرفاء نے ان کو اپنا پیشوا مانا ہے۔ اور اپنی مثنویوں کو بھی ان کی ہیأت و صورت میں مرتب کیا ہے۔ یعنی پہلے ایک موضوع کے متعلق اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ پھر اس کی تائید و تاکید کیلئے عرفاء و بزرگان دین کی حکایات و تماثیل بیان کی ہیں . سنائی کی سب سے زیادہ نامور مثنوی «حدیقة الحقیقة» ہے جو دوسرے شعراء کی سرمشق رہی ہے۔ اس سے کمتر مثنویاں «سیر العباد» اور «طریق التحقیق» ہیں جو عارفانہ مفاہیم و مطالب کیلئے قابل توجہ ہیں۔

مثنوی نگاری کا فن ایک مشکل فن ہے۔ عموماً چھوٹی بحر میں اور کمتر الفاظ میں پوری متانت اور جزالت سے مفہوم کو ادا کرنا پڑتا ھے ، خیال رکھنا پڑتا ہے کہ الفاظ کا در و بست درست اور استوار رہے۔ کہیں جھول نہ آئے اور الفاظ کی تکرار بھی نہ آئے۔

روانی بھی قائم رہے ۔ سنائی نے اپنی مثنویوں میں ان تمام باتوں کا خیال رکھا ہے ۔
سنائی کی مثنویاں ان کے علم و عرفان اور مطالب کی گہرائی و گیرائی کی وجہ سے وزین معلوم ہوتی ہیں ۔

مثنوی حدیقة الحقیقة

سنائی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اصطلاحات تصوف و عرفان اور اقوال مشایخ و عرفاء کو شعری قالب میں ڈھال کر بیان کیا ہے ۔ ان سے پہلے ابو سعید ابو الخیر کی رباعیات میں مسائل تصوف کو جذب و شور سے بیان کیا گیا ہے لیکن سنائی نے ان کو ترتیب و تہذیب سے علمی حیثیت دے کر بیان کیا ہے ۔
مولانا روم بھی اس حقیقت سے واقف تھے :

ترك جوشی کرده ام من نیم خام از حکیم غزنوی بشنو تمام
در الهی نامه گوید شرح این آن حکیم غیب و فخر العارفین

سنائی نے حدیقه میں آیات قرآن کریم ، احادیث نبوی ، مطالب دینی ، اخلاقی و فلسفی و عرفانی اور علوم اسلامی کو کمال مہارت و تسلط سے بیان کیا ہے اور انہیں اپنے ذوق اور طبع سرشار سے آراستہ کرکے پیش کیا ہے که خشك و دقیق معانی دلپذیر ہوگئے ہیں ۔ پھر حکایات و تماثیل سے مطالب کو استدلال سے نتیجه خیز ثابت کیا ہے ۔
علوم اسلامی و عرفانی کی حامل مثنوی کے معارف سمجھے بغیر عطار اور رومی کے اسرار و معارف نہیں سمجھے جاتے ۔ سنائی اپنی مثنوی کی اہمیت اور عظمت کے قائل تھے چنانچه کہتے ہیں :

تا بنا کرده ام چنین شهری مثل این کس ندیده در دهری
زین نکوتر سخن نگوید کس تا بحشر این سخن جهان را بس
آنکه باشد سخن شناس و حکیم همچو قرآن ورا نهد تعظیم

حدیقه کے ابیات کی تعداد مختلف بتائی گئی ہے لیکن اکثریت کا خیال ہے که دس ہزار تھی. اسکے اجزاء متفرق رہے اور بہت سے لوگوں نے انہیں اپنے طور پر مرتب کیا ۔ بعد میں الحاقات /اضافات بھی ہوئے ۔ اور کوئی دو نسخے بالکل یکساں نہیں ملتے ۔ عصر سنائی کے بعض علماء و فقہا نے حدیقه کے مطالب و معانی پر اعتراضات کیے چنانچه سنائی نے منظوم خط کے ساتھ کتاب برهان الدّین ابی الحسن علی بن ناصر الغزنوی معروف به پریان گر کو بغداد میں بھیجی اور ان سے رائے طلب کی ۔ جواب میں امام برهان الدّین نے اسے عقاید و افکار دین کے مطابق قرار دیا ۔
حدیقة الحقیقت ان کی طویل ترین مثنوی ہے جو تقریباً باره ہزار اشعار پر مشتمل

ہے ۔ سنائی کی حقیقی شہرت حدیقه کی وجه سے ہوئی ۔

یه مثنوی مندرجه ذیل دس ابواب پر مشتمل ہے :

۱- تحمید، توحید، معرفت ۔ ۲- فی فضیلت محمّد ۔ ۳- صفت عقل و احوال و افعال او .
۴- فی فضیلت العلم ۔ ۵- فی صفت العشق و العاشق و معشوق ۔۶- فی ذکر النفس الکلی ۔ ۷- فی الغفلة و النسیان . ۸- فی احوال النجوم . ۹- مثل الاحباب و الاعداد.
۱۰- فی حسب حال ۔ مدح سلطان بهرامشاه و وزراء و مشایخ صفت این تصنیف ۔

ان عنوانات سے صحیح معنوں میں مثنوی کے جزوی موضوعات کی تفصیل معلوم نہیں ہوتی ۔ عقل ، علم ، عشق اور نجوم کے علاوہ مندرجه ذیل ضمنی عنوانات اور ان کے تحت مذکور مضامین سے مثنوی کی وسعت معلوم ہوگی۔

خدا - توحید ، ربوبیت ، تقدیس ، تنزیهه ، رزاقیّت ، تسبیح و تهلیل ، قهر و لطف ، واقف ضمائر ، کرم و فضل ، قضا و قدر ۔

تصوف - فقر الی اللّه ، مرید و شیخ ، محبت و تجرید ، سلوك و طریق الآخرة ، توبه و انابت ۔ رضا ، تسلیم ، عرفان نفس ، ترك دنیا ، حب مال و امانی ، حقیقت تصوف ، تفکر و مراقبه ، حقیقت الطریقت ۔

اخلاق - تضرع و خشوع ، توکل ، ایثار و عطیه ، اتحاد و مودت ، زہد، اجتهاد و تقوی، برّالوالدین ، مروت و سخا ، شکر ، ریا ، عجز و سکوت ، جُبن و شجاعت ، حرص ، حکمت و موعظت و نصیحت ، انظار السود ، طمع و حرص، قناعت، کلمة الحق ، بغیر مداهنست ۔

اهل دنیا – اصحاب غفلت، عوام ،جهان،اصحاب الغرور، اهل الارض خاصه و عامه ، اصحاب الحول .

دین - شرایط الصلوة ، قرآن ، یوم قیامت ۔

بادشاہ اور اسکے متعلقات : عدل دامن رعایا ، ظالم و مظلوم ، حفظ اسرار الملوك ، کفایت و رای پادشاهی ، تحمل از رعیت ، حلم پادشاه ، کاردانی پادشاه ، حسن سیرت ، سیاست پادشاه ۔

دنیا - دارالغرور ، حسب الدنیا ، طلب الدنیا ، احتراز الدنیا ، مذمت الدنیا ۔

محمّد ، انبیا و مناقب ابی بکر ، عمر ، عثمان ، علی ، حسن و حسین ، ابو حنیفه ۔

یه کتاب ۵۲۴ اور ۵۳۵ ھ کے درمیان تألیف ہوئی اور سنائی نے اس کتاب کی تعریف میں لکھا ہے :

هر چه دانسته ام ز نوع علوم کرده ام جمله خلق را معلوم
آنچه فص است و آنچه اخبارست وز مشایخ هر آنچه آثارست
اندرین نامه جملگی جمع است مجلس مّمل با یکی شمع است

حدیقه میں مندرجہ بالا موضوعات میں حکیمانہ نکات بیان کیے گئے ہیں ۔ اپنے علم و فضل تجارب زندگی اور دانش و بینش کی بنا پر دین و دنیا کے مسائل پر اظہار کیا گیا ہے ۔

حدیقه میں پھیلے ہوئے سنائی کے چیدہ چیدہ افکار و عقاید کو ہم یہاں درج کرتے ہیں ، جن سے ان کے فکر و نظر پر روشنی پڑے گی اور اس کی اہمیت کا اندازہ ہوگا :

عشق

بنده عشق باش تا برهی از بلاها و زشتی و تبهی
عشق برتر ز عقل و جانست لی مع الله وقت مردانست

عقل

عقل سلطان قادر خوشخوست آنکه سایۀ خدای گوید اوست
سایه با ذات آشنا باشد سایه از ذات کی جدا باشد
عقل برتر ز وهم و حس و قیاس برترست از فلك ستاره شناس
از مصالح مدیر جان اوست بر ممالك دبیر یزدان اوست

دین

طاعت ایزدی بضاعت را سنّت احمدی شفاعت را
فرض الله چون بجای آری عرش الله زیر پای آری
سنت مصطفی چو بگزاری کافر و گبر را نیازاری

نجوم و فال

سخن فال کو ندارد سود باد پیمود کآسمان پیمود
نیست الاّ بقدرت یزدان نیك و بد در طبایع وارکان
بی قضا خلق یك نفس نزند مرد عاقل چنین جرس نزند

صوفی

صوفی آنست که از تمنّی و خواست گشت بیزار و یك رهه برخاست
سه نشانست مرد صوفی را خواه بصری و خواه کوفی را
اوّل آن کو سوال خود نکند بد بود خود سوال بد نکند
دوم آنکه ار کسی ز وی خواهد ما هنر بدهدش که می شاید

نکند باطل آن به من واذی — که بیابد عوض بروز جزا
سوم آن کز جهان شود بیرون — نبود صوفیی ورا افزون
هر چه باید ز کردگار جهان — خواهد و خلق ازو بود باامان
بود از بند جاه و مال آزاد — رخ بسوی جهان بی فریاد

تصوف و سالك

تن فدا کن که در جهان سخن — جان شود زنده چو بمرد تن
دشمن حق تنست خاکش دار — قبلهٔ حق دلست پاکش دار
سوی حق شاهراه نفس و نفس — آینهٔ دل زدودن آمد و پس
آیینهٔ دل ز رنگ و زنگ نفاق — نشود روشن از خلاف و شقاق
صیقل آیینهٔ یقین شما — چیست خالص صفای دین شما

شعر سنائی

از همه شاعران به اصل و فرع — من حکیم بقول صاحب شرع
شعر من شرح شرع و دین باشد — شاعری عقل را چنین باشد
ای سنائی چو شرع دادت بار — دست ازین شاعری و شعر بدار
شعر بر حب طبع و جان سره است — چو بسنت رسید مسخره است
شرع دیدی و شعر دل بگسل — که گدائی نکارد اندر دل

سیر العباد الی المعاد

اس مثنوی کی ساخت ، ترتیب اور موضوعات کی تفصیل اس طرح ہے ۔ پہلے حمد و ثنا سے شروع ہوتی ہے پھر باد کو مخاطب کیاہے او بعد میں روح نامیه کی صفات بیان کی ہیں ۔ نفس کی دو قسمیں بتائی ہیں ۔ نفس انسانی ، و نفس طبیعی اور پھر ان کی صفات کی وضاحت کی ہے ۔ ضمناً عقل مستفاد پر گفتگو کی ہے ۔

اس کے بعد مثنوی میں چار عناصر اور ان کے نتایج و اثرات کی تفصیل بتائی ہے ۔

۱- جوهر خاك اور اس کے نتائج ، بخیل ، کینه و طمع ۔
۲- جوهر آب " " " کسل و غفلت ۔
۳- جوهر هوا " " " شهوت و حرص ۔
۴- جوهر آتش " " " خشم و گیر۔

ان صفات کے ضمن میں ان چاروں کو زحل ، ماه ، اشتری اور آفتاب و بهرام کے زیر اثر بتایا ہے ۔ اس تفصیل کے بعد ارواح ادیان سے ملاقات کی ہے اور ان سے معطله ، طبایعان ، ستاره شناسان ، اهل ظن و پندار ، معجبان اور مرائیان کے احوال و کوائف بیان

کیے ہیں. اس کے بعد شاعر پیر کی خدمت میں حاضر ہو کر سؤالات کرتا ہے او پیر نفس کی عقل کل ، فقراء ، سالکان طریقت تا اهل معرفت ، ارباب توحید کی صفات بتاتا ہے ، آخر میں گریز کے طرز پر محمّد منصور کی تعریف میں طویل قصیدہ لکھا ہے اس مثنوی کی ھیأت میں اسے بلند پایہ القاب سے یاد کیا ہے ۔

واعظ عقل و حافظ تنزیل محرم عشق و محرم تاویل
خیل طالوت را سکینۂ حلم امت نوح را سفینۂ علم
قابل تابش نبوت اوست لوح محفوظ شرع و سنت اوست

طریق التحقیق

یہ مثنوی ۵۲۸ ھ میں منظوم ہوئی ۔ یہ مثنوی کسی امیر وزیر یا بادشاہ سے منسوب نہیں ۔ سنائی نے کہا ہے کوئی صاحبدل نہیں جس کو یہ پیش کروں ۔

اس مثنوی میں تجرید و انزوا پر زیادہ زور دیا ہے ۔ شکایت روزگار زیادہ ہے ۔ وہ نااھلوں کی صحبت سے بیزار ہیں اور کسی ھمدم اور شایستہ صحبت کو نہیں جانتے ۔ وہ اس مثنوی پر فخر کرتے ہیں اور اسے تحفہ ربانی اور اسرار روحانی کہتے ہیں ۔ اس میں سلوك و عرفان کے تمام مراتب بیان کیے ہیں اور اخلاق عالی اپنانے کی تلقین کی ہے .شروع میں حمد باری اور آخر میں نکوھش ستمگاران پر اظہار خیال کیا ہے ۔ طریق التحقیق بھی بہترین ادبی و عرفانی مثنوی شمار ہوتی ہے لیکن حدیقہ جیسی شہرت نہیں ملی ۔

عشقنامه

اس مثنوی میں پہلے عشق کی تعریف کی ہے :

عشق مرغ نشیمن قدم است قوت او گه وجود و گه عدم است

بعد میں عشق اور روح کا ارتباط و امتزاج بتایا ہے . پھر عشق کے قدیم یا حادث ہونے کی بحث کی ہے اور غیب و شھود ، شھود عشق اور اطوار عشق کی تفصیل بتائی ہے . دوسرے موضوعات میں غیرت عشق ، ھمت عشق ، ادراك علم از عشق اور وصل و فصل شامل ہیں ۔ حصول عشق کی شرط یہ لگائی ہے ۔

ھر کہ فارغ ز ھر دو عالم نیست عشقبازی ورا مسلم نیست

ھمت عشق کے بارے میں کہتے ہیں :

عشق را ھمتیست بس عالی از دنائت مجرد و خالی

ادراك علم کے متعلق ان کا خیال ہے :

عشق را جز بہ عشق نتوان یافت علم زو آگھی بہ ایمان یافت

تا بود علم و اثبات و مجال قرب معشوق و عاشق است محال

عقلنامه

مثنوی حمد و ثنا سے شروع ہوتی ہے ۔ پھر توحید کے بعد علم کلام کے بعض مسائل مثلاً استواء ، نزول پر گفتگو کرکے تصوف اور آداب پیری و مریدی بیان کیے ہیں ۔ بعد میں اصطلاحات صوفیہ مثلاً خرابات ، خانقاہ وغیرہ کی توضیح کی ہے ۔ آخر میں خوف قیامت ، دوزخ ، اجنه ، خوف مرگ اور ناپایداری زندگی پر اظہار خیال کیا ہے ۔

مثنوی تقریباً ۵۵۰ ابیات پر مشتمل ہے ۔ سنائی اس مثنوی کو مجمع علوم دنیا و آخرت کہتے ہیں اور اسے کیمیائے سعادت اور احیاء علوم الغزالی کے برابر سمجھتے ہیں ، اس مثنوی میں کسی امیر وزیر کی تعریف نہیں کی اور کہا ہے کہ برے آدمی کی تعریف نہیں کرنی چاہیے ۔

ستاینده را که بد باشد مدح مخلوق ذم خود باشد

در همه کار یاری از حق خواه دست ازین ناکسان بکن کوتاه

کارنامۂ بلخ

یہ مثنوی بلخ کا کارنامہ تو دکھائی نہیں دیتی ۔ ممکن ہے اہل بلخ سے بیزاری ہوگئی ہو . کیونکہ تمہید کے آخر میں اشعار میں ہی غزنین کی تعریف شروع کر دی ہے ۔

خاک غزنین رفیع تر ملکیست عرش و غزنین به نقش هر دو یکیست .

غزنین کے بعد خاندان محمودی ، شاہزادگان اور لشکریوں کی تعریف میں اشعار لکھے ہیں .اس کے بعد بعض امراء ، قضاۃ ، علماء کے مناقب بیان کیے ہیں .مثلاً ثقة الملك ، امام یوسف حداد ، قاضی لطیف اور عبدالحی بلخی ۔ زیادہ حصّہ شعراء کے تعارف اور ان کی ادبی خصوصیات سے متعلق ہے ۔ شعراء میں محمّد رختوی، مختاری ، خواجه موید ، سید شرف الدّین ، اسمعیل خجستگی صابونی وغیرہ ۔ سنائی نے اس مثنوی میں بعض گروہوں کی مذمت و ملامت کی ہے ۔ ممکن ہے یہ لوگ اہل بلخ ہوں ۔ مثلاً مثالب باحیان ، شہاب درعیان ، مثالب علمای سود.

نثری ادب

کلیہ و دمنۂ بہرامشاہی

اس کتاب کو پہلے سنسکرت سے پہلوی زبان میں منتقل کیا گیا اس کے بعد اس کا عبداللّٰہ بن مقفع نے عربی زبان میں ترجمہ کیا پھر نصر بن احمد سامانی کے حکم سے یہ

کتاب پہلی دفعہ عربی سے نثر دری میں ترجمہ ہوئی بعد ازاں رودکی نے اسے فارسی نظم کا جامہ پہنایا۔ پھر چھٹی صدی هجری کے شروع میں ایك بار پھر اسے بلیغ فارسی نثر میں ترتیب دیا گیا۔ یہ ترجمہ ابوالمعالی نصر اللّٰہ بن محمّد بن عبدالحمید کے ہاتھوں انجام پایا جو بعض روایات کے مطابق شیراز اور بعض کے خیال میں غزنی کا باشندہ تھا۔ ابو المعالی بھرامشاہ کے زمانے (۵۱۲ ھ - ۵۴۷ ھ) میں دربار غزنی سے وابستہ ہوا اور علم و فضل کی بدولت دربار میں شہرت حاصل کی۔ کتاب کی تألیف کا زمانہ ۵۱۲- ۵۴۷ ھ کے درمیان ہے۔ نصر اللّٰہ نے اس کتاب کو بھرامشاہ کے نام معنون کیا اس کے مؤلف ابوالمعالی نے ۵۵۵ ھ کے لگ بھگ وفات پائی۔

کلیلہ و دمنہ کے مقدمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب ہندوستانی راجاؤں کے خزانوں میں رکھی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے ایك قدیمی راجا کے بیٹے تعلیم سے سخت گریزاں تھے۔ بالآخر اس زمانے کے ایك مشہور ادیب نے یہ دعوی کیا کہ وہ راج کماروں کو تعلیم دے سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے جانوروں کی زبان میں ایك ایسی کتاب لکھی جس میں تمام سیاسی اور معاشرتی مسائل باتوں ہی باتوں میں زیر بحث آگئے۔ اس کا نام «کرتك و دمنك» رکھا۔ پھر اس کا نام « پنچ تنتر » ہوگیا اس کا مصنّف ویشنو شرما ہے۔

نوشیروان عادل کے زمانے میں ایك طبیب برزویہ بادشاہ کے حکم سے یہ کتاب ہندوستان سے نقل کرکے لایا، پھر برزویہ کی درخواست پر حکیم بزرجمہر نے باب برزویہ کے نام سے ایك باب لکھ کر اس میں شامل کیا۔ جب پہلوی میں اس کا ترجمہ ہوا تو اس کا نام کلیاك و دمنك پکارا جانے لگا۔ عربی میں ترجمہ ہونے کے بعد یہ «کلیلہ و دمنہ» کے نام سے موسوم ہوئی۔ دنیا میں بہت کم ایسی کتابیں ہیں .جنہیں کلیلہ و دمنہ کی طرح ہر دلعزیزی حاصل ہوئی یا جو اس قدر کثیر تعداد زبانوں میں ترجمہ کی گئی ہیں۔ یہ کتاب «بھرام شاہی» کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس کتاب کو حکایات «بیدپا» کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کتاب کا یونانی، عمرانی، لاطینی، اندلسی، اطالوی، ترکی، جرمنی، انگریزی، ڈنمارکی، ہالینڈی اور فرانسی زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا۔ اس کا بہترین ترجمہ نویں صدی ہجری میں ملاّ حسین واعظ کاشفی نے کیا تھا۔ اور وہ «انوار سہیلی» کے نام سے مشہور ہے۔ اسی ترجمہ سے ایك تیسرا فارسی ترجمہ خلاصہ وجود میں آیا، جو «عیار دانش» کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسے ابو الفضل نے اکبر کیلئے لکھا تھا۔ ترکی ترجمہ کا نام ہمایوں نامہ ہے، جسے علی چلپی نے سلطان سلیمان اوّل کیلئے کیا تھا۔ یہ دونوں تراجم سولہویں صدی عیسوی میں ظاہر ہوئے۔ یہ کتاب بادشاہوں کی مونس، علماء کی منظور نظر اور عوام کی انیس و رہنما رہی ہے اور آٹھ سو

سال کے طویل عرصہ گزرنے کے بعد آج بھی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے ۔

أسلوب نگارش

سرسری جائزہ لینے پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کلیلہ و دمنہ میں خارجی حسن پیدا کرنے کے لیے صنایع بدائع کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں شاعرانہ صنائع مثلا طباق ، مراعاۃ النظیر ، اضداد ، جمع و تفریق ، سیاقۃ الاعداد ، تنسیق الصفات ، مجاز مرسل ، تشبیہہ ، استعارہ، اور طرد العکس قافیہ اور سجع کلیلہ و دمنہ کے صفحوں پر جا بجا نظر آتے ہیں لیکن یہ صنایع کچھ اتنی مہارت سے استعمال کئے گئے ہیں کہ نہ عبارت کی موزونی میں فرق آتا ہے نہ معانی میں کوئی الجھن پیدا ہوتی ہے ۔ فی الحقیقت کلیلہ و دمنہ بہرام شاہی ، سلاستِ انشا ، عبارات کی قوت تراکیب حسنِ اسلوب اور آرایش کلام کے لحاظ سے فارسی نثر کا اعلی ترین نمونہ ہے ۔ اور اسے فارسی کی پُرتکلف نثر کے اوّلین کارناموں میں شمار کیا جا سکتا ہے ۔ ابو المعالی نے چند مقامات کے سوا کہیں بھی کامل طور پر مسجّع عبارت کا استعمال نہیں کیا ۔ لیکن درج ذیل قیود کی پابندی کے باعث اس کی کتاب پُر تکلف فارسی نثر کے اوّلین نمونوں میں شمار ہوتی ہے ۔

(۱) جملے کے اجزا و عبارات میں توازن قائم رکھنا ۔

(۲) سجع ناقص کا استعمال ۔

(۳) مترادف و متوازن کلمات کا استعمال ۔

(۴) آیات و امثال اور عربی و فارسی اشعار سے استشہاد وغیرہ ۔

تمام کتاب میں کہیں بھی اس نے لوازماتِ فصاحت و بلاغت کو نظر انداز نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ اس کی طرز تحریر چھٹی صدی ھجری سے ہی انشا پردازوں کیلئے قابل تقلید نمونہ کا کام دیتی رہی ہے ۔

بخش چهارم :

سلجوقی دورِ میں فارسی ادب کا جائزہ

مرکز ایران میں سلاجقہ کی حکومت ۴۲۹-۵۵۲ ھ تك قائم رہی ۔ ان سلاجقہ بزرگوں کے نام یہ ہیں ۔ طغرل ، الپ ارسلان ،ملك شاہ اور سلطان سنجر ۔ ان کے علاوہ کرمان ، عراق ، روم اور سوریہ میں بھی ۶۹۱ ھ تك سلجوق حکمران رہے ۔ اسی عرصے میں ایران کے مختلف نواحی میں غوریہ ، خوارزمشاھیہ ، شروانشاہ (آذر بائیجان) کے سلاطین کی حکومتیں قائم تھیں اور ان کے درباروں سے بھی علماء و شعراء وابستہ تھے ۔ دور سلاجقہ کے ادب کا جائزہ لیتے وقت معاصر شعراء و مصنفین کا بھی ذکر آئے گا ۔

شاعری

شاعری کے نقطہ نظر سے اس دور کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ پہلے حصے میں وہ شعراء آتے ہیں ۔ جو سبك خراسانی یعنی سامانی اور غزنوی دور کے شعراء سے متأثر تھے اور انہی کی روش کا اتباع کرتے تھے ۔ ان میں اسعد گرگانی ، ازرقی ہروی (م - ۴۶۵ ھ) ، علی اسدی طوسی(م- ۴۶۵ ھ) ،عطا بن یعقوب (م- ۴۰۱ ھ) ، قطران تبریزی ، ناصر خسرو (م - ۴۸۱ ھ) ، عمعق بخارائی (م -۵۴۳ ھ) ، عثمان مختاری غزنوی (م - ۵۴۴ ھ) ، صابر ترمذی (م- ۵۶۳ ھ) ، رشید اللّٰہ محمّد وطواط (م - ۵۷۳ ھ) ، محمّد سوزنی سمرقندی (م - ۵۶۳ ھ) ۔

ان کے بعد ایسے شعراء ظہور پذیر ہوئے جنھوں نے نئے اسلوب کی بنیاد رکھی اور سبك خراسانی سے ہٹ کر سبك عراقی میں داخل ہوئے ۔ قصیدہ گو شعراء میں اوحد الدّین انوری، اثیر الدّین اخسیکتی، افضل الدّین بدیل خاقانی(م - ۵۹۵ ھ) فلکی شیروانی ، ظہیر الدّین فاریابی ، امیر معزی نامور ہیں ۔ مثنوی سراؤں میں نظامی گنجوی اس اسلوب کے سربرآوردہ نمایندہ ہیں ۔ ان شعراء کے اسلوب کی خصوصیات مندرجہ ذیل نظر آتی ہیں ۔

۱- طب، نجوم ، ہیأت ، ریاضی ، فقہ ، تفسیر اور دیگر قرآنی علوم کی اصطلاحات استعمال کی ہیں ۔ ۲- عربی الفاظ کی کثرت ۔۳- عربی ادب کا اثر و نفوذ. ۴- اپنے عملی فضایل پر فخر و مباہات ۔ ۵- گردش روزگار اور بخت برگشتہ کا شکوہ ۔ ۶- مشکل الفاظ ، دشوار قوافی اور ردیف کا استعمال ۔ ۷- صنایع لفظی و معنوی ۔
اس دور میں عشقیہ ، رزمیہ اور اخلاقی مثنوی نگاری کو عروج حاصل ہوا. نظامی گنجوی کی پانچ مثنویاں : «مخزن الاسرار »، «لیلی و مجنون »، «شیریں و فرہاد» ،

«هفت پیکر» اور «سکندر نامه» اپنے موضوع اور فنی پختگی کی وجہ سے متأخرین کے لیے بے مثال نمونہ بنی رہیں . اور بڑے بڑے با کمال شعراء نے ان کی تقلید میں لکھنا کمال افتخار سمجھا ۔ اسعد گرگانی کی «ویس و رامین» ، عطا بن یعقوب کی «برزویه نامه» اور ناصر خسرو کی« سعادت نامه» و «روشنائی نامه» اپنے اسماعیلی معتقدات کی وجہ سے قابل ذکر ہیں . عثمان مختاری غزنوی کی مثنوی «شهریار» رزمیه مثنویوں میں شمار ہوتی ہے ۔ خاقانی کی«تحفة العراقین» گویا زیارت حرمین کا حاصل اور ایك قسم کا سفر نامه ہے ۔

دور سلاجقه میں رباعی گوئی کو بھی ایك مقام ملا . عمر خیام ، بابا طاہر ، ابو سعید ابو الخیر اور عبدالله انصاری ، اس دور میں نمایاں رباعی گو ابھرے . خیام نے انسان اور کائنات کا عبرتناك انجام یاد دلا کر فلسفۂ نشاط کو فروغ دیا ۔ ابو سعید ابوالخیر اور دوسروں نے رباعی میں تصوف و عرفان کے مضامین داخل کرکے ان کو جذب و شور سے بیان کیا ۔

نثر

اس دور کی نثر میں بھی ایك گونه تغیر رونما ہوا . لیکن شاعری کی طرح اس دور کے پہلے حصے میں سامانی و غزنوی دور کی نثری روش جاری رہی اور عموماً ساده ، روان اور واضح طرز کو اپنایا گیا اس طرز انشاء سے متعلق مندرجه ذیل کتابوں کے نام لیے جا سکتے ہیں :

« سیر الملوك یا سیاست نامه » از نظام الملك طوسی. «سفر نامه »، «زاد المسافرین» اور «وجه دین» از ناصر خسرو. «کیمیای سعادت» از محمّد غزالی طوسی(م - ۵۰۵ هـ) ، «اسرار التوحید فی مقامات الشیخ ابی سعید » از محمّد بن منور.

دوسری قسم کی نثر کو پر تکلف اور مصنوع کہا جاتا ہے اس کی خصوصیات حسب ذیل ہیں :

اصطلاحات علمی و فلسفی کا اضافه . اشعار و ضرب المثلہاے عربی کا استعمال . مشکل الفاظ،مترادفات اور متجانس کلمات کا استعمال ۔ طویل جملے ۔ صنایع لفظی و معنوی سے آرایش ۔ مسجع و مقفی عبارات کا اہتمام ۔

اس نوع اسلوب کی حامل تألیفات حسب ذیل ہیں .

«مقامات حمیدی» از قاضی حمید الدّین عمر بلخی (م - ۵۵۹ هـ). «عتبة الکتبه» از منتخب الدین بدیع جوینی . «التوسل الی الترسل » از بهاء الدّین محمّد بغدادی . «عقد العلی للموقت الاعلی » ، «بدایع الازمان» از حمید الدّین ابو حامد کرمانی .

«مرزبان نامه» از سعد الدّین دراروینی ۔ «ترجمه تاریخ یمینی» از ابو اشرف ناصح ۔ «کلیله و دمنه بهرامشاهی» از ابو المعالی نصر اللّه ۔

بعضی ایسی تألیفات بھی نظر آتی ہیں ۔ جو سادہ و مصنوع کا امتزاج لیے ہوئے ہیں مثلاً «چہار مقالہ » عروضی سمرقندی ،«تاریخ طبرستان» از بھاء الدّین محمّد اسفند یار ، «راحة الصدور» از ابوبکر محمّد الراوندی ۔

اسِ دور میں ریاضی، طب ، نجوم ، لغت اور ادبی علوم پر بھی کتابیں لکھی گئیں، جن میں سے مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں :

دوا شناسی پر «ذخیرۂ خوارزمشاھی» از اسماعیل بن حسن جرجانی ،«جوامع العلوم» از فخز الدّین محمّد رازی ، «گیہان شناخت » از حسن قطان مروزی ، «ترجمان البلاغت» از محمّد بن عمر رادویانی ، «حدائق السحر» از رشید الدّین وطواط ، «تفسیر روض الجنان» از ابو الفتوح حسین رازی وغیرہ ۔

بابا طاہر عُریاں

تاریخ ادبیات میں یہی تین لفظ ہیں جو ان کی شخصیت کو متعارف کراتے ہیں ۔ « بابا » سے ظاہر ہے کہ وہ بڑی عمر کو پہچ چکے تھے کہ مشہور ہوئے ۔ «طاہر» نام تھا ۔ مکمل نام معلوم نہیں ۔ نہ اس کے اب و جد کا کچھ علم ہے ۔ «عریان» اسے تخلص کہیے یا لقب ۔ قیاس ہے کہ ظاہری لباس سے بے پروا ہونگے اور صرف ستر ڈھانپتے ہونگے یا یہ کہ وہ دل کی باتیں کہنے میں بے باك ہونگے اور لگی لپٹی رکھے بغیر اعلانیہ کہتے ہونگے ۔ ان تین لفظوں کے علاوہ ان کی زندگی کا ایك واقعہ محفوظ رہ گیا ہے ۔ راحت الصدور و آیة السرور مؤلفه محمّد بن علی الراوندی میں ۴۴۷ ھ کے ضمن میں ثابت کیا ہے کہ سلطان طغرل بیگ سلجوقی(۴۲۹-۴۵۵ ھ) همدان سے گزرا تو بابا طاہر ، بابا جعفر اور شیخ خمشه کو پہاڑی پر دیکھا تو گھوڑے سے اتر کر ان کی دست بوسی کی بابا طاہر کو زیادہ آشفته حال پایا ۔ بابا طاہر نے کہا: «ای ترك با خلق خدا چه خواهی کرد ۔ سلطان نے کہا : آنچه تو فرمائی . بابا نے کہا : انَّ اللّٰهَ یَامُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسان . سلطان رو دیا ۔ بابا نے لوٹے کی ٹونٹی اس کی انگلی میں ڈال دی اور کہا: مملکت عالم چنین در دست تو کردم . بر عدل باش» ۔ بادشاہ جب جنگ پر جاتا تو ٹونٹی کو انگلی میں پہن لیتا ۔

یه یقین ہے کہ بابا طاہر دینی و عرفانی علوم میں گہرا درك رکھتے تھے اس کا ثبوت

ان کے وہ کلمات قصار (عربی) ہیں ۔ جو وحید دستگردی نے دیوان بابا طاہر کے آخر میں شایع کر دئیے ہیں یہ کلمات حکیمانہ و عارفانہ نکات ہیں ۔ جنہیں جوامع الکلم کہنا چاہیے چونکہ یہ دقیق و عمیق مطالب کے حامل ہیں ۔ اس لیے ان کی تشریح و توضیح کیلئے عربی و فارسی شروح بھی لکھی گئیں ۔

بابا طاہر همدان میں فوت ہوئے .رضا قلی هدایت نے لکھا ہے کہ بابا طاہر دیلمیوں کے عہد میں زندہ تھا ۔ مجمع الفصحاء میں اس کا سال وفات ۴۰۱ ھ اور ریاض العارفین میں ۴۱۰ لکھا ہے جو صحیح نہیں کیونکہ سلطان طغرل بیگ ۴۲۹ ھ کے بعد ہی همدان گیا ہوگا .

رُباعیات

بابا طاہر کی شہرت اسکی رباعیات کی وجہ سے ہوئی ہے ۔ ۱۸۸۵ میں ہوارٹ کی کوشش سے ایك غزل اور اُنسٹھ رباعیاں منظر عام پر آئیں ۔ پھر هیرن ایلن (Herin Alen) نے انگریزی ترجمہ کے ساتھ تین رباعیوں کا اضافہ کیا لیکن یہ رباعیاں الحاقی ہیں ۔ لیزنسکی(Leszeynski) نے جرمن مخطوطات استعمال کرکے ۲۸ رباعیوں اور غزل کا ترجمہ کیا لیکن یہ غزل Huart کی غزل سے مختلف تھی ۔ ۱۹۲۷م میں وحید دستگردی نے ۲۹۶ رباعیوں ، چار غزلوں اور کلمات قصار پر مشتمل دیوان بابا طاہر شایع کیا .لیکن انہوں نے اپنے مآخذ نسخے کا ذکر نہیں کیا اس لیے ان کے مستند ہونے سے متعلق تحقیق کی ضرورت ہے کیونکہ عوامی زبان کی چاشنی کے ساتھ ایسی رباعیاں کہی جا سکتی ہیں ۔

رُباعی یا دو بیتی

علم عروض کے محققین نے رُباعی کے چوبیس اوزان مقرر کیے ہیں بارہ بحر هزج اخرب ہیں اور بارہ بحر هزج اخرم کے ۔ بابا طاہر کی رُباعیاں ان متعینہ بحروں میں نہیں ہیں.اس لیے قاعدہ کے مطابق انہیں رُباعی نہیں کہا جا سکتا ۔ چونکہ یہ رباعیاں چار مصرعوں پر مشتمل ہیں . اور رباعی کی هیأت کے مطابق پہلا ، دوسرا ، اور چوتھا مصرعہ هم قافیہ بھی ہے اس لیے انہیں بھی رباعی کہا گیا وحید دستگردی نے رباعی کے بجائے اسے دوبیتی کا نام دیا ہے ۔ اور یہی صحیح ہے بابا طاہر کی دو بیتیوں کا وزن بحر هزج مسدس محذوف یعنی مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہے ۔

زبان دوبیتی

دوبیتیوں کی زبان کو لُرہ زبان کہا گیا ہے ۔ آتشکدہ آذر میں اسے راجی کہا گیا ہے بعض کلمات گورانی زبان میں پائے جاتے ہیں ۔ شاطر بیگ شاعر نے اسے کردی (پہلوی) کہا

ہے ۔ بابا چونکه همدان میں مقیم تھے لرستان (خرم آباد) کے قریب تھے وہاں آمد و رفت ہوگی اس لیے ممکن ہے که ان کی زبان کو اپنا لیا ہو ۔ پروفیسر مجتبی مینوی نے کتابخانه هائے استنبول سے دو بیتیوں کے نمونے نقل کرکے ارسال کیے تھے وہ ذبیح اللہ صفا نے تاریخ ادبیات در ایران ، جلد دوم میں انهی کے دستخطوں میں عکسی نقل شایع کر دی ہے ان کی زبان موجودہ دو بیتیوں سے کافی مختلف ہے معلوم ہوتاہے اصل دوبیتیاں لوگوں کی زبانوں میں آتی آتی عامیانه محاورے کے قریب آگئی ہیں ۔ اور فهلویات میں کہے گئے ابیات کی زبان بھی دو بیتیوں کی زبان کے مماثل ہے ۔

تجزیۂ افکار و مطالب

بابا طاہر نے اپنے اشعار میں اپنی حالت و کیفیت کا اظہار کیا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے انہوں نے فقیرانه اور قلندرانه زندگی اختیار کر رکھی تھی اس کا نقشه پیش کیا ہے ۔ راہِ سلوك پر چلنے اور محبوب حقیقی تك پہچنے کیلئے جو تکالیف اور اذیتیں اٹھانا پڑتی ہیں بابا طاہر نے اپنے کلام میں ان کا نمونه پیش کیا ہے ۔

مو آن رندم که نامم بی قلندر   نه خون دیدم نه نون دیدم نه لنگر
چو روز آیو بگردم گرد گیتی   چو شو گرده به خشتی وانهم سر

مندرجه بالا بابا طاہر کی بیرونی کیفیت تھی ۔ اندرونی کیفیت یه تھی که وہ آتش عشق میں جل رہے تھے آنکھوں سے آنسو بہه رہے تھے اور دل فراق یار میں جھلس رہا تھا ۔ اس کی کیفیت دیکھیے ۔

دلم از دست عشقت گیژہ ویژہ   مژہ برهم زنم سیلابه خیژہ
دل عاشق دریان چوب تر بی   سری شورہ سری خونابه ریژہ

اکثر دو بیتیاں ایسی ہیں جن میں مخاطب محبوب حجازی و محبوب حقیقی ہو سکتا ہے بعض تو واضح ہیں که ان کا مخاطب خدا ہے مثلاً :

خداوندا که بوشم با که بوشم   مژہ پر اشك خونین با که بوشم
همم کز در برانن سوته آیم   تو که از در برانی وا که بوشم

دوسرا نمونه یه ہے :

دو زلفونت بود تار ربابم   چه میخواهی ازین حال خرابم
ته که با مو سر یاری نداری   چرا هر نیمه شو آئی بخوابم

تیسرا رخ یه ہے که خود کو تو کہه کر مخاطب کیا ہے یا ایك غافل مسلمان کو مخاطب کیا ہے ۔ مثلاً :

ته که ناخوانده ای علم سموات   ته که نکردہ ای رہ در خرابات

تہ کہ سود و زیان خود ندانی بیارون کہ رسی ھیھات ھیھات

سالك طریقت کیلئے قرب خداوندی کے راستے میں بیرونی اور اندرونی حواس مانع ہوتے ہیں تبھی مولانا روم نے کہا ہے :

چشم بند و گوش بند و لب بہ بند گر نہ بینی نور حق بر من بخند

باباطاہر کی راہ بیرونی اور اندرونی موانع میں سے چشم و دل آڑے آتے ہیں ۔ آنکھ بیرونی جاہ و حشم اور حسن و جمال دیکھتی ہے ۔ اور دل اثر قبول کرتا ہے اور حرص و ہوس اور خواہش و تمنا میں پڑ جاتا ہے اور خداوند تعالی سے دور ہوتا جاتا ہے بابا ان دیدہ و دل کے ہاتھوں نالاں ہیں. اور چاہتے ہیں کہ بس چلے تو ان کو تباہ کر دیں ۔

ز دست دیدہ و دل ھر دو فریاد ھر آنچہ دیدہ بیند دل کند یاد

بسازم خنجری نیشہ ز پولاد زنم بر دیدہ تا دل گردد آزاد

سالك ایك ایسے مقام پر پہچتا ہے کہ اس کے اور محبوب کے درمیان دوری و دوئی ختم ہوجاتی ہے اور وہ استغراق و فنا کی کیفیت میں محبوب میں جذب و فنا ہو جاتا ہے باباطاہر نے ایك ایسی دو بیتی میں اسی قسم کی کیفیت کا اظہار کیا ہے ۔

اگر دل دلبر و دلبر کدام است و گر دلبر دل و دل را چہ نام است

دل و دلبر بھم آمیتہ وینم ندونم دل کہ دلبر کدام است

عمر خیام کی رباعیات میں فکر کا ایك عنصر یہ ہے کہ وہ سوچتا ہے کہ حسین مر جاتاہے مٹی میں مل جاتا ہے اسکے خوبصورت اعضاء پودوں پھولوں کی شکل میں مٹی سے پھوٹتے ہیں اور یہ زندگی کا عبرتناك انجام پیش کرتے ہیں اس لیے انسان کو زمین پر احتیاط سے قدم رکھنا چاہیے کہ اس کے نیچے حسین و متکبر دفن ہیں ۔ اس قسم کا خیال باباطاہر کی دو بیتیوں میں بھی نمایاں ہیں :

بہار آیو بھر شاخی گلی بی بھر باغی ھزاران بلبلی بی

بھر مرزی نیارم پا نھادن مبادانہ مو بتر سوتہ دلی بی

کچھ دو بیتیاں ایسی ہیں ۔ جن میں براہ راست خدا کو مخاطب کرکے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کی ہے اور اپنی بے کسی اور بے بسی کی طرف اشارہ کیا ہے اور آخرت میں ندامت کا اظہار کیا ہے مثلاً :

مو از قالو بلی تشویش دیدم گنہ از برگ و بارون بیش دیدم

چو فردا نامہ خونان نامہ خونند مو از خجلت سری در پیش دیدم

اسلوب بیان

باباطاھر کا دل درد آشنا ہے ۔ اس لیے اس کی باتوں میں بھی درد و اخلاص بھرا ہے اس

کے کلام میں سوز بھی ہے اور گداز بھی چونکہ اس کا جذبہ سچا ہے اور وہ ان واردات و کیفیات سے گزرا ہے جس کا اظہار چاھتا ہے اس نے بعض تجربات کو ایسی مثالوں سے بیان کیا ہے کہ پڑھ کر دل شگفتہ ہوتا ہے ۔ مثلاً :

نسیمی کز بُن آن کاکل آیو   مرا خوشتر ز بوی سنبل آیو
به شو گیرم خیالش را در آغوش   سحر از بسترم بوی گل آیو

بعض نازك خیالات اور کیفیات کو مثالیہ انداز میں سمجھایا ہے یہ تمثیلی انداز بعد میں سبك هندی کا امتیازی عنصر رہا ہے اور بڑے حکیمانہ مشاهدات اس میں قلمبند ہوئے ۔ بابا جی کی مثالیں دیکھیے :

ز چه خال رخت ذوئی سیاهه   هر آن نزدیك خور بی سوته تربی

دل عاشق مثال چوب تربی   سری شوره سری خوننابه ریژه

بسوجم تا بسو جونم دلت را   در آتش چوب تر تنها نسوجه

ابو سعید ابو الخیر(۱)

ابو سعید فضل اللّٰه محمّد بن ابوالخیر ، ابیورد اور سرخس کے درمیان واقع مقام میهنه میں ۳۵۷ ھ کو پیدا ہوئے . ان کے والد دوا فروش تھے ۔ ابتدائی تعلیم کے بعد روحانی تربیت کیلئے وہ ابوالقاسم بشر یاسین کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ ابو سعید بعد میں اپنے مواعظ میں انہی کے اشعار سنایا کرتے تھے ۔ شافعی فقه کی تعلیم مرو میں ابو عبداللّٰه الحصری اور ابوبکر القفال سے حاصل کی ۔ بعد میں تفسیر قرآن اور حدیث کی تعلیم سرخس میں ابو علی طاہر سے حاصل کی ۔ سرخس میں ہی صوفی ابوالفضل محمد بن حسن کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے ۔ ان کی ہدایت پر صوفی السّلمی سے خرقۂ بیعت حاصل کیا . کچھ عرصه آمل میں ابو العباس قصاب کی صحبت میں رہے ۔ پھر میهنه لوٹ آئے اور عبادت و ریاضت میں مشغول رہنے لگے ۔ کم کھاتے ، کم بات کرتے اور کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے کہ خلل واقع نہ ہو ۔ وہ مہینوں پہاڑوں اور صحراؤں میں گزارتے ۔ وہ

۱- تفصیل کے لئے دیکھئے : حالات و سخنان شیخ ابی سعید بن ابی الخیر ، محمّد بن ابی روح لطف اللّٰه ، تهران - اسرار التوحید فی مقامات شیخ ابی محمّد ، تهران ، ۱۳۳۴ ھ ش ، ابو سعید نامه ، محمّد دامادی ، تهران ، ۱۳۶۷ ھ ش ۔

شرعی احکام کی پابندی اور اسوۂ حسنہ کی پیروی کرتے ۔ چالیس سال کی عمر تک ان کی یہ روش رہی ۔

وہ مساکین کیلئے خدمات بجا لاتے ۔ ان کیلئے بھیک مانگتے ۔ مسجدوں میں جھاڑو دیتے ۔ بیت الخلاؤں کو صاف کرتے ۔ نیشاپور میں ایک سال ابو علی الطرسوسی کی خانقاہ میں گزرا۔ اس کے بعد وہ اپنے بیٹے ابو طاہر کے ہمراہ حج کو جانا چاہتے تھے ۔ لیکن ابو الحسن خرقانی نے روک دیا ۔ بعد میں وہ بسطام گئے اور با یزید کے مزار پر حاضر ہوئے ۔ پھر دامغان اور ری ہوتے ہوئے میہنہ آگئے ۔

انہوں نے وعظ و تلقین شروع کی ۔ انہیں کشف قلوب کا ملکہ حاصل ہوا ۔ اس سے انہیں بہت عزت و شہرت حاصل ہوئی ۔

ابو سعید نہایت حلیم الطبع ، نرم دل اور ہمدرد تھے اور خلایق کے ساتھ شفقت سے پیش آتے تھے ۔ وہ فراست سے دلوں کا حال پڑھ لیتے ۔ اس لئے وہ خطاکاروں کی اصلاح کرنے میں معاون بنتے اور لوگوں کو معاف کر دیتے ۔

وہ لمبی عمر پا کر ۴ شعبان ۴۴۵ ھ کو فوت ہوئے ۔

رباعیات ابو سعید ابو الخیر

ایتھے نے مختلف تذکروں سے جمع کرکے ۹۲ رباعیات پر مشتمل ایک مجموعہ شایع کیا ۔ نکلسن نے اس شبہ کا اظہار کیا تھا کہ مطبوعہ رباعیات ابو سعید کی اپنی نہیں بلکہ دوسروں کی ہیں ۔ حالات و سخنان ابی سعید ابی الخیر مؤلفہ محمّد بن ابو روح لطف اللہ میں صرف دو رباعیات مذکور ہیں ۔ ابو سعید کے پوتے محمّد بن منور نے اسرار التوحید میں لکھا ہے ۔ کہ اس کے دادا شعر نہیں کہتے تھے ۔ اس نے صرف ایک رباعی اور ایک فرد ان کی تصنیف بتایا ہے ۔ ابو سعید کے شاعر ہونے کی ایک شہادت ان کے قریب العصر صوفی عین القضاۃ ہمدانی کی ہے جس نے اپنی کتاب تمہیدات میں تین اشعار نقل کیے ہیں ۔ لاہور کی مطبوعہ رباعیات کی تعداد ۴۴۵ ہے ۔ ان میں سے کچھ رباعیاں دیوان جامی میں ملتی ہیں ۔ تین رباعیاں ایسی ہیں ۔ جن میں اھل تشیع کے مذہب کا اظہار ملتا ہے ۔ یعنی علی کو وصی اللہ کہا گیا ہے ۔ یہ ظاہر ہے کہ شیخ ابی سعید شیعہ نہیں تھے ۔ وہ فقہ شافعی کے متبع تھے ۔ مندرجہ بالا دو کتابوں میں مذکور عقاید و افکار کی رو سے کہا جا سکتا ہے کہ مندرجہ ذیل افکار پر مبنی رباعیات ان کی ہو سکتی ہیں ۔ مثلاً :

بہت سی رباعیاں ایسی ہیں جن میں اللہ کو مخاطب کرکے دعائیں مانگی گئی ہیں ۔ اپنی کوتاہیوں ، بے عملیوں اور تقصیروں کا اعتراف کرکے مغفرت کیلئے دعا کی

گئی ہے اور توجہ کی توفیق مانگی گئی ہے ۔ ایک رباعی یہ ہے :

غمناکم و از در تو باغم نروم جز شاد و امیدوار و خرم نروم
از درگہ همچو تو کریمی هرگز نومید کسی نرفت و من هم نروم

شیخ کو خلق خدا سے ہمدردی تھی.وہ کسی کو دکھی نہیں دیکھنا چاہتے تھے ۔ مسلمان کو سزا دینے میں بھی حکمت عملی سے کام لینے کا مشورہ دیتے تھے ۔ خیرخواھی مسلمان سے متعلق ان کی ایک رباعی یہ ہے :

از چرخ و فلک گردشِ یکسان مطلب و ز دور زمانه ، عدل سلطان مطلب
روزی پنج کہ در جهان خواهی بود آزارِ دل هیچ مسلمان مطلب

یہ مسلّم ہے کہ وہ سماع کے دلدادہ تھے ۔ بعض علماء و عرفاء کو ان کی محفل آرائی پر اعتراض تھا ۔ انہوں نے مندرجہ ذیل رباعی میں اس کے جواز میں دلایل دیے ہیں :

صوفی به سماع سر ازان افشاند تا آتش خویشتن دمی بنشاند
عاقل است که دایه گهوارۂ طفل از بهر سکون طفل می جنباند

وہ فقیر درویش تھے ۔ عارف باللّٰہ تھے ۔ اس لیے انہوں نے اپنی رباعیوں میں تصوف و عرفان کے مضامین کو اکثر بیان کیا ہے ۔ ان میں سے ایک ملاحظہ کیجئے :

آن را که فنا شیوۂ و فقر آئین است نه کشف و یقین نه معرفت نه دین است
رفت او ز میان همین خدا ماند خدا الفقرا ذاتم هو اللّٰه این است

ابو سعید وحدت الوجود یا همه اوست کے قائل تھے ۔ انہوں نے ایک مرتبہ جوش میں آ کے کہا تھا ۔ اللّٰہ فی جبّتی اور پھر انگلی سے جبّہ میں سوراخ کرکے بتایا کہ اندر موجود ہے ۔ مثلاً:

گفتم که کرائی تو بدین زیبائی گفتا خود را که من خودم یکتائی
هم عشقم و هم عاشق و هم معشوقم هم آئینه هم جمال و هم بینائی

سلوک و معرفت میں کمال حاصل کرنے والے درویشوں کے عالی مقام کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے ۔ اور ان کے رتبۂ عالی کی نشاندہی کی ہے ۔ مثلاً :

درویشانند هر چه هست ایشانند در صفحۂ بار در صف پیشانند
خواهی که مس وجود زر گردانی با ایشان باش کیمیا ایشانند

بعض رباعیوں میں عشق مجازی یا محبوب مجازی کے اوصاف بیان ہوئے ہیں ۔ کہیں کہیں حقیقی معنی بھی پہنائے جا سکتے ہیں ۔ ایک رباعی یہ ہے :

دارم صنمی چهره بر افروخته ای با جور و جفا و ستم آموخته ای

او عاشق دیگرے و من عاشق او   پروانه صفت سوختهٔ سوخته ای

کچھ رباعیوں میں دنیا و انسان کی بے ثباتی ہے اور عبرتناك انجام دکھا کر عبرت حاصل کرنے کی طرف اشارہ کیا ۔ بعد میں یہی فکر عمر خیام کی رباعیات کا ایك جزء تخیل بن گئی ۔ مثلاً :

چون حاصل عمر تو فریبی و رمی است   زو داد مکن گرت بهر دم ستمی است
مغرور مشو بخود که اصل من و تو   گردی و شراری و نسیمی و نمی است

روزی ز پی گلاب می گردیدم   پژ مرده عذار گل در آتش دیدم
گفتم که چه کرده ای که می سوزندت   گفتا که در این باغ دمی خندیدم

عموماً یه خیال کیا جاتا ھے که ابو سعید نے اپنی رباعیات میں سلوك و عرفان ، عشق و محبت کے مضامین داخل کیے ۔ صرف مضامین ہی داخل نہیں کیے انہیں سوز و اخلاص سے بیان کیا. خالق و مخلوق سے خطاب میں جوش و ولوله کا اضافه کیا ۔ ان کی رباعیات میں شاعرانه لطافت بھی پائی جاتی ہے ۔ کہیں کہیں صنایع لفظی کو بھی خوب نبھا لیا ہے ۔ دعائیه رباعیوں میں سچی فریاد شامل ہے ۔ تخیل واضح ہے اور بیان صریح ۔ لفظوں کا در و بست ایسا ہے که موسیقی سے ہم آہنگ ہے مصنف نے یه کام لفظوں کی تکرار سے بھی لیا ہے مثلاً :

شوریده دلی و قصه گردون گردون   گریان چشمی و اشك جیجون جیجون
کاهیده تنی و شعله خرمن خرمن   هر شعله ز کوه قاف افزون افزون

رباعی یا غزل میں گفتگو کا عنصر مضمون کو دلچسپ بنا دیتا ہے ۔ ابو سعید کی رباعیوں میں یه تکنیك موجود ہے ۔ مثلاً :

یلؤ آمد و گفت خسته می دار دلت   دایم به امید بسته می دار دلت
ما را بشکستگان نظرها باشد   ما را خواهی شکسته می دار دلت

ایك شگفته خیال بھی رباعی کو چمکا دیتا ہے ۔ ابو سعید کو رباعیوں میں ایسے نئے مضامین ہیں، جو دل و دماغ کو شگفته کرتے ہیں ۔ مثلاً :

در دیده بجای خواب آب است مرا   زیرا که به دیدنت شتاب است مرا
گویند به خواب تا بخوابش بینی   ای بیخبران چه جای خواب است مرا

علامه اقبال نے ایسے تصوف کی مذمت کی تھی جو خانقاہیت سکھاتا ہے ۔ اور زندگی کی جدو جهد سے گریزاں بناتا ہے ۔ متصوفین اپنی اس روش کو منطقی استدلال سے درست ثابت کرنا چاہتے ہیں ۔ اس قسم کی ایك کوشش ابو سعید کی ایك رباعی میں

موجود ہے ۔ یعنی لفظی ہیر پھیر سے ایك منطقی اغلوطه سے غزوه و شهادت کو صوفی عاشق سے کمتر قرار دیا ہے ۔ وہ رباعی یه ہے.

غازی که پی شهادت اندر تگ و پوست غافل که شهید عشق فاضل تر ازوست
فردای قیامت او بدین کی ماند آن کشتهٔ دشمن است و این کشتهٔ دوست

عُمَر خیّام

خیام کا نام عُمر ، لقب غیاث الدّین ، کُینت ابوالفتح ہے ۔ اس کا وطن نیشاپور تھا ۔ صرف ایك دو مُصنّفین نے عُمر خطّاب کی رعایت سے کُنیت لکھی ہے ، جو صحیح نہیں ۔ معاصرین نے انہیں خیّامی لکھا ہے ۔ خیّام نے رسالوں کے جو بعض مخطوطات ملے ہیں ۔ ان میں بھی خیّامی لکھا ہے ۔ ممکن ہے که اُن کے اَب و جَد میں سے کسی کا پیشه خیمه دوزی ہو ۔ اس لیے اس کی نسبت سے وہ خیّامی کہلائے. شعر العجم میں عمر کا نام عمرو یعنی واؤ کے ساتھ لکھا ہے ۔ واؤ کے ساتھ لکھنے سے اس کا تلفّظ عین پر زبر سے ہوگا ۔

تاریخِ ولادت کسی تاریخ و تذکره میں مذکور نہیں . وصایائے نظام الملك کے دیباچے میں اور جامع التواریخ میں سرگذشتِ سیّدنا کے حوالے سے مذکور ہے که نظام الملك ، حسن صباح اور خیّام ، امام موفّق کے پاس ہم درس اور ہمسال تھے . اس روایت کی بنا پر خیّام کی عمر ۴۰۸ ھ اور ۴۱۰ ھ کے درمیان متعین کی گئی ہے کیونکه نظام الملك کی تاریخِ ولادت ۴۰۸ یا ۴۱۰ ھ معلوم ہے ۔ اس تاریخ کی تائید کیلئے خیّام کے رساله - کتاب الکون و التکلیف - کی ایك عبارت پیش کی جاتی ہے ۔ جس میں خیام نے ایك مسئلے کے بارے میں لکھا ہے که اس پر میں نے اور میرے اُستاد بو علی سینا نے خوب غور کیا ہے ۔ ابنِ سینا ۴۲۸ ھ میں وفات پا گئے ۔ ابن سینا جیسے فاضل استاد کی عمر کے آخری سالوں میں شاگرد ہونے کیلئے کم سے کم اٹھاره بیس سال عمر ہو تو خیّام کا سالِ ولادت ۴۰۸ یا ۴۱۰ ھ نکلتا ہے ۔ خیّام کی کتاب کی عبارت میں لفظ مُعلّمی یعنی میرے استاد سے یه مُراد نہیں که وہ ابنِ سینا سے سبقاً سبقاً درس لیتے رہے ہونگے ۔ بلکه انہوں نے ابن سینا کے علم و فضل سے استفاده کی وجه سے اُسے اپنا استاد کہا ہے ۔ ممکن ہے خیّام اُس کے کسی شاگرد کے شاگرد ہوں یا معلّمی کا لفظ زائد ہو ۔ ابن سینا کی زندگی کے آخری سال در بدری میں گُزرے ہیں ۔ اس لیے بھی ان کا ایك شہر میں جم کر بیٹھنا اور درس دینا ناممکن نظر آتا ہے ۔ وصایائے نظام الملك کا دیباچه ، نظام الملك کی اپنی تصنیف نہیں سرگذشتِ سیّدنا کا مُصنّف بھی یقیناً متعصّب تھا جس نے حسن بن

صباح ، خیام اور نظام الملک کی ہم درسی او ہم سنی اور باہمی عہد و پیمان کا ذکر کیا ہے ۔

ابو الحسن بیہقی نے اپنی تاریخ الحکماء اسلام میں خیّام کی پیدائش کا طالع نقل کیا ہے ۔ سوامی گوند تیرتھا نے اپنی کتاب Nectre of Grace میں اس زائچہ کی مدد سے ۱۵ مئی ۱۰۴۸ء (۴۴۰ ھ) متعیّن کی ہے ۔ اور یہی درست ہے ۔ سیّد سلیمان ندوی نے بھی اپنی کتاب « خیّام» میں اس کی تائید کی ہے ۔

خیّام کے اساتذہ میں ھندسه و ھیئت کے عالم ابوالحسن الانبیری کا نام ملتا ہے ۔ جس سے انہوں نے المجلی پڑھی ۔ فلسفه میں انہوں نے ابن سینا کے شاگرد بهمنیار (۴۵۸ ھ) سے استفادہ کیا ہے ۔ ان کے ایک اُستاد نصیر الدّین محمّد بن منصور (۴۹۷ ھ) تھے ۔ خیّام بڑے ذہین تھے ۔ قوتِ حافظه تیز تھی ۔ اس لیے ستره اٹھارہ برس کی عُمر میں علومِ معقول و منقول میں مہارت حاصل کر لی ۔

خیّام اٹھارہ برس کے تھے که ان کے والد فوت ہوگئے اس لیے انہیں کسبِ معاش کی ضرورت پڑی ۔ انہوں نے پہلے ایک کتاب البرہان علی استخراج اضلاع المربعات و المکعّبات لکھی لیکن اس کی قدر دانی نه ہوئی ۔ بعد میں انہوں نے جبر و مقابله پر رساله لکھا ۔ قاضی القضاۃ عبدالرحمن بن احمد سمرقندی نے ان کی قدر افزائی فرمائی اور انہیں اس قابل بنایا که وہ اپنا کام جاری رکھ سکیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے که قاضی صاحب نے بخارا کے حاکم خاقان شمس الملک سے ان کا تعارف کرایا ۔ شہرزوری کے بقول وہ خیام کی اتنی تعظیم کرتا تھا که انہیں اپنے ساتھ تخت پر بٹھاتا تھا ۔ شمس الملک ، ملک شاہ کی چھیتی ملکه ترکان خاتون کی وساطت سے بادشاہ سے وابسته تھا غالباً اس نے خیّام کو ملک شاہ سے متعارف کرایا ۔ ملک شاہ نے ۴۶۷ ھ میں اصفہان میں رصدخانه کی بنیاد رکھی ۔دوسرے علماء و حکماء کے ساتھ خیّام کو بھی اس کی تعمیر و تکمیل پر مأمور کیا ۔ خیّام نے تاریخ جلالی یا تقویم جلالی بھی مُرتّب کی ۔ سال کا نو روز یکم فروردین سے شروع کیا ۔ خیّام نے رصدخانه کے فلکی مشاہدات و تحقیقات قلم بند کرکے زیج ملکشاہی بھی تألیف کی ۔

ملکشاہ کی وفات کے بعد ۴۸۵ ھ میں برکیارق کے عہد میں وزیر فخر الملک بن نظام الملک نے خیام کی سرپرستی کی ۔ خیّام نے کلیاتِ وجود یا روضة القلوب کے نام سے ایک رساله اسی وزیر کے نام منسوب کیا۔ ملک شاہ کے بیٹے سلطان محمّد(۴۹۸- ۵۱۱ ھ) کے ساتھ خیام کے تعلقات استوار رہے ۔ سلطان سنجر کے عہد میں خیّام کے تعلّقات دربار سے منقطع ہوگئے ۔ صرف ایک مرتبه وزیر عبدالرزاق (۵۱۱- ۵۱۵ ھ) کی محفل

میں ان کا ذکر ملتا ہے ۔ خیّام کی زندگی کے متعلق مزید معلومات یہ حاصل ہوئی ہیں :
۵۰۶ ھ میں شہر بلخ میں نظامی عروضی سے ملاقات ہوئی جس میں انہوں نے پیش گوئی کی کہ ان کی قبر ایسی جگہ ہوگی جہاں موسمِ بہار میں بادِ شمال پھول برسائے گی ۔
۵۰۷ ھ میں بیہقی مؤلف تاریخ حکمای اسلام سے ملاقات ہوئی. انہوں نے بیہقی سے ریاضیات کے مسائل اور ایک عربی ضرب المثل کے معنی دریافت کیے ۔
بیہقی اور قفطی نے اخبار الحکماء میں انہیں امامِ خراسان اور علامۂ زمان لکھا ہے ۔ وہ علمِ نجوم و حکمت میں بے مثال تھے ۔ ریاضیات اور قیاسیاتِ حسابیہ میں بھی ان کا مرتبہ عالی تھا ۔ نجوم میں خیاّم کی مہارت کے متعلق چھار مقالہ میں دو واقعات مذکور ہیں ۔
۱- ۵۰۱ ھ میں محمّد بن ملک شاہ ، سیف الدولہ امیر عرب سے لڑنے کیلئے جانے لگا تو درباری نجومیوں نے وہ ساعت نامناسب جانی ۔ لیکن غزنی کے ایک جاہل نجومی نے ساعت مقرر کی ۔ بادشاہ کامیاب ہوا اور اپنے درباری نجومیوں پر خفا بھی ہوا ۔ انہوں نے کہا کہ غزنوی نجومی نے علم نجوم کے اصول کے خلاف ساعت مقرر کی تھی، اگر سلطان کو یقین نہ ہو تو خراسان میں خواجہ امام عمر خیّامی کو لکھ کر دریافت فرمالیں ۔
۲- ۵۰۸ ھ میں اسی بادشاہ کیلئے خیّام نے شکار پر روانہ ہونے کی ایسی تاریخیں مقرر کیں جن میں باد و باراں نہ ہو ۔ خیّام بادشاہ کو خود سوار کرانے آئے ۔ وہ ابھی سوار ہوا ہی تھا کہ بادل گھِر آئے اور بارش کے آثار پیدا ہوگئے ۔ لیکن خیّام نے یقین دلایا کہ مَطلَعْ صاف ہو جائے گا ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔ اور چار پانچ روز تک مطلع صاف رہا۔
خیام علمً طب میں بھی ماہر تھے ۔ چنانچہ انہوں نے ملک شاہ کے بیٹے سنجر کا علاج کیا جسے بچپن میں چیچک نکل آئی تھی ۔ وہ فقہ ، تاریخ اور لغت کے بھی عالم تھے ۔
بیہقی اور شہر زوری نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ سلطان سنجر کے وزیر عبدالرزاق کی مجلس میں اختلافِ قرأت پر بحث ہو رہی تھی کہ خیّام بھی آگئے ۔ خیّام نے قرآن کی غیر معروف قرأتیں اور ان کی علّتیں بیان کیں اور ان میں ایک کو ترجیح دی ۔ امامُ القراء ابوالحسن غزالی جو اس بحث میں شریک تھے ، خیّام کی تحقیقات سُن کر دنگ رہ گئے اور فرمایا خُدا عُلماء میں تمہارے جیسا اور پیدا کرے مجھے گمان نہ تھا کہ قاریوں میں سے کوئی اتنی معلومات رکھتا ہوگا ، حُکماء سے تو قطعاً امیّد نہ تھی ۔
شہرزوری نے نزھت الارواح فی تاریخ الحکماء میں یہ بھی لکھا ہے ۔ کہ ایک بار مرو کے حمام میں قاضی عبدالرشید بن نصر کی موجودگی میں خیّام نے مُعَوِّذَتَین میں الفاظ

کی تکرار کے متعلق اس قدر تفصیل سے معلومات کا اظہار کیا کہ پوری کتاب مُرتّب ہو سکتی تھی ۔

خیّام ریاضیات اور ھندسه پر بھی دسترس رکھتے تھے ۔ چنانچه انھوں نے اپنے «رساله جبر و مقابله» میں اس کا ذکر کیا ہے ۔ وہ عربی میں بھی شعر کہہ لیتے تھے ۔ چنانچه خریدۃ القصر میں ان کے عربی اشعار نقل کیے گئے ہیں ۔ عربی میں ان کی مہارت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے که انہوں نے اپنے دو رسالوں کے علاوہ باقی تمام رسائل عربی میں لکھے ۔

بیہقی نے خیام کے داماد امام محمّد بغدادی سے یه واقعه سن کر لکھا ہے که خیّام وفات کے وقت ابنِ سینا کی کتاب الشفا کا مطالعه کر رہے تھے ۔ جب وحدت و کثرت کے باب پر پہنچے تو انھوں نے اپنے خلالِ دنداں کو کتاب کے صفحوں کے درمیان رکھا ۔ چند شرفاء کو بلایا ۔ جائیداد کے متعلق وصیت کی ۔ سارا دن روزہ رکھا ۔ عشاء کی نماز کے وقت سجدے میں سر رکھا اور کہا ۔ اے خدا! تو جانتا ہے که میں نے اپنی لیاقت کے مطابق تجھے سمجھا ۔ میری یہی معرفت میرے لیے شفاعت کا کام دے گی ۔ اس کے بعد وفات پا گئے ۔ مجمع الفصحاء میں سال وفات ۵۱۷ ھ ، یدبیضا میں ۵۱۸ ھ، تاریخ ادبیات عرب مولّفه بروکلمن میں ۵۱۵ ھ درج ہے ۔ نظامی عروضی ۵۳۰ ھ میں نیشاپور میں خیّام کی قبر پر پہنچے اور انہوں نے خیام کی پیش گوئی کو عملاً صحیح پایا ۔ انہوں نے چہار مقاله میں لکھا ہے که وہ چند سال پہلے وفات پا چکے تھے ۔ قسطنطنیه میں عاشیر آفندی کے نسخے میں چار سال پہلے لکھا ہے ۔ اس باب کی تصدیق دہ فصل مولّفه احمد بن حسین الرشید تبریزی سے بھی ہوتی ہے ۔ عالی رومی نے خیام کا حال اسی دہ فصل سے ہی مُرتّب کیا تھا ۔ اس میں لکھا ہے که نظامی عروضی کا بیان ہے که وہ ۵۲۲ ھ میں حج کو گیا ۔ تین سال بعد واپس ہوا ۔ استر آباد میں استاد کی وفات کی خبر سُنی اور نیشاپور پہنچا اور قبر کی زیارت کی ۔ اس تفصیل سے بھی ظاہر ہوتا ہے که سالِ وفات ۵۲۶ ھ زیادہ معتبر ہے ۔

تصانیف :

۱- رساله بحث وجود یا رساله الاوصاف و الموصوفات ۔ ۲- رساله کون و تکلیف ۔ ۳- رساله مختصر در طبیعیات لوازم الامکنه ۔ ۴- زیج ملکشاہی ۔ ۵- رساله میزان الحکم یا فی الاحتیال لمعرفة مقدار الذھب و الفضه ۔۶- رساله فی شرح ما اشکل من مصادرات کتاب اقلیدس ۔ ۷- رساله فی الجبر و المقابله ۔ ۸- کتاب البرھان علی طرق استخراج اضلاع المربعات و المکعبات ۔ ۹- مسائل ثلثه ۔ ۱۰- الضیاء العقلی فی موضوع

العلم الکلی ۔ ۱۱- کلیات وجود (فارسی) ۔ ۱۲- رباعیات فارسی . ۱۳- بعض عربی اشعار ۔ ۱۴- مکاتبات خیام ۔ ۱۵- سلسلۃ الترتیب (فارسی)۔ ۱۶- قصیدہ فارسی . ۱۷- رسالہ موسیقی خیّام یا خیالی (عربی) (خیامی نامہ مرتبہ جلال الدّین ھمایی ، ص ۳۴۱-۳۴۲، ۱۳۴۶ ھ ش) .

افکار و عقائد

خیّام کے مسلک کے متعلق قفطی نے اخبار الحکماء میں لکھا ہے کہ وہ امامِ خراسان اور علامۂ زمان تھا .وہ علمِ یونان جانتا تھا ۔ جزا و سزا کے مالک خدائے واحد کی تلاش کیلئے ابھارتا تھا ۔ اعمالِ بدنی کی تطہیر اس لیے سمجھتا تھا کہ نفسِ انسانی پاکیزہ ہو . یونانی اصولِ فلسفہ کے مطابق سیاسی و مدنی قواعد کی پابندی کا حکم دیتا تھا ۔

رسالۂ کلیاتِ وجود کے آخر میں خیّام نے خود اپنے زمانے کے علماء و حکماء کے طبقات کا جائزہ لیا ہے اور ان میں سے ایک کے متعلق اپنے ترجیحی نظریات بھی پیش کیے ہیں ۔ اس بیان سے ان کے عقاید پر واضح روشنی پڑتی ہے ۔ اس کا خلاصہ یہ ہے : معرفتِ خداوندی کے طالب چار گروہ ہیں ۔

۱- متکلّمین : جو بحث اور دلیل و حُجّت دینے پر راضی ہیں اور اس کو کافی سمجھتے ہیں .

۲- فلاسفہ حکماء : انہوں نے منطق و دلائل سے ثبوت مہیّا کیے لیکن وہ بھی منطقی شرائط پر پورے نہیں اتر سکے ۔

۳- اسماعیلی و تعلیمی : یہ سمجھتے ہیں کہ معرفتِ ذات و صفاتِ خداوندی میں بہت مشکلات ہیں اس لئے مُخبر صادق جو طریق بتائے وہی درست ہے ۔

۴- صوفیہ : یہ وہ اشخاص ہیں ۔ جنہوں نے تہذیب اخلاق اور تصفیہ باطن کے ساتھ نَفس ناطقہ کو پاک کیا جو صاف آئینہ ملکوت کے سامنے ہوا اور اس میں حقیقتِ اشیاء جلوہ گر ہوئی . یہ طریق سب سے بہتر ہے ۔ اگر حجاب و کدورت دور ہو جائے تو حقایق اشیاء اصل حالت میں نمودار ہوتی ہیں ۔

اس سے ظاہر ہے کہ خیّام صُوفی حکیم تھے اور فلسفیانہ تصوّف کے پیرو ۔ ان کا منتہائے مقصود معرفتِ خداوندی تھا ۔ وہ قائل تھے کہ اس کیلئے ریاضت کرنا اور حُسنِ توفیق مانگنا واجب ہے ۔ یہ وہ خیالات ہیں ۔ جو یونان کے فلسفۂ اخلاق، اشراقی نظریات ، جدید افلاطونی حکمت اور ابنِ سینا کی تصانیف میں موجود ہیں ۔

خیّام خدا کو حق اوّل ، واحد ، سر چشمۂ موجودات اور ظلم و شر سے پاک سمجھتے ہیں . خیّام میں مرجیہ کے عقاید بھی پائے جاتے ہیں یعنی خدا خیر محض ہے وہ

گناه گاروں کے گناہ بخش دے گا. اسے کسی سے دشمنی نہیں ۔ وہ خیر کے قائل ہیں . اور وہ اپنے رسالہ اسئلہ ثلاثہ میں لکھتے ہیں کہ شاید بظاہر جبری حق کے زیادہ قریب ہے ۔

خیّام کے نزدیک عقول ، نفوس ، افلاک ، موالید، عناصر ، واجب الوجود اور ممکنات کے درمیان واسطہ ہیں ۔ ان کی معرفت انسان کیلئے واجب ہے . جن اشخاص نے خیّام کو رند ، لاابالی ، دہری ، مُنکرِ خدا ، قائلِ تناسخ اور مذہبی صوفی قرار دیا ہے ۔ انہوں نے خیّام سے منسوب جعلی رباعیات سے استدلال کیا ہے اور وہ صحیح نہیں ۔

خیّام کی شراب

نبیذ کے حلال قرار دیے جانے سے بادشاہ ، وزراء امراء تک نبیذ پیتے تھے ۔ بعض چُھپ کر بھی پیتے تھے . اخلاق و آداب کی کتابوں میں آدابِ خوردن شراب کی ایک فصل رکھی جاتی تھی ۔ قابوسنامہ اور راحت الصدور میں اس موضوع کیلئے ایک ایک باب رکھا گیا ہے ۔ شراب کے عمومی رواج کے باوجود کسی معاصر یا قریب العصر تذکرے میں خیام کی شراب خواری کی طرف اشارہ تک نہیں ۔ کاتب اصفہانی ، قفطی اور نجم الدّین رازی جو ان کے مخالفین میں سے ہیں ۔ انہوں نے بھی اس قسم کی کسی بات کا ذکر نہیں کیا ۔ نزھت المجالس میں خیام کی ایک رباعی ملی ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ وہ خوشدلی سے پیتے تھے لیکن قربِ خداوندی کے حصول کے بعد اب نہیں پیتے :

من مَی ز برای تنگ دستی نخورم   یا از غمِ رسوائی و مستی نخورم
تَا مَی ز برای خوشدلی می خوردم   اکنون که تو بر دلٗ نشتی نخورم

خیّام سے منسوب خمریہ رباعیات کی تعداد سو سے زیادہ ہے لیکن یہ یقینی نہیں کہ یہ رباعیات خیام کی ملکیّت ہیں ۔ زوکوفسکی نے خیام کی ۸۲ مشکوک رباعیات جمع کی ہیں، جن میں ۳۳ خمریہ رباعیاں بھی ہیں ۔ خیّام سے منسوب خمریہ رباعیوں کو مختلف معانی بھی پہنائے جا سکتے ہیں ۔ شراب و جام و ساغر سے مُراد اخلاص و نیکو کاری ہے . شراب سے مُراد شرابِ حقیقی یعنی جذبۂ روحانی اور معرفتِ حق ہے ۔ شراب بیخودی حاصل کرنے کا واسطہ ہے ۔ شراب و جام و مینا کی تمثیل کیلئے ذکر کیا ہے۔ جس سے مُراد تغییر مادّہ و فنا اور زندگی کا عبرتناک انجام دکھانا ہوتا ہے .

رُباعیات

عُمر خیّام کی رباعیات کا معاصر و مستند نسخہ ابھی تک دستیاب نہیں ہوا ۔ دُنیا کے مختلف ملکوں میں رباعیات کے جو نسخے ملتے ہیں ۔ ان میں تعداد کے علاوہ متن میں بھی اختلافات موجود ہیں ۔ مثلاً بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں رباعیات کی کم سے کم تعداد ۱۵۸ ہے اور کیمبرج یونیورسٹی کے مخطوطے میں زیادہ سے زیادہ تعداد ۸۰۱

ہے ۔ سب سے قدیم نسخہ ایک مجموعہ میں شامل ہے جو مُنتخباتی از اشعارِ قُدَماء کے نام سے مرتّب کیا گیا تھا ۔ اور وہ غیاث الدّین محمّد بن یوسف نے ۶۰۴ ھ میں لکھا تھا اس میں رباعیاتِ خیّام کی تعداد ۲۵۳ ہے ۔ خیّام سے منسوب رُباعیات میں محققین کے نزدیک ۱۳۰ کے لگ بھگ ایسی رباعیاں ہیں جو دوسرے شعراء کے کلام میں بھی ملتی ہیں ۔ مثلاً یہ رباعیاں فارابی، ابو الحسن خرقانی، غزالی ، ابو سعید ابوالخیر ، ابن سینا ، عبداللّٰہ انصاری ، عطّار ، افضل کاشانی، سنائی ، فخر الدّین رازی ، سیف الدّین باخرزی ، نجم الدّین رازی، نصیر الدّین طوسی ، سراج قمری ، مجد الدّین همگر ، انوری ، مغربی تبریزی اور کمال اسماعیل کے کلام میں ملتی ہیں ۔

دوسروں کی رباعیاں خیّام سے کیوں منسوب کی گئیں ؟ اس کے اسباب کچھ ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ لوگوں نے خیّام کو صوفی سمجھایا لاابالی رند ۔ چنانچہ ان کی شہرت کے پیش نظر اور اپنے عقاید کی تبلیغ کی خاطر اس قسم کے مضامین کی رباعیاں خیّام سے منسوب کی گئیں ۔ بعض لوگوں نے خیّام کی فلسفیانہ رباعیات کا جواب لکھا ۔ بعض نے سوال بھی لکھا اور جواب بھی ۔ بعد میں سوال و جواب دونوں ، خیّام سے منسوب ہوگئے ۔ بعض شعراء نے خیّام کے ہم معنی اشعار لکھے ۔ رباعیات جمع کرنے والوں نے غلطی سے ان کو خیّام کے نام درج کر دیا ۔ بعض اوقات کسی نامور شخص نے خیّام کی رباعی پڑھی ۔ سُننے والوں نے اسے خیّام کی بجائے قاری کی رباعی قرار دے دیا ۔ بعض اشخاص نے حافظ شیرازی کے دیوان خمریات پر مبنی غزلوں یا رباعیوں کے ساتھ تفنّن کے طور پر رباعیات خیام کو بھی درج کر لیا ۔ او بعد میں وہ رباعیاں حافظ کے دیوان میں مخلوط ہو گئیں ۔

محقّقین نے خیام کی اصلی و غیر اصلی رباعیات کے تعین کیلئے کوششیں کی ہیں ۔ اور مختلف راہیں نکالی ہیں ۔ مثلاً :

۱- بڑے مجموعۂ رباعیات میں سے جو رباعیات دوسرے شعراء کے کلام میں ملیں ان کو حذف کرکے باقی خیام کا مال سمجھا گیا ۔

۲- جن رباعیوں میں خیام کا تخلّص ہے وہ خیام کی تخلیق قرار پائیں ۔

۳- قدیم تواریخ و تألیفات میں جہاں جہاں رباعیات خیام موجود ہیں ان کو جمع کیا گیا ۔

۴- مطبوعہ نسخوں میں ایسی رباعیاں جو سب میں موجود ہیں ۔ خیّام کا مال ہیں ۔

۵- خیّام کے اپنے رسائل سے ان کے افکار و عقاید متعین کرکے ان کی ہم معنی رباعیات کو خیام کی رباعیات تسلیم کیا گیا ۔ یہ سب طریق خطرے سے خالی نہیں

کسی معاصر نسخے کی عدم موجودگی میں اس طرح متعیّن کیا ہوا نسخہ بہرحال شک و شبہ سے بالا نہیں ہو سکتا ۔ محمّد علی فروغی اور دکتر قاسم غنی نے قاعدہ نمبر ۳ کے مدنظر ۶۶ رباعیاں جمع کی ہیں اور باقی رباعیاں قاعدہ نمبر ۵ کے پیشِ نظر شامل کی ہیں ۔ اور یوں رباعیات کی تعداد ۱۷۸ ہوگئی ہے ۔ حسین شجرہ نے اپنے نقطۂ نظر سے اکیس رباعیاں اصلی قرار دی ہیں ۔

فکر و فن

شاعر کی حیثیت سے خیام کی لافانی شہرت فٹز جیرالڈ کی مرہونِ منّت ہے ۔ جس نے انگریزی نظم میں ان کی بعض رباعیوں کا ترجمہ ایسے دلآویز انداز میں پیش کیا کہ انگلستان ، امریکہ اور یورپ میں ان کا چرچا ہوا ۔ اور عُلماء نے خیام کی زندگی اور رباعیات کے متعلّق تحقیقات کا سلسلہ شروع کیا ۔ دُنیا کی تقریباً تمام مشہور زبانوں میں رباعیات کے ترجمے شائع ہوئے اور مزیّن ، مصوّر اور مُطلاً ایڈیشن نکلے ۔ ۱۹۲۹ ء میں اے ۔ جی ۔ پوٹر کے اندازے کے مطابق ۱۱۸۱ مختلف ایڈیشن شائع ہو چکے تھے ۔

چونکہ رباعیات کی تعداد مختلف ہے اور یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ خیام سے منسوب رُباعیاں دوسرے شعراء کے کلام میں بھی ملتی ہیں اس لیے جن اشخاص نے رباعیات کی تعین و تخصیص کے بغیر خیّام کی شخصیت متعیّن کی ہے یا ان کے افکار و عقاید پر روشنی ڈالی ہے انہوں نے خیّام کے ساتھ بے انصافی کی ہے ۔ خیّام کی صحیح شخصیت متعیّن کرنے کیلئے دو اہم باتیں ہیں ۔ پہلی یہ کہ خیام کے اپنے رسائل میں جن افکار و عقاید پر روشنی پڑتی ہے انہیں سامنے رکھا جائے ۔ دوسری یہ کہ قدیم سے قدیم مآخذ میں جو رباعیات خیام کے نام ملتی ہیں انہیں سامنے رکھا جائے ۔ فی الحال محمّد علی فروغی اور دکتر قاسم غنی نے قدیم مآخذ سے جو ۶۶ رباعیاں جمع کی ہیں نہیں کچھ وثوق سے خیام کا مال سمجھا جا سکتا ہے ۔ ان کا جائزہ لینے سے جو عقاید ابھر کر سامنے آتے ہیں ، اُن کے رسائل سے اخذ کردہ بعض عقاید میں تضاد نظر آتا ہے لیکن موجودہ صورتِ حال میں اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ۔ رباعیات کا تجزیہ کرنے سے خیّام کے مندرجہ ذیل افکار پر روشنی پڑتی ہے ۔

۱- وہ زندگی کے آغاز و انجام پر غور کرتا ہے ۔ کہتا ہے ہمیں معلوم نہیں ہم کہاں سے آئے ہیں اور کدھر کو جا رہے ہیں ۔ زندگی ایک ایسا معمّہ ہے جو آج تک حل نہیں ہوا :

در دائرہ ای کہ آمدن و رفتنِ ماست آن را نہ بدایت نہ نہایت پیدا ست
کس می نزند دمی درین معنی راست کاین آمدن ز کجا و رفتن بہ کجاست

۲- وہ پوچھتا ہے : موت کیا ہے ؟ کیوں ہے ؟ انسان کی تخلیق کرکے اس میں تخریب کے اجزا کیوں رکھے گئے ؟ اس میں کیا حکمت پوشیدہ ہے کہ وہ خود ہی بناتا ہے اور خود ہی اسے توڑتا ہے :

دارندہ چو ترکیب طبایع آراست و ز ہر چہ افگندش اندر کم و کاست
گر نیك آمد شکستن از بہر چہ بود ور نیك نیامد این صور عیب کراست

۳- اس کا عقیدہ یہ ہے کہ قدرت نے ہماری زندگی کے احوال متعین کرکے پہلے ہی سے اس دنیا میں بھیجا ہے اس لیے ہمیں اپنے اعمال پر اختیار نہیں :

قصّہ چکنم کہ بی تقاضای تو دَی دادند قرار کار فردایِ تو دَی

چون روزی و عمر بیش و کم نتوان کرد دل را بہ چنین غصّہ دژم نتوان کرد
کار من و تو چنانکہ رای من و تست از موم بدست خویش ہم نتوان کرد

۴- خیّام کی متذکرہ صدر روشِ فکر اسے غضبناك کرتی ہے ۔ جب وہ دُنیوی مال و اسباب کی ناپائیداری اور بے ثباتی اور مادی دنیا کے تغیر و فنا پر غور کرتا ہے تو اس کی روح اور بھی مغموم ہو جاتی ہے ۔ وہ کہتا ہے جسم فانی ہے :

در خیمۂ تن کہ سایہ بانی ست ترا ہان تکیہ مکن کہ چار میخش سُست است

جسم موت کے بعد خاك میں مل جاتا ہے ۔ اُس کی مٹی غبار بن کر اڑتی پھرتی ہے ۔ کمہار اس کو پاؤں تلے گوندھتا ہے ۔ پھر اس کے برتن بناتا ہے ۔ اس مٹی سے سبزہ اگتا ہے اور گُلِ لالہ نکلتا ہے ۔ حسینانِ جہاں کا یہ انجام اس کی نگاہ میں سخت عبرتناك اور افسوس ناك ہے ۔ وہ کہتا ہے :

گرد از رخِ نازنین بآزرم فشان کان ہم رخ و زلفِ نازنینی بودہ است

ہر جا کہ قدم نہی تو بر روی زمین آن مردمك چشم نگاری بودہ است

ہر کاسۂ مَی کہ در کفِ مخموریست از عارضِ مستی و لبِ مستوریست

با من بزبانِ حال می گفت سبو من چون تو بُدم تو نیز چو من باش

۵- جب زندگی کا راز معلوم نہیں ۔ انسان کا عبرتناك انجام ہماری آنکھوں کے سامنے ہے ۔ دنیا میں کوئی کسی کا مددگار نہیں اور عالی ہمت شخص کم ظرف اشخاص کا احسان بھی نہیں اٹھانا چاہتا ۔ خیّام نصیحت کرتا ہے :

چون بوده گذشت و نیست نابوده پدید　خوش باش و غمِ بوده و نابوده مخور

برخیزُ بتا بیار بهرِ دلِ ما　حل کن به جمال خویش مُشکلِ ما

یك کوزه شراب تا بهم نوش کنیم　زان پیش که کوزه ہا کنند از گِلِ ما

پھر کہتا ہے گردش فلك اور انقلابِ زمانہ ہمیں تہ و بالا کرنے پر تُلے ہوئے ہیں ۔ اس لیے موجودہ فرصت کو غنیمت جانو اور زندگی سے لطف اٹھاؤ :

در سبزه نشین و مَی روشن میخور　کاینٔ سبزه بسی دمد ز خاكِ من و تو

ازدی که گذشت هیچ ازو یاد مکن　فردا که نیامده است فریاد مکن
برنامده و گذشته بنیاد مکن　حالی خوش باش و عمر برباد مکن

مندرجہ ذیل افکار میں سے دو باتیں خیّام کے ان معتقدات کے خلاف ہیں جن کا اظہار اس نے اپنے رسائل میں کیا ہے ۔ رسالہ «کون و تکلیف» میں وہ بتاتا ہے . کہ کائنات اور اشرف المخلوقات انسان میں جو تعمیر و تخریب کے عناصر ہیں ، حکمتِ الٰہی ان کی متقاضی ہے ۔ دوسری یہ کہ جب خدا نے زندگی و موت کا مقصد بتا دیا ہے تو کیا خیّام قرآن کا عالم ہوتے ہوئے بھی یہ نہیں جانتا تھا ؟ وہ خدا کے اس فعل کو تشکیك کی نظر سے دیکھ کر غمناك کیوں ہوتا ہے ؟ خود بھی بدظن ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی بدگمان کرتا ہے ۔ البتہ انسان کو اس کا انجام یاد دلا کر غرور و تکبّر سے منع کرنا نہایت مفید ہے ۔ اس فانی دینا میں اور محدود مدّت میں زندگی گزارنے کا جو نسخہ انہوں نے بتایا ہے ممکن ہے اکثر کے نزدیك کامیاب نسخہ دنیا کی بے ثباتی اور مال و اسباب کی ناپائیداری کو دل و دماغ پر مسلط رکھ کر افسردہ و غمناك رہنا صحیح نہیں ۔ خوشدلی ، خوش باشی اور فرصت کے لمحات سے موزوں استفادہ کرنا درست ہے ۔ خیّام کی یہی آواز دکھیاروں کے دل کا سہارا بنی ۔ اگر اس کا مطلب یہ سمجھ لیا جائے نتائج و حوادث سے بے پروا ہو کر عیش کوشی اور لذّت اندوزی میں مصروف رہو تو یہ کسی طرح بھی مستحسن نہیں ۔ اگرچہ رباعیات خیّام کی مقبولیت ان کے افکار کی گرفت کی وجہ سے ہے . پھر بھی اس دلنشینی میں فنّی خوبیوں کا بھی دخل ہے ۔ خیّام کے تخیّل میں وضاحت ہے ۔ وہ اپنے خیالات کو صراحت سے بیان کرتا ہے ۔ اس کے احساسات میں خلوص ہے اس لیے اس کی باتیں دل کو لگتی ہیں . مصرعوں میں الفاظ کا در و بست نہایت موزوں ہے ۔ تشبیہات اور تمثیلات فکرانگیز ہیں ۔ ان سے حُسنِ مطالب میں اضافہ

ہوا ہے ۔ مثلاً یہ مصرعے دیکھیے :

این بحرِ وجود آمده بیرون ز نهفت

گر شاخِ بقاز بیخ بختت رست

چون ابر به نو روز رخِ لاله بهشت

رباعیات کی دلنشینی کے دو اہم سبب ان کا طرزِ تخاطب اور منطقی استدلال ہے ۔ ان کی باتیں دل و دماغ دونوں کو متاثر کرتی ہیں ۔

انوری

علی نام ، اوحد الدّین لقب باپ کا نام وحید الدّین محمّد اور دادا کا نام اسحاق تھا ۔ وہ دشت خاوران میں شہر ابیورد کے قصبہ میهنه کے نزدیك گاؤں بُدیه ، میں پیدا ہوا ۔

انوری نے متداول علوم میں مہارت حاصل کی ۔ اس نے مندرجہ ذیل اشعار میں اپنے اوصاف و فضایل کو بیان کیا ہے جن سے اس کی شخصیت واضح ہوتی ہے :

گرچه در بستم در مدح و غزل یکبارگی ظن مبر کز نظم الفاظ و معانی قاصرم
بلکه از هر علم کز اقران من داند کسی خواه جزوی گیر آن را، خواه کلی ، قادرم
منطق و موسیقی و هیأت بدانم اندکی راست باید گفت ، گویم : با نصیب وافرم
در الهی آنکه تصدیقش کند عقل سلیم گر تو تصدیقش کنی بر شرح وبسطش ماهرم
وز ریاضی مشکلی چند به خلوت حل شدست وندران جز واهب توفیق کس نه ناصرم
از طبیعی رمز چند ارچند بی تشویش نیست کشف دانم کرد ، اگر حاسد نباشد ناظرم
نیستم بیگانه از اعمال و احکام نجوم در بیان او بغایت اوستادِ ماهرم
من ز لقمان و فلاطون نیستم کم در حکم ور همی باور نداری رنجه شو ، من حاضرم
با بزرگان مستفیدم ، با فرودستان مفید عالم تحصیل را هم واردم هم صادرم

ایك دوسرے قصیدے میں اپنی خوبیوں کو یوں گنوایا ہے :

ندیمی مرا زیبد از بهر آن را که آداب آن نیك دانم که دانی
اگر نامه باید نوشتن نویسم به کلك دبیران دبیهٔ خسروانی
اگر شعر خواهی که گویم ، بگویم هم از گفتهٔ خود ، هم از باستانی
و گر نرد و شطرنج خواهی ببازم حریفانه سحر حلال از روانی
و گر هزل خواهی سبك روح باشم نباشد ز من بر تو هم جز گرانی

دیوان انوری میں ۵۳۰ سے ۵۸۲ ھ تك واقعات کے حوالے ملتے ہیں ۔ ان میں سے مشہور یہ ہیں ۔ ۵۴۸ ھ میں ملك سنجر غزوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا اور غزوں نے خراسان میں تباہی مچا دی ۔ انوری نے خاقان سمرقند کی خدمت میں قصیدہ لکھ کر بھیجا جو «اشکہای خراسان» کے نام سے معروف ہے ۔ اس کے پہلے دو شعر اس طرح ہیں :

بر سمرقند اگر بگذری ، ای باد سحر　　نامۂ اهل خراسان ببر خاقان بر
نامه ای مطلع آن رنج تن و آفت جان　　نامه ای مقطع آن درد دل و سوز جگر

۵۵۲ ھ میں سلطان سنجر کی وفات پر انوری نے قطعہ تاریخ وفات لکھا۔ اثیر الدّین فتوحی نے بلخ کی ہجو لکھ کر انوری سے منسوب کر دی جس سے اہل بلخ انوری سے سخت ناراض ہوئے ۔ فتوحی کے ہجویہ شعر یہ ہیں :

بلخ شهریست در آگنده ز اوباش و رنود　　در همه شهر و نواحیش یکی بخرد نیست

انوری نے تہمت کے جواب میں سوگند نامہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے :

ای مسلمانان ، فغان زین دور چرخ چنبری　　وز نفاق تیر و قصد ماه و کید مشتری

انوری کی زندگی میں ایك ایسا واقعہ پیش آیا جس سے انوری کو ذلت و خفت سے دوچار ہونا پڑا . ۵۸۲ ھ میں سات سیارے برج میزان میں جمع ہوئے . انوری نے پیشگوئی کی کہ باد صرصر کا ایسا طوفان آئے گا کہ سارا شہر زیر و زبر ہو جائے گا اور لوگوں نے جان و مال کی سلامتی کیلئے زیر زمین گھر بنا لیے ۔ لیکن اس رات اتنی ہوا بھی نہ چلی کہ چراغ مینار کو بجھا سکے ۔

انوری نے بے شمار اشخاص کی مدح سرائی کی ہے ۔ ان میں سے بعض شناسا ہیں اور بعض نا معروف و گمنام ہیں ۔

انوری کا زمانۂ حیات بڑے خلفشار کا زمانہ تھا . ایران کے اس حصّے میں سلجوقی ، آل افراسیاب ، خوارزمشاھی ، غزنوی ، غوری ، سیستانی ، اسماعیلی حکومتیں بر سراقتدار تھیں ۔ اور حکمران ایك دوسرے سے برسر پیکار رہتے تھے .

ترك و ترکمانی قبایل خاص طور پر غُز، مرو ، بلخ ، بامیان ، سرخس ، نسا ، ابیورد ، هرات ، طوس، اسفراین ، نیشاپور ، سبزوار ، گرگان اور استر آباد جیسے شہروں پر حملہ آور ہو کر تاخت و تاراج کرتے اور قتل عام سے بھی باز نہ آئے ، مال و متاع کے نقصان کے ساتھ ذرایع معلومات بھی ضایع ہوگئے ۔ انوری نے جن اصحاب کی مدح یا ہجو کہی ہے ، ان کا سراغ لگانا مشکل ہوگیا ہے .

تذکروں اور تاریخوں میں انوری کا سال وفات ۵۴۴ ھ سے ۵۹۷ تك مرقوم ہے ۔ لیکن سعید نفیسی کی تحقیق کے مطابق ۵۸۵ ھ زیادہ صحیح ہے ۔



انوری کی شاعری

قصیدہ گوئی

انوری نے دورۂ غزنوی کے قصیدہ سراؤں کی روش کو جاری رکھا . اس کے اکثر قصاید ، قطعات ، غزلیات اور رباعیات سادہ و رواں ہیں ۔ لیکن پختہ و محکم اور غنائیت سے مالا مال . قصیدے میں فرخی ، مسعود سعد اور ابو الفرج رونی کا اسلوب نمایاں ہے ۔ انوری کو اپنی شاعری کی عظمت کا احساس تھا. اس نے کہا ہے :

انوری ، ای سخن تو بسخا ارزانی گر بجانت بخرند اهل سخن ، ارزانی
در سر حکمت و فطنت و کرامت عقلی در تن دانش و رامش به لطایف جانی

اپنی قابلیت ، استعداد اور شاعری میں افضلیت کا اظہار اس طرح کیا ہے :

خاطری چو آتش هست و زبانی همچو آب فکرت تیز و ذکای نیك و شعر بی خلل

انوری کے قصاید عموماً مدحیہ ہیں ۔ وہ شروع ہی سے مدح کا آغاز کر دیتا ہے ۔ صرف گنتی کے چند قصاید ہیں جن میں بہاریہ تشبیب اٹھائی گئی ہے یا غزلیہ اور خمریہ کے اشعار سے کام لیا ہے ۔ مثلاً یہ قصاید :

این چه جوانی و جمالست جهان را وین حال کـه نوگشت زمین را و زمان را
در باغ چمن ضامـن گل گشت ز بلبل آن روز کـه آوازه فکندند خزان را
جرم خورشید چو از حوت درآید به حمل اشهب روز کند او هم شب را ارجل

دو قصاید کو موضوعی قصاید کہا جا سکتا ہے . ایك قصیدہ وہ ہے ۔ جو اشکهای خراسان کے نام سے معروف ہے . جس کے پہلے دو شعر پہلے درج ہوچکے ہیں ۔ دوسرا قصیدہ وہ ہے جسے انوری نے «سوگند نامه» کہا ہے ۔ اور هجو بلخ سے اپنی بریت کے اظہار کیلئے کہا ہے ۔

ایك اور قصیدہ بلند پایہ ہے جس کی تشبیب میں قضا و قدر اور حیات و کائنات اور جبر و اختیار کے مسائل پر اظہار خیال کیا ہے ۔ اس کا مطلع یہ ہے :

اگر محول حال جهانیان نه قضاست چرا مجاری احوال بر خلاف رضاست

بعض قصاید میں خالق و تخلیق کائنات کو بھی موضوع بنایا ہے ۔ مثلاً در توحید ، (دیوان انوری ، ص ۱۷۵) ۔

انوری اپنے قصاید میں سبك خراسانی سے نکل کر سبك عراقی میں داخل ہوا چاہتا ہے ۔ عربی الفاظ ، نجوم ، فلسفہ و حکمت و موسیقی کی اصطلاحات ، تاریخی تلمیحات اور صنایع لفظی و معنوی کے استعمال سے اس کے بعض قصاید عام قاری کے فہم سے بالا ہو جاتے ہیں ۔ اس لیے ان کی شروح بھی لکھی گئی ہیں ۔

انوری نے مشکل ردیفیں انتخاب نہیں کیں ۔ ایك آدھ شاید مشکل ہو ۔ مثلاً . ردیف ماہ و آفتاب ، آفرینش ، روزگار . باقی ردیفیں تو گویا غزل کی ردیفیں ہیں ، مثلاً باشد، باد ، دارد ، می رود، شکست وغیرہ .

انوری کے ممدوحین میں عظیم الشان بادشاہ ، سلاطین، حکمران ، وزراء ، سپہ سالار ، اور قضاۃ شامل ہیں ۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جن سے ان کی روزی وابستہ تھی . بعض ایسے تھے جن سے اس کو ضرورت و احتیاج کے وقت فائدہ پہنچا ۔ بعض ایسے ہیں جن کی قدر و منزلت ان کے علم و فضل اور سیاسی و عسکری تدبر کی وجہ سے اس کےدل میں تھی ۔ اس لئے مدح کا معیار بھی ممدوح کی شخصیت سے ہے ۔ اسی نسبت سے شاعر نے قصیدہ لکھنے میں محنت کی ہے ۔ الفاظ کو بنایا سنوارا ہے ۔ قصیدے کی اٹھان سے ہی اس کا شکوہ نظر آتا ہے ۔ بعض ممدوحین کے ساتھ شاعر کا خلوص عیاں ہے اور نہایت محبت و احترام سے ممدوح کے اوصاف و فضایل بیان کرتا ہے ۔ درباری قصاید میں روایتی فضایل بیان کیے ہیں . مثلاً ممدوح کے عدل و شجاعت ، سخاوت ، فتوحات اور شکست کا اکثر ذکر کیا ہے . فضایل بیان کرنے کیلئے شاعر اپنے تمام سرمایۂ علم و فضل اور کمال فن کو کام میں لاتا ہے تا کہ وہ سننے والوں کو متأثر کر سکے ۔

انوری کے مدحیہ قصاید کی مندرجہ ذیل خصوصیات شمار کی جا سکتی ہیں ۔

۱- فلسفہ و حکمت ، کلام و الهیات کا اظہار، مثلاً :

اگر فحول حال جهانیان ....

۲- تلمیحات علمی

ای مسلمان ، فغان زین دور چرخ چنبری .....

دست انصاف تو در بدعت سرای روزگار دست محمودست بر بت خانهای سومنات
آمـــدی اندر هنر « اقصی نهایة الکمال » چون محیط آسمان « اقصی نهایات الجهات »

ایك قصیدہ جسے انوری نے «فراقنامه» کا عنوان دیا ہے اس میں ہجر محبوب کی تشبیب باندھی ہے اس میں ہلکا ہلکا غزل کا انداز ہے ۔ آسان اور سادہ لفظوں میں صبا کو مخاطب کرکے اسے قاصد بنایا ہے ۔ یہ غزلیہ تشبیب کا نہایت عمدہ نمونہ ہے ۔ چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں :

ایا نسیم صبا ، پات در حناست مگر چرا گذر نکنی سوی آن خجسته نگار
رسول عاشق مسکین تویی سبك برخیز نه وقت عذر و بهانه است ، عذر را بگذار
سگانِ آن سیر کو را سلام من برسان سلام من چو رسانی ، پیامشان به من آر
پس از دعای فراوان ، سلام بی پایان بگویش ای مه گل روی و سرو گل رخسار
کجا شد آن همه پیوند و وعده و پیمان کجا شد آن همه سوگند و وعدهٔ بسیار

نرفته نیم خطایی ، چرا ملول شدی نکرده نیم جفایی ، چرا شدی بیزار
نگفتی : از تو نبرم به صد جفا پیوند نگفتی : از نگردم جدا به صد آزار
خوشا به گوشهٔ خلوت نشستن من و تو نه داوری ز رقیب و نه رحمت از اغیار
من از تو دور چه دانم که خواب و راحت چیست چگونه است شکیب و چگونه است قرارها

مدحیہ قصاید کے علاوہ دو قصاید ایسے ہیں جن میں شکایت روزگار اور اپنی پریشانی احوال کے ساتھ شاعری کی مذمت کی ہے :

ای برادر ، بشنوی رمزی ز شعر و شاعری تاز ما مشتی گدا کس را بمردم نشمری (دیوان انوری ، ص ۲۹۷)

تا آمد از عدم به وجود اصل پیکرم جز غم نبود بهره ز چرخ ستمگر (دیوان انوری ، ص ۲۲۱)

ایک قصیدے میں تخلیق کائنات اور دوسرے میں توحید کے مسائل پر اظہار خیال کیا ہے ۔ دو مختصر قصاید میں ممدوح سے شراب کی درخواست کی ہے ۔

بعضی مؤرخین نے انوری کو حکیم انوری کے لقب سے یاد کیا ہے ۔ ایک تو اس لیے کہ وہ فلسفہ و حکمت کا ادراک رکھتا تھا ۔ دوسرے یہ کہ اس نے اپنی تلخ و شیرین زندگی میں بہت اتار چڑھاؤ دیکھے اور حوادث و تجارب زندگی سے سبق سیکھے ۔ چنانچہ متذکرہ صدر قصاید کے علاوہ مدحیہ قصاید کے ضمن میں بہت ہی سبق آموز باتیں کہی ہیں ۔ مثلاً قصیدہ میں سفر کے بارےمیں اس کے اشعار ملاحظہ کیجئے :

سفر مربی مردست و آستانهٔ جاه سفر خزانه مالست و اوستاد هنر
بشهر خویش درون کجا خطر بود مردم مکان خویش درون، بی بها بود گوهر
درخت اگر متحرك شدی ز جای بجای نه جور ارّه کشیدی و نی جفای تبر
در آن دیار که در چشم خلق خوار شوی سبك سفر کن ز آنجا ، برو بجای دگر

صنایع لفظی و معنوی کا استعمال

۱- حسن تعلیل

ای ز شرم جاه تو سر گشته اوج اندر فلك وی ز دست رشكِ تو نالنده موج اندر فرات

مبالغه

نعلی که بیفگند مرکب او برگوش فلك گوشوار باشد

عربی الفاظ کا استعمال

در مجرفه خراش مجلسش مکنون جبال و بحار باشد
چو اصطکاك قرع هوا از طریق صوت داد از رهِ صماخ دماغ مرا خبر

تشابیه

خورشید می اندر افق جام نکوتر چون لشکر خورشید به آفاق برآمد

چرغ دلِ من اگرچه گیر است با باز غمت کبوتر آمد

تجنیس

از می حشری به که در آرند به مجلس بر عقل چو از خواب خماری حشر آمد

تضاد و طباق

مرا سزد که بود گاه نظم مدحت تو بیاض روز و سیاهی شب و قلم محور

لف و نشر

زتف آتش دل و ز سر شكِ دیده شده لب چو قندش خشك و رخ چو ماهش تر

تکرار حروف

ای ترا کرده خداوند خدای متعال داده جود و خرد و جاه و جوانی و جمال

چہار عنصر لانے کا التزام / رعایت لفظی

آب چشم و آتشِ دل نزهت جان می برد همچو باد تند گاه از روی خاك اندر قفار

دو قصاید میں انوری کی وصفیہ شاعری میں بھی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ ایك قصیدے میں باغ و سرائے کی تعریف کی ہے اور دوسرے میں گھوڑے کی تعریف کی ہے (ص ۲۰۵) مؤخر الذکر کی توصیف میں اس نے باریك بینی ، خیال آفرینی اور ترکیب سازی اور تشبیہ سے کام لیا ہے ۔ چونکہ حاکم اعلی کا گھوڑا ہے اس لیے مبالغہ کا آنا لازم ٹھہرا ۔ چند ابیات نقل کیے جاتے ہیں .

ای زرین نعل و آهنین سم وی سوسن گوش و خیزران دم
ای پای صبا گرفته در گل با آتش تو چو ساق هیزم
سیر تو بگرد خط ناورد چون گرد سپهر سیر انجم
ره گم نکنی تو در تحرك چون گوی ز پای سرکنی گم

قطعہ نگاری

قطعات مختصر بھی ہیں اور طویل بھی ۔ مضامین کا تنوع ظاہر ہے ۔ قطعہ نگاری کا یہی بڑا فائدہ ہے ۔ جب کوئی مسئلہ یا معاملہ ذہن میں آیا یا حادثہ پیش آیا فوراً اس کے متعلق اپنا تأثر قلمبند کر لیا ۔ چند ایك مضامین نمایاں ہیں :

۱- ہجو و مطایبہ . ۲ - گلہ و شکوہ .
۳- حاجت برآری کیلئے درخواست . ۴ - اپنی پریشان حالی کا بیان .
۵- خرابیہائے معاشرت . ۶- پند و نصایح .

انوری کی معاشی حالت اچھی نہیں تھی جب وہ اپنی نگوں بختی کا احساس کرتا ہے تو زمانے کے سامنے شکایت کرتا ہے ۔ فلك و نجوم کی قدح و ذم کرتا ہے اور ان کو ہی

پریشان حالی کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے ۔ جب حالات سازگار نہیں ہوتے تو عزلت گزینی ، قناعت اور صبر و شکر کا مشورہ دیتا ہے ۔

ان قطعات سے انوری کے عصری معاشرے پر روشنی پڑتی ہے ۔ علوم و فنون کی بے قدری ، راگ بھانڈ کی قدر افزائی ، اخلاقی اقدار کا انحطاط اور عصمت و عفت کا زوال نمایاں ہے اس سلسلے میں اس کا ایك قطعه قابل یادداشت ہے :

ای خواجه مکن تا توانی طلب علم کندر طلب راتب هر روزه یمانی
شو مسخرگی پیشه کن و مطربی آموز تا داد خود از کمتر و مهتر بستانی

چند قطعات مدحیه میں ہیں جن سے اختصار سے تعریف و توصیف کرکے اپنی غرض بیان کی ہے اور دعا بھی دی ہے اس کے ہجویه قطعات تو فحش کی حدوں کو چھوتے ہیں۔

انوری کے وہ قطعات قابل قدر و تحسین ہیں ۔ جن میں پند و نصایح درج ہیں ۔ اور جن میں زندگی کے تجربات کو بیان کیا ہے اور اپنے معاشرے پر تبصرہ بھی کیا ہے ۔ مثلاً : اس نے اہل ہنر کی چار صفات بیان کی ہیں ۔

۱- سخاوت طبیعی . ۲- دل دوستان نیازاری . ۳- زبان را در بد گفتن نگاه دار.
۴- بد اگر عذر خواهد گناه او را فراموش کن .

آلودهٔ منت کسان کم شو تا یك شبه در وثاق تونانست
چندانکه مروّتست در دادن در نا ستدن هزار چندانست

غزل گوئی

انوری کے عہد میں،معلوم ہوتا ہے ۔ غزل کے وہی روایتی معنی مراد لیے جاتے ہیں جو بیان و بدیع کی کتابوں یا فرہنگوں میں درج ہیں ۔ یعنی عورتوں سے پیار محبت کی باتیں ، گلے شکوے ، ہجر و فراق کا اظہار ، وصل کی آرزو ، وغیرہ اور محبوب کے ظاھری محاسن کی تعریف ، محبوب کی بے اعتنائی اور جور و ستم وغیرہ ۔ انوری کی غزلیات کے بھی یہی موضوعات ہیں ۔ محبوب کی تعریف کیلئے پرانی تشابیه سے کام لیا گیا ہے . ان میں کوئی تازگی نہیں ۔ مثلاً کمان ابرو ، دام زلف ، قد سرو ، لعل شکر ، وغیرہ ۔

غزلوں میں اکثر محبوب کو مخاطب کیا ہے ۔ زبان سادہ و صریح ہے اور طرز تخاطب اور مکالمه لئے ہوئے ہے . گویا عاشق اپنی ذہنی و قلبی کیفیت بیان کر رہا ہے ۔ عموماً چھوٹی بحریں استعمال کی ہیں اور تغزل کا انداز قائم ہے ۔ نمونے کیلئے چند اشعار ملاحظه کیجئے :

ای دیر بدست آمده بس زود برفتی آتش زدی اندر من و چون زود برفتی

چون آرزوی تنگدلان دیر رسیدی   چون دوستی سنگدلان زود برفتی

ایک غزل ایسی ہے جس میں محبوب مجازی کے بجائے محبوب حقیقی بھی مخاطب ہو سکتا ہے ۔ وہ غزل یہ ہے :

بی مہر جمالِ تو دلی نیست   بی مہر ھوای تو گلی نیست
در دائرۂ جہان محدث   چون حادثۂ تو مشکلی نیست
در تو کہ رسد کہ در رہِ تو   جز منزلِ عجز منزلی نیست
در بحر تحیرّ تو پایاب   کی سود کند کہ ساحلی نیست

رباعی گوئی

انوری کی رباعیات میں چند موضوع زیادہ نمایاں ہیں :

۱- غزل کی طرح محبوب سے شکوہ اور غم ہجراں کی فریاد موجود ہے ۔
۲- اپنی بدحال اور پریشانی کا بیان ۔
۳- عیش و نشاط کی خواہش ۔

اب مثالیں دیکھیے ۔ اپنی بدحالی کا ذکر :

ما را بجز از نیاز ہیچ چیز نماند   در کیسۂ عقل فقد تمیز نماند
گہ گاہ بہ آب دیدہ دل خوش بودی   چندان بگریستم کہ آن نیز نماند

ذیل کی رباعی میں عمر خیام کی ان رباعیات کی جھلک نمایاں ہے جن میں اس نے تغییر مادہ اور انسان کے عبرتناک انجام کی طرف توجہ دلائی ہے مثلا :

بر ہر طرفی کہ لالہ زاری بودست   آن لالہ ز خون شہریاری بودست
ہر شاخ بنفشہ کزین زمین سر برزد   موییست کہ بر سیر نگاری بودست

خاقانی

خاقانی کا نام بدیل تھا ۔ اس نے یہ نام رکھنے کی جو وجہ بتائی ہے ۔ اس میں خودستائی کی بو آتی ہے ۔ بھلا نجار باپ کو کیا معلوم تھا کہ یہ بیٹا سنائی کا بدل ہوگا ۔ اس لئے اس نے بدیل نام رکھا :

بدل من آمدم اندر جہان سنائی را   بدین دلیل پدر نام من بدیل نہاد

خاقانی کا لقب افضل الدّین تھا ۔ باپ علی نجار ، دادا جولاھہ ، ماں نسطوری عیسائی تھی جو مسلمان ہوچکی تھی ۔ خاقانی کے والد بچپن میں ہی فوت ہو چکے تھے۔ ان کے چچا کافی الدّین عمر بن عثمان نے اس کی پرورش کی ۔ خاقانی نے چچا کی رہنمائی میں عربی ، طب ، ہیأت اور الہیات کا مطالعہ کیا ۔ ابو العلا گنجوی سے

شعر و سخن میں تربیت حاصل کی ۔ انہی کی بیٹی سے شادی ہوئی ۔ انہی کی معرفت خاقان اکبر منوچہر بن فریدون شروانشاہ کے دربار میں رسائی ہوئی ۔ خاقانی پہلے حقایقی تخلص کرتے تھے ۔ بعد میں خاقان کی مناسبت سے «خاقانی» تخلص کیا ۔

معلوم ہوتا ہے خاقانی شروانشاہ کے دربار سے مطمئن نہیں تھے نیشاپور میں سلطان سنجر کا عظیم الشان دربار تھا ۔ وہ خراسان جانا چاہتے تھے تا کہ وہاں کی شان و شوکت بھی دیکھیں لیکن جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی ۔ چنانچہ انہوں نے اشعار میں گلہ بھی کیا ۔

چه سبب سوی خراسان شدنم نگذارند   عندلیبم به گلستان شدنم نگذارند

خاقانی ایک مرتبہ خراسان کیلئے روانہ ہوئے ۔ خراسان پر غزوں کے حملے کی خبر پا کر وہیں سے واپس ہوئے اور قہستان گئے اور جلال الدّین بن قوام ابوالقاسم درگزینی وزیر سلطان محمّد بن محمود سلجوقی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قصیدہ پیش کیا ۔

خاقانی ۵۵۱ ھ کو حج کعبہ اور زیارت حرمین کیلئے روانہ ہوئے ۔ ھمدان پہنچے اور سلطان محمّد شاہ سلجوقی کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ ۵۵۲ ھ کو واپس آئے ۔ بغداد میں ٹھہرے اور خلیفہ عباسی مقتفی بامر اللّٰہ کی مدح میں قصیدہ پیش کیا ۔ وہ خاقانی کے علم و فضل سے متأثر ہو کر دبیر کا عہدہ دینا چاہتے تھے لیکن خاقانی نے قبول نہ کیا ۔ اصفہان کے راستے واپس ہوئے ۔ اصفہان کی توصیف میں قصیدہ لکھا۔ واپسی پر موصل پہنچے اورجمال الدّین محمّد موصلی کی خدمت میں حاضر ہوئے خاقانی نے دوسری مرتبہ عصمت الدّین دختر فریدون کی سفارش سے ۵۶۹ ھ کو حج پر گئے اور ۵۷۱ ھ کو واپس آئے ۔

خاقانی کی عائلی زندگی میں افسوسناک حوادث پیش آئے ۔ اس کا جوان بیٹا رشید الدّین فوت ہوا ۔ کچھ عرصہ بعد بہن اور پھر ماں بھی انتقال کر گئیں ۔ ایک اطمینان بخش چیز یہ تھی کہ اس کی بیٹی چچا کے بیٹے کیساتھ بیاہی گئی تھی ۔ خاقانی نے اپنے داماد امام الشارع وحید الدّین ابوالمفاخر عثمان بن کافی الدّین عمر کی مدح میں ترجیع بند لکھا ہے ۔ خاقانی درباداری سے الگ ہوکر گوشہ نشین ہونا چاہتے تھے ۔ حاسدوں نے شروانشاہ کے کان بھرے تھے کہ دربار کا شاعر دوسروں کے قصیدے لکھتا ہے ۔ خاقانی بیلقان چلے گئے ۔ بادشاہ کے حکم سے گرفتار ہو کر قلعۂ شابران میں قید ہوئے سات مہینے قید میں رہے ۔ آخر عظیم الروم عزالدولہ قیصر کی سفارش پر رہائی ملی ۔

خاقانی نے آخری ایاّم تبریز میں گزارے ۔ ۵۹۵ ھ میں فوت ہوئے اور مقبرۃ الشعراء میں دفن ہوئے ۔ انہوں نے اپنے حال پر خود تبصرہ کیا ہے :

عمرم همه ناکام شد از بیکاری کارم همه ناساز شد از بی یاری
ای یار، مگر تو کار من بگذاری ای چرخ ، مگر تو عمر من باز آری

تألیفات

۱- مثنوی تحفة العراقین
۲- دیوان : خاقانی کے دیوان میں قصاید ، غزلیات ، ترجیعات ، ترکیب بند ، رباعیات اور قصاید عربی شامل ہیں ۔
۳- ختم الغرائب : ایك نامکمل مثنوی ہے ۔ خدا ، خالق کائنات، انسان ، روح ، عقل ، نور ایمان ، ظلمت کفر ، عظمت آدم اور تخلیق کامل اس کے موضوعات میں سے ہیں ۔
۴- منشآت خاقانی : خاقانی کے چند مکتوبات پر مشتمل ہے ۔

خاقانی اپنے زمانے کے متداول علوم و فنون میں مہارت رکھتے تھے چنانچه انہوں نے خاص طور پر تحفة العراقین میں ان کے حصول کا ذکر کیا ہے ۔ مثلاً : نجوم، هیأت، طب ، فلسفه ، حکمت ، ریاضی ، موسیقی ، شطرنج ، فرد ، قرآن ، حدیث ، فقه ، آئین و رسوم وغیرہ ۔

خاقانی آزاد منش اور بلند ہمت تھا ۔ عزت نفس رکھتا تھا ۔ حرص و طمع سے دور رہنا چاہتا تھا . وہ عزلت و قناعت کو پسند کرتا تھا چنانچه وہ آخر شہری زندگی سے کنارہ کش ہوگیا ۔ طبعاً اسے مدیحه سرائی پسند نہیں تھی لیکن معاشی مجبوری کی وجه سے وہ نالایقوں کی بھی تعریف و توصیف کرنے پر مجبور تھا ۔ وہ فلسفه یونانی کو مذہب میں خلل کا باعث تصور کرتا تھا ۔ قرآن و حدیث کے ہوتے ہوئے اسے ضروری خیال نہیں کرتا تھا ۔ البته حکمت و دین کو جاننا ضروری سمجھتا تھا ۔

خاقانی صوفی منش تھا ۔ وہ صوفیگری کو پسند نہیں کرتا تھا . اس کا عقیدہ تھا اصل صوفی وہ ہے جو بے شك فاخر لباس پہنے لیکن اپنے نفس کو ہوا و ہوس کی آلودگیوں سے پاك رکھے ۔

قصیدہ سرائی

خاقانی قصیدہ سرا کی حیثیت سے زیادہ نأمور ہے ۔ کیونکه مدحیه مضامین کے علاوہ دوسرے موضوعات پر اظہار خیال کرنے کی گنجایش ہوتی ہے ۔ شروع میں تو وہ شروانشاہ کے دربار میں قصیدہ گو شاعر کی حیثیت سے ہی داخل ہوا ہوگا ۔ چنانچه اس کی لیاقت و استعداد اور علم و فضل کی وجه سے وہ قابل تعظیم و تکریم ٹھہرا اور معتمد علیه بنا ۔ چنانچه وہ ایك مرتبه سلطان ارسلان کے پاس ایلچی شروان کی حیثیت سے بھیجا گیا ۔ سلطان کی طرف سے اسے جاریه ، انعام میں ملی جس کا شکریه اس نے ایك نظم میں ادا

کیا ۔ بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ شروانشاہ کی درباداری سے مطمئن نہیں تھا ۔ شروانشاہ محدود علاقے کا حکمران تھا یا دل کا اتنا فیاض نہ تھا کہ وہ خاقانی کو بڑے بڑے انعام دیتا ۔

خاقانی کو اپنی فضیلت اور کمال سخنوری پر ناز تھا ۔ اور فخریہ اشعار کہنے سے نہیں چوکتا تھا ۔ اور اس کا خیال تھا کہ وہ شروان کی تنگنا میں قید ہے اور اپنی حیثیت کے مطابق انعام و اکرام نہیں پا رہا ۔ چنانچہ اس نے دوسرے ممدوحین کی بھی تلاش شروع کی اور دوسروں کیلئے بھی قصاید لکھے ۔ چنانچہ ، در شکر ایادی و انعام رئیس شمس الدّین والی ارجیش کیلئے کہے ہوئے اشعار موجود ہیں ۔ اسی طرح امیر یوسف عز الدّین سپہ سالار نے اسے غلام بھیجا جس کے شکرانے میں اس نے اشعار لکھے ۔ اصفھود کیالو اسپزکی مدح کی تو دو ہزار دینار انعام ملا۔اس کے شکریہ میں اشعار لکھے ہیں ۔ خراسان جانے کیلئے اس کی بی تابی اس کے قصاید سے ظاہر ہے۔ خاقانی اپنی شاعری پر فخر اور خود ستایش میں اشعار کہتا تھا ۔ جن سے اسکی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے ۔

نیست اقلیم سخن را بھتر از من پادشا   در جھان ملك سخنرانی مسلّم شد مرا
مریم بکر معانی را منم روح القدس   عالم ذکر معانی را منم فرمانروا
رشك نظم من خورد حسان ثابت را جگر   دست نثر من زند سحبان و ایل را قفا

شاعر مفلق منم خوان معانی مراست   ریزه خور خوان من عنصری و رودکی

خاقانی کو عموماً مشکل پسند قصیدہ گو کہا گیا ہے اور یہ بات صحیح بھی ہے ۔ وہ علمی فضیلت دکھانے کیلئے ان تمام علوم و فنون کی اصطلاحات اور تلمیحات استعمال کرتا ہے اور جب تك قاری یا سامع ان اصطلاحات سے آشنا نہ ہو مطالب و معانی تك نہیں پہنچ سکتا ۔ وہ اکثر طب، نجوم ، ہیأت ، الھیات ، تاریخ ، مذہب سے متعلق اصطلاحات استعمال کرتا ہے ۔ چونکہ وہ عالم ہے ، دقیق النظر ہے ، معانی کو تخیل میں لپیٹ کر پیش کرتا ہے ، تشبیہ و استعارات میں جدید و غریب لانے کی کوشش کرتا ہے ۔اس لیے کہیں کہیں مطالب مبہم ہو جاتے ہیں اوران کے سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے ، مثلا :

ابھام

چرخ در این کوی چیست حلقۂ درگاه راز   عقل در این خطه کیست شحنه راه فنا

تشابیہ غریب

شد گهر اندر گهر صفحۂ تیغ سحر   گره اندر گره حلقۂ درع سحاب

گنجلك بیان اور استعارۂ غریب

رخش بهرا بتافت بر سر صبح آفتاب رفت به چرب آخوری گنج روان در رکاب

دور از کار تلمیحات

بر آرد ز جیب فلك دست موسی زر سامری نقد میزان نماید
نه خورشید همخانۂ عیسی آمد چه معنی که معلول وحیران نماید

غیر واضح تصویریں

پنجۂ ساقی گرفت مرغ صراحی به دام ز آتش صبح اوفتاد دانۂ دلها بتاب
صبح چون پشت پلنگ کرد هوا را دو رنگ ماه چو شاخ گوزن روی نمود از حجاب

لیکن خاقانی کے سارے قصاید مشکل و مبهم نہیں۔ جہاں اسے دردِ دل اور شکایت زمانہ کہنے کا موقع ملا ہے ۔ جذبات و ہیجانات بیان کیے ہیں۔ یا رثاء و تعزیت کا اظہار کیا ہے ۔ وہاں اسلوب سادہ ، سہل اور رواں واضح و صریح ہے ، مثلاً قصاید کے مندرجہ ذیل اشعار :

چه سبب سوی خراسان شدنم نگذارند عندلیبم به گلستان شدنم نگذارند
آن مصر مملکت که تو دیدی خراب شد وان نیل مکرمت که شنیدی سراب شد
صبحگاہی سرِ خونین جگر بگشایند ژالۂ صبحدم از نرگس تر بگشایند

قصاید خاقانی میں مدحیہ مضامین کے علاوہ، توحید، نعت رسول ، شکایت روزگار ، نکوهش حسودان ، تعزیت اور پند و موعظت کے موضوعات پر طبع آزمائی کی گئی ہے ۔ اس کے مندرجہ ذیل چند قصاید معرکۃ الآرا شمار ہوتے ہیں اور جو امیر خسرو اور جامی جیسے بلند فکر شعرائے کیلئے بھی قابل تقلید رہے ہیں ۔

مرآۃ الصفا

دلِ من پیر تعلیم است و من طفل زبان دانش دمِ تسلیم سر عشر و خم زانو دبستانش

ایوان مدائن

هان ای دلِ عبرت بین با دیده نظر کن هان ایوان مدائن را آیینۂ عبرت دان

حبسیه

صبحدم چون کله بندد آه دود آسای من چون شفق در خون نشیندچشم خون بالای من

نزهة الاشباح

تا خیال کعبه نقش دیدۂ جان دیده اند دیده را از شوق کعبه زمزم افشان دیده اند

نعتیه در نزدیکی روضۂ مقدس

النبی النبی آرند خلایق به زبان امتی امتی از روضۂ غراً شنوند
از صریر در او چار ملایك به سه بعد پنج هنگام دم صور به یکجا شنوند

مذکورة الاسحار

یه قصیده مکّہ میں لکھا گیا اور ملك الوزرا ء جمال الدّین اصفهانی کی مدح بھی کی گئی جس نے تعمیر حرم میں حصّہ لیا ۔ خواص مکّہ نے اس قصیدے کو آب زر سے لکھا . اس کا مطلع یوں ہے ۔

صبح از حمایل فلك آهیخت خنجرش کیمخت کوه ادیم شد از خنجر زرش

مکّہ میں حرم کے اندر اور مدینه میں روضۂ منوره کے نزدیك جو قصاید لکھے ہیں ، ان میں خاص طور پر دل کا گداز موجود ہے ۔ اس نے بڑے سوز و اخلاص سے اپنے تأثرات کا اظہار کیا ہے ۔ کعبه سے رخصت ہوتے وقت ذیل کے اشعار سے جدائی کا دکھ ظاہر ہوتا ہے ۔

الوداع ای کعبه کاینك وقت هجران آمده دل تنوری گشته و زو دیده طوفان آمده
مصطفی کعبه است و مهر کتف او سنگ سیاه هر کس از بهر کف او زمزم افشان آمده

خاقانی کو صبح کی علامت بہت پسند ہے ۔ وه بہت سے قصاید میں تمہید کے طور پر صبح اور اس کی برکت و رحمت کا ذکر بڑے شوق سے کرتا ہے ۔ اس نے دو قصیدوں میں صبحگاه کو ردیف کے طور پر استعمال کیا ہے ، مثلا :

با را دلیست زلۂ خور خوان صبحگاه جانیست خاك جرعۂ مستان صبحگاه
یا بختیان همت و با پختگان درد راه هزار ساله بریدم به صبحگاه

خاقانی نے قصاید میں صنایع لفظی و معنوی کو بھی استعمال کیا ہے ۔ تشابیه ، استعارات اور تلمیحات تو کثرت سے ہیں ۔ ان کے علاوه مراعات لفظی اور تجانیس کا بھی خیال رکھتا ہے مثلاً : تجنیس :

بهر منال عیش ز دوران مثال پیش بهر مراد جسم به زندان مدار جان

مبالغه تو مدحیه قصیدے کی جان ہے ۔ شروانشاه کی مدح میں اس کی ایك مثال دیکھیے :

دائرۂ میم منوچهر از ثوابت برتر است آفرینش درمیانش نقطه ای بس بینوا

غزل گوئی

خاقانی کی غزل قصیدے سے بالکل مختلف ہے . زبان غزل کی تمام خوبیاں موجود ہیں. ساده ، رواں ، غنا آشنا،چھوٹی بحر میں ، واضح بیان ، موضوعات عشق و وصال ،

ہجر و محرومی ، شکوہ و شکایت ، شب و تاب دل عاشق ۔

غزل میں آ کر خاقانی شاید اپنا انداز خاص بھول گیا ہے ۔ نہ تشابیہ غریب و استعارات دور و بیگانہ ، نہ تلمیحات. مشکلہ، نہ اصطلاحات علمی و فنی ، نہ بیان میں گنجلك و الهام . محبوب کیلئے تمام روایتی تشابیہ ، ذیل کی غزل اس کا واضح نمونہ ہے :

به دو میگون لب و پسته دهنت   به سه بوس خوش و فندق شکنت
به زره پوش قد تیر وشت   به کمانکش مژهٔ تیغ زنت
به حریر تن و دیبای رخت   به ترنج بر و سیب ذقنت
به دو نرگس به دو سنبل به دو گل   نو بر سرو صنوبر فکنت
به نگین لب و طوق غیبت   این ز برگ گل و آن از سمنت
که مرا تا دل و جانست بجای   جای باشد بدل و جان منت

ایك اور غزل بھی قابل ملاحظه ہے :

دیدی که یار چون ز دل ما خبر نداشت   ما را شکار کرد و بیفکند و بر نداشت

غزل کا دوسرا موضوع محبوب مجازی کی بجائے محبوب حقیقی بھی ہے ۔ عشق سفلی کی بجائے عشق اصلی کی بھی باتیں کی ہیں :

عشق تو قضای آسمانیست   وصل تو بقای جاودانیست
در سایهٔ زلف تو دل من   همسایهٔ نور آسمانیست
عشق تو بجان خریدم ارچه   آتش همه جای رایگانیست

عشق کے ساتھ ساتھ عاشق کی تعریف :

عاشق آن نیست کو به بوی وصال   هستی خود به دلستان بخشد
عاشق آنست کو به ترك مراد   هر چه هستی است رایگان بخشد
دو جهان را دو شاخ گل داند   دسته بندد به دلستان بخشد

فقیر ، درویش بھی محبوب حقیقی کے عاشق ہیں ۔ جب عشق الهی سے سرشار ہوتے ہیں تو ان کی کایا پلٹ جاتی ہے وہ مراتب عالی حاصل کرتے ہیں ۔ دیدہ و دل سے علم و آگھی حاصل کرتے ہیں ۔ خاقانی نے ذیل کی غزل میں فقیر بادشاہوں کا ذکر کیا ہے .

آن ها که محققان راهند   در جامهٔ فقر پادشاهند
در رزم یلان پی نبردند   در بزم سرانِ بی کلاهند
کعبه صفتند و راه پیمای   باور کنی آسمان و ماهند
بر چرخ زنند خیمهٔ آه   هم خود به صفت میان آهند
مستان شبانه اند امّا   صاحب خبران صبحگاهند

عشق عقل کے ذریعے حاصل نہیں ہوتا ۔ خاقانی نے اس مطلب کو نہایت عمدہ مثالوں سے سمجھایا ہے :

بخرد رہِ عشق می پوئی به چراغ آفتاب می جوئی
تو هنوز ابجد خرد خوانی و ز معمای عشق می گویی
مرد کامی و عشق می ورزی در ز کامی و مشك می بویی .

عشق میں من و تو کا امتیاز مٹ جاتا ہے یعنی دوئی کا ختم ہوجانا کمال معرفت ہے خاقانی نے مندرجہ ذیل اشعار میں ، همه او ، ہو جانے کی طرف اشارہ کیا ہے :

صورت من همه او شد صفت من همه او لاجرم من و من نشنود اندر سخنم
نزنم هیچ دری تام نگویند که کیست چون بگویند مرا باید گفتن که منم

غزل کا ایك موضوع شراب پینا اور دادعیش دینا ہے ۔ خاقانی بھی قائل ہے کہ شراب سے غم فراموش ہوتا ہے. ذیل کی غزل میں اعلانیہ شراب لانے کی تمنا کی ہے :

سر مستم و تشنه ، آب در ده آن آتشگون گلاب در ده
در جملهٔ جام آسمان رنگ آن دختر آفتاب در ده

خاقانی نے اپنی غزل میں اپنے احوال و کوائف پر بھی تبصرہ کیا ہے ۔ اور زمانے کی بے التفاتی اور اپنی زبوں حالی کی بات کی ہے ۔ نمونے کیلئے ذیل کے اشعار کافی ہیں :

در جهان هیچ سینه بی غم نیست غمگساری ز کیمیا کم نیست
دم سرد از دهان برآه جگر باز گردان که یار همدم نیست

خاقانی کی غزل میں تکنیکی اور فنی خوبیاں بھی ہیں . بہت اچھی اچھی تشابیہ آئی ہیں . نئی تراکیب بھی نظر آتی ہیں ۔ چونکہ خاقانی کو زبان پر تسلط حاصل ہے ۔ اس لیے اکثر غزلوں میں قافیہ کے ساتھ ردیف بھی لائی گئی ہے ۔ طبیعت میں اتنی روانی ہے کہ شعر پر شعر لکھتے چلے جاتے ہیں ۔ غزل کی حد بندی بھی منظور نہیں ۔ ایك غزل تیئس اشعار پر مشتمل ہے ۔ ایك غزل کے ہر مصراع میں لفظ بنفشه ، ایك غزل کے ہر مصراع میں شگوفه استعمال کیا ہے ۔ شعر کی آرایش و پیرایش کیلئے صنایع لفظی و معنوی لانے کا بھی اہتمام کیا ہے ۔ مثلاً :

تضاد تیره زلفا بادهٔ روشن کجاست دیر و صلا رطلِ مرد افگن کجاست

تجنیس در ازل بر جان خاقانی نهادی مهر مهر

تراکیب نو دیر وصل ۔ جام مرد افگن ۔ هزینهٔ مرهم ۔ دریا ضمیر .

مثالیه

لیکن بدان دیار نیابم نه ترس آنك پُر آبهاست در ره و من سگ گزیده ام

مضمون آفرینی

هر کجا پای نہی گل روید تا ندانم ز کجا آمدہ ای
مستی و شوخی و عالم سوزی چہ بگویم کہ چہا آمدہ ای

متفرق اشعار

قصاید ، غزلیات ، رباعیات ، ترجیعات کے علاوہ مرتب دیوان نے متفرق اشعار بھی جمع کیے ہیں ۔ ان میں زیادہ تر قطعات ہیں ۔ باقی ماندہ مختصر قصاید ، غزلیات اور منظومات ہیں. جن میں پند و حکمت ، حماسہ ، شکر ، استغنای طبع ، ہجو ، مرثیہ اور ذاتی احوال و کوائف سے متعلق اشعار موجود ہیں ۔ ان اشعار سے بھی خاقانی کی زندگی اور اس کی گوناگونی طبع پر روشنی پڑتی ہے ۔

خاقانی ایک جگہ لکھتے ہیں :

در همه دیوان من دو هجو نه بینی در همه گلزار خلد خار نیابی

ممکن ہے جب یہ شعر لکھا ہو ، اس وقت تو ہجو نہ لکھی ہو لیکن اب انہی متفرق اشعار میں ہجو ، نکوھش اور مذمت موجود ہے ۔

ان متفرق منظومات میں بیٹا ، بیٹی اور چچا کے علاوہ شعراء ، علماء ، وزراء اور دوسرے برآوردہ اشخاص کے مرثیے بھی شامل ہیں ۔ ان قطعات یا قصاید میں صحیح معنوں میں شاعر کا درد محسوس ہوتا ہے شاعر کے حقیقی جذبات و تأثرات کی عکاسی ہوتی ہے جو حقیقی شاعری ہے ۔ حبسیہ نظموں میں بھی شاعر کا اصلی دکھ اور کرب نمایاں ہے ۔ اس لیے یہ نظمیں ادب عالیہ میں شمار ہوتی ہیں ۔

تحفة العراقین

یہ مثنوی بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض مقصور یا محذوف میں ہے ۔ ۵۵۱/۵۵۲ ھ میں تألیف ہوئی . کچھ حصّہ حج روانہ ہونے سے پہلے لکھنا شروع کر دیا تھا ۔ مثلاً در اشتیاق کعبہ معظمہ ۔ اشعار کی کل تعداد ۳۱۵۸ ہے اور صدر الوزراء جمال الدّین موصلی سے منسوب ہے ۔ خاقانی نے یہ مثنوی چالیس دنوں میں مکمل کی ۔

مثنوی کو سات مقالات میں تقسیم کیا ہے اور ہر مقالے میں کئی فصول ہیں ۔ اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے ۔

مقالہ اوّل : تخلیق افلاک و کائنات . آفتاب کی مدحت و مذمت ۔ نعت خاتم الانبیاء پر مشتمل ہے ۔

مقالۂ دوم : سفر بہ قہستان ، تعریف قلعہ و شکار گاہ سلطان ، ذکر اولیاء

مدح جمال الدّین موصلی اور اس سے سؤال و جواب جس میں خاقانی نے اپنے احوال و کوائف بیان کیے ۔ مدح اور انگوٹھی کا انعام ۔ شروان میں بادشاہ نے وہ انگوٹھی طلب کی ۔ خضر سے ملاقات ۔ اور اس سے مکالمہ ۔ حضرت رسالت سے خطاب اور ذکر معراج ، صفت براق اور راہ معراج ۔

مقالہ سوم : لشکرگاہ سلطانی سے ھمدان میں آمد ۔ شہر ، سادات ، حافظان و مدرسان ، قضاۃ و ائمہ کی تعریف و توصیف ۔ ورود بہ بغداد ، شہر ، دجلہ ، حرم خلیفہ مقتفی بامر اللہ ، علماء کا ذکر ۔

مقالۂ چہارم : مشہد امیر المؤمنین کی تعریف : صحرا اور اونٹوں کا ذکر ۔ احرامگاہ ، عرفات، جبل الرحمۃ ، مزدلفہ ، جمرہ ، منی ، مکّہ معظمہ ، کعبہ ، حجر الاسود ، زمزم ، صفا و مروہ ، عمرہ کے متعلق تأثرات ۔

مقالۂ پنجم : صفت کعبہ و خطاب بہ کعبہ (ص ۱۳۳- ۱۴۱)

مقالہ ششم : صفت مدینہ ، روضۂ مطہرہ ، نعت و خطاب بہ حضرت رسالت ، استغاثہ و استعانت ۔ حسب حال خود .

مقالۂ ھفتم : صفت شام و موصل ، مدح صدر الوزراء ، جمال الدّین موصلی ، مدح شیخ الشیوخ امام رضی الدّین غزالی ، حسب و نسب خود ، باپ ، ماں ، دادا ، چچا اور اس کے بیٹے کی تعریف اور ان کی خدمات ، مدح شرف الدّین محمّد مظہر العلوی ، نکوھش دشمنان ، ھجو ابو العلا گنجوی ، مدح محمّد خجندی ، مدح عز الدّین محمّد قصار ، مدح تاج الدّین شیبانی مدح رشید الدّین ابوبکر ۔

تحفۃ العراقین ایک طرح کا سفرنامہ ہے ۔ اس میں خاص طور پر ھمدان ، بغداد ، کوفہ ، مکّہ ، مدینہ اور موصل کے احوال و کوائف اور برگزیدہ علماء ، وزراء اور سلاطین کا ذکر کیا ہے ۔ اور ان کی تعریف میں قصاید لکھے ہیں ۔ اس زمانے کی دینی اور معاشرتی زندگی پر روشنی پڑتی ہے ۔ خاقانی کے زمانے میں سفر حج کی مشکلات اور مناسک حج ادا کرنے سے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں ۔ خاقانی کی اپنی زندگی کے متعلق مفصل کوائف معلوم ہوتے ہیں ۔ خاقانی کی عالی ظرفی ہے کہ اس نے اپنے خاندان کی حقیقت کو نہیں چھپایا . نجار باپ ، جولاھہ دادا ، طباخ ماں کا ذکر کسی معاشرتی جھجھک کے بغیر اعلانیہ کیا ہے .

اسی مثنوی سے زیارت حرمین کیلئے خاقانی کا جذب و شوق ظاہر ہوتا ہے. حضرت رسالت پناہ کے حضور استغاثت و استعانت اس کے عجز و نیاز اور درد و خلوص اور محبت

و احترام کا اظہار ہوتا ہے ۔

مثنوی میں بعض مطالب کی تکرار ہے ۔ کبھی اجمال ہے کبھی تفصیل ہے جو ترتیب و تہویب اور مطالب کی تحکیم کیلئے مفید نہیں ۔ دوسرے مقالے میں جمال الدّین محمّد موصلی کے ساتھ ملاقات میں اپنے اب و جد کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں ۔ بعد میں ساتویں مقالے میں دوبارہ زیادہ تفصیل دی ہے ۔ مدحیہ ابیات کے ساتھ احوال و کوائف بتائے ہیں اور جمال الدّین محمّد کی مدح میں تین چار مرتبہ طبع آزمائی کی ہے ۔

ایسی مثنوی میں جو واقعات پرمبنی ہو ۔ تین چار مرتبہ آفتاب کی مدح و ذم اور خطاب اور خضر سے ملاقات اور مکالمات زاید معلوم ہوتے ہیں ۔

مثنوی جو ایک مبارک سفرنامہ حج ہے ۔ اس میں مختلف بزرگ اشخاص کی توصیف و تمجید کی ہے ۔ اس میں اپنے استاد ابوالعلاء گنجوی کی مذموم ہجو داخل کرنا بالکل نامناسب ہے ۔

مثنوی کا اسلوب قصاید کی طرح ہے ۔ اکثر وہی محاورات و امثال ہیں ۔ اور الفاظ و تراکیب کی ساخت بھی وہی ہے ، علوم و فنون کی اصطلاحات کا استعمال بھی خاقانی کا امتیازی نشان ہے ۔ مشکل پسندی اور دشوار نویسی سبک عراقی کا ایک جزو ہے ، ایک صاحب علم و فضل ہی تمام مطالب کو درک کر سکتا ہے ۔

خاقانی وصفیہ بیان میں کمال مہارت رکھتے ہیں. ان کی نگاہ جزئیات تک جاتی ہے ۔ وہ اپنے علم کے بل پر تشبیہات و تمثیلات سے مضمون کو زمین سے آسمان تک پہنچا دیتے ہیں .علوم و فنون اور تاریخ سے لی ہوئی تلمیحات آدمی کو دم بخود کر دیتی ہیں۔ اس مثنوی میں چونکہ شاعر کی عقیدت شامل ہے اس لئے تعریف و توصیف میں مبالغہ سے کام لیتا ہے ۔ مثلا یہ دو مثالیں دیکھیے :

نخل خرما کی تعریف

نخلش ہمہ دست کشت جبریل　　گشتی دہ نخل او سرافیل
تخمش بہ گلاب پروریدہ　　آدم ز بہشت آوریدہ
نخلش بہ عمود صبح مانند　　چو درع سحاب بند در بند

مدینہ منورہ کی تعریف

آن مقصد ہودج رسالت　　آن مہبط موکب جلالت
بیت اشرف اختر سخارا　　دارالکتب آیت وفا را
دہرش بہ جنان فرو نہادہ　　آن روضۂ جان درو نہادہ
جز دیدۂ شش جہت مخوانش　　آن جوہر نور درمیانش

چون نقطۂ باد نسیم ذاتش   سه عالم علم در صفاتش

نظامی گنجوی (۱)

نظامی کا نام الیاس ، باپ دادا کا نام یوسف بن زکی ہے ۔اس کی ماں کرد قبیلہ سے تعلق رکھتی تھی ۔ ماموں کا نام خواجہ عمر آتا ہے ۔

نظامی نے تین شادیاں کیں ۔ایک کی وفات کے بعد دوسری شادی کی ۔ان میں سے ایک اسے بہت عزیز تھی ۔ یہ کنیز تھی جو فخر الدّین بہرامشاہ بادشاہ ارزنجان نے عطا کی تھی . اس میں سے محمّد نامی بیٹا پیدا ہوا ۔ خسرو شیرین کے اختتام پر اس کی عمر سات سال تھی ۔ لیلی و مجنون کے آغاز میں چودہ سال اور ھفت پیکر کے آغاز میں اٹھارہ انیس سال تھی ۔ اقبالنامہ کے اختتام پر نام لیے بغیر کہا ہے کہ بیٹے کو نئی تصنیف دے کر بادشاہ ملک عزالدّین کی خدمت میں بھیج رہا ہوں ۔

نظامی گنجہ میں پیدا ہوئے ۔ان کے اب و جد عراقی الاصل تھے . نظامی نے ساری عمر گنجہ میں گزاری ۔ایک مرتبہ قزل ارسلان کی خواہش پر اس سے ملاقات کیلئے گئے . تاریخ ولادت ۵۴۰ اور ۵۴۲ ھ کے درمیان قیاس کی جاتی ہے ۔ تاریخ وفات ۵۹۹ اور ۶۰۲ ھ کے درمیان واقع ہوئی ۔

نظامی علوم عقلی و نقلی میں دسترس رکھتے تھے تصوّف و عرفان سے بھی بھرہ ور تھے ۔ فارسی ، عربی ادبی علوم میں بھی مہارت رکھتے تھے ۔

نظامی اصول دین کے نقطۂ نظر سے اشاعرہ کے پیرو نظر آتے ہیں نہ کہ معتزلہ کے ۔ نظامی برگزیدہ اخلاق کے مالك تھے ۔ان کے تمام کلام میں رکیك اور ہجو و ہزل آمیز جملہ نہیں ملتا ۔

نظامی نے ساری عمر تقوی ، قناعت اور عزلت میں گزاری ، درباروں سے تعلق نہیں رکھا اور نہ مدحیہ قصاید لکھے . سلاطین وقت نے خود خواہش کی اور ان کی فرمایش پر مثنویاں لکھیں ۔

بڑے بڑے شعراء نے فن شعر اور داستان سرائی میں نظامی کی فضیلت کا اعتراف کیا ہے ۔ نظامی نے اپنے متعلق کہا ہے :

۱- تفصیل کے لئے دیکھیئے : علی اکبر شہابی ، نظامی، شاعر داستانسرا، تہران ۔وحید دستگردی ، گنجینۂ گنجوی ، تہران ، چاپ دوم ۱۳۳۵ ھ ش . دیوان قصاید و غزلیات نظامی گنجوی ، مرتبۂ سعید نفیسی ، تہران ، ۱۳۳۸ ھ ش ، مقدمہ .

منم سرو پیرای باغ سخن به خدمت کمر بسته چو سرو بن
سخن چون گرفت استقامت به من اقامت کند تا قیامت به من
همه خوشه چین اند و من دانه کار همه خانه پُر است و من خانه دار

بعض ناقدین کی آراء ذیل میں درج کی جاتی ہیں :

علی قلی واله داغستانی نے ریاض الشعرا میں کہا ہے :

شیخ نظامی امام این فن است ، ازان جهت که هر قصه را در بحری که شایان نظامی آن بود ، به کمال شایستگی و پختگی و عذوبت و سلاست و صنایع و بدایع که ما فوق آن متصور نیست ، ادا فرموده ۔

خسرو نے فرمایا ہے :

نظم نظامی به لطافت چو دُر و ز در او سر بسر آفاق پر
پخته ازو شد چو معانی تمام خام بود پختن سودای خام

حافظ نے نظامی کے بارے میں اس طرح کہا ہے :

ز نظم نظامی که چرخ کهن ندارد چو او هیچ زیبا سخن
بیارم به تضمین سه بیت متین که نزد خرد به ز در ثمین

سعدی ، رومی اور حافظ نے نظامی کے بعض اشعار کو زیر نظر رکھا ہے ۔ بعض مصرعوں کو تضمین کیا ہے یا ان کے کلام کو اپنا لیا ہے ۔

تصانیف :

۱- مخزن الاسرار

اس مثنوی کے ابیات کی کل تعداد ۲۲۶۰ ہے اور بحر سریع مطوی موقوف(مفتعلن مفتعلن فاعلان) میں لکھی گئی ہے ۔ اس کی تاریخ تألیف ۵۷۰ ھ ہے اور ملك فخرالدّین بهرامشاہ بادشاہ ارزنجان کے نام سے منسوب ہوئی ، جس نے پانچ ہزار دینار اور پانچ عمدہ خچر انعام میں دیے ۔

مشمولات : ستایش باری تعالی ، نعت رسول (۴ نعتیں) . معراجنامه ، مدح فخر الدّین بهرامشاہ ، تألیف کتاب ، فضیلت سخن و سخنور ، باز جستن دل ۔ اس کو دو خلوتوں میں تقسیم کیا ہے : خلوت اوّل میں پھولوں کی تعریف کرکے عالم روحانی میں دل تلاش کرتے ہیں ۔ خلوت دوم میں دل کی بازیابی گویا شب تاریك میں آب حیات پانا ہے .

ان دو فصلوں کے بعد بیس مقامات اور بیس کہانیاں بیان کی ہیں . جن کے عنوان یہ ہیں .

۱- آدم و ترک دنیا ۔ ۲- محافظتِ عدل و انصاف ۔
۳- در حوادث عالم و انقلاب آدم ۔ ۴- در حق رعایت پادشاهان بر رعایا ۔
۵- در عمر آدمی و اختلاف احوال او ۔ ۶- در ایجاد موجودات ۔
۷- در بزرگواری آدمی ۔ ۸- در سبق آفرینش ۔
۹- در شناخت مرتبۂ خویش ۔ ۱۰- در علامات آخر الزمان ۔
۱۱- در وداع این نظام ۔ ۱۲- در تجرید از علایق ۔
۱۳- در مشقت منزل دنیا ۔ ۱۴- در بیداد گری راست کرداری ۔
۱۵- در حقیقت آدمی و تفضیل او ۔ ۱۶- در عاقبت اندیشی ۔
۱۷- در خلوت و ریاضت ۔ ۱۸- در بیوفائی اہل روزگار ۔
۱۹- در شکایت مدعیان زمانه ۔ ۲۰- در شکایت از متعصبان ۔ در خاتمه کتاب ۔

یہ کتاب گنجینۂ نصایح و اخلاق اور تہذیب و تربیت کیلئے تحفہ ہے ۔

۲- خسرو و شیرین

اس مثنوی میں کل ۶۵۰۰ - ۷۷۰۰ بیت ہیں ۔ یہ مثنوی بحر ہزج مسدس مقصور اور وزن مفاعیلن مفاعیلن فعول میں کہی گئی ہے ۔ اور ۵۷۶ سے ۵۸۷ ھ کو مکمل ہوئی ۔ معمول کے مطابق شروع میں توحید باری، نعت رسول ، سبب تألیف ، مدح ممدوحین ہے۔ اس میں تین سلجوقی بادشاہوں کی تعریف کی ہے ۔

۱- طغرل بن ارسلان بادشاہ سلجوق ، عراق و ہمدان کا حکمران تھا انتظام سلطنت کیلئے اس کے معاون دو چچا تھے ۔

۲- اتابك شمس الدّین محمّد ایلدگز ۔ ملقب بہ جہان پہلوان (۵۶۸ - ۵۸۱/۵۸۲ ھ) ۔

۳- اتابك قزل ارسلان بن ایلدگز حکمران آذربائیجان (۵۸۱- ۵۸۷ ھ) ۔

یہ مثنوی آخر قزل ارسلان کے نام منسوب ہوئی ۔ نظامی بادشاہ کی دعوت پر دربار میں حاضر ہوئے ۔ بادشاہ نے پہلو میں جگہ دی اور انعام کے طور پر گاؤں حمدونیاں بطور وسیلۂ معاش عطا کیا ۔ مدح کے آخر میں قزل ارسلان کے بیٹے اتابك نصرة الدین ابوبکر محمّد (۵۸۷-۶۰۷) کی تعریف کی ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ مثنوی ۵۸۴ میں مکمل ہوئی ۔ مدح کے بعد عشق اور سخن پر بحث کی ہے ۔ عشق کے متعلق کہا ہے :

کسی کز عشق شد خالی مرده است گرش صد جان بود بی عشق مرده است

اصل قصّہ خسرو پرویز اور شیریں کی والہانہ محبت ہے ۔ کوہ ارمنستان میں خسرو اور شیریں ایك دوسرے کی تصویر دیکھ کر فریفتہ ہوجاتے ہیں ۔ خسرو اپنے ندیم شاپور

کے ذریعے نامه و پیام بھیجتا ہے اور شیریں محل میں آجاتی ہے نظامی نے شریں کا کردار اجاگر کرنے کیلئے بہت سی مجالس عیش و نشاط اور خلوت و زفاف آراسته کی ہیں اور راز و نیاز کی باتیں قلمبند کی ہیں ۔ خسرو اور ملکه ایران مریم کی وفات پر خسرو کا بیٹا شیرویه الزام لگاتا ہے که شیریں نے خود ملکه عظمی بننے کیلئے مریم کو زہر دے کر ہلاك کیا ہے ۔ شیرویه خود اس سے شادی کرنا چاہتا ہے . شیریں نے درخواست کی که پہلے اسے دخمه خسرو کو دیکھنے کی اجازت دی جائے ۔ شیریں نے خسرو کے رخسار پر رخسار رکھ کر زہر کھا لیا اور وہیں جان دے دی اور وفاداری کا حق ادا کر دیا ۔

ضمناً فرہاد اور شیریں کی داستان محبت کا بھی ذکر ہے . فرہاد معمار و مہندس تھا ۔ اس نے چراگاہ سے سرپوش نہر بنا کر قصر شیریں تك دودھ پہنچانے کا ذریعه مہیا کیا . وہ بیستون میں حجاری اور کنده کاری میں مصروف تھا که شیریں کی جھوٹی خبر مرگ پر تیشه مار کر خودکشی کرلی ۔

خسرو پرویز کے دربار میں رسول اکرم (ص) کے دعوت اسلام کے پیام لانے کا بھی بیان ہے ۔ شیریں نے خسرو کو اسلام قبول کرنے کا مشوره دیا ۔

یه مثنوی نظامی کی بہترین عشقیه مثنوی شمار ہوتی ہے ۔

۳- لیلی و مجنون

لیلی و مجنوں کی عشقیه داستان پر مبنی ہے ۔ بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض / مفعول مفاعلن فعولن میں لکھی گئی ۔ یه مثنوی تقریباً ۵۱۰۰ بیت پر مشتمل ہے اور چار مہینوں میں مکمل ہوئی ۔ سال تألیف ۵۸۴ ھ ہے. شروانشاه اخستان بن منوچہر حاکم شروان کی فرمایش پر لکھی گئی.مشمولات میں ستایش خداوند . نعت و منقبت پیغمبر ۔ دربارۂ نیاکان و اجداد خود ۔ قصّه لیلی و مجنوں کے متعلق خیال ہے که یه واقعی نہیں بلکه خیالی ہے لیکن لیلی و مجنوں کے اب و جد اور قبیلوں کے نام بھی دئے ہیں ۔ مجنوں یعنی قیس بن ملوح بن مزاحم ۔ لیلی دختر سعد بن محمّد بن ربیعه ، دونوں بچپن میں اکٹھے پڑھتے اور کھیلتے رہے ۔ اور ایك دوسرے سے پیار کرتے رہے ۔ جوان ہوئے تو لیلی پردے میں چلی گئی ۔ قیس ہجر میں وارسته و شیدا ہوگیا ۔ قبایل کی باہم دشمنی کی وجه سے شادی ممکن نه ہو سکی ۔ قیس نے غم و اندوه میں جان دے دی .

ضمناً عشق اور شعر پر بھی اظہار خیال کیا ہے ۔ عشق کے متعلق کہا ہے :

عشق غیر از شہوت و ہوس است :

من قوت از عشق می پذیرم گرمیرد عشق من میرم
پروردۂ عشق شد سرشتم جز عشق مباد سر نوشتم

آن دل که بود ز عشق خالی سیلاب غمش برد ز حالی

شعر کے متعلق کہا ہے :

در شعر مپیچ و در فن او چون اکذب اوست احسن او

چونکہ بہ قصّہ دشت و بیابان کی سرزمین سے متعلق تھا ۔ اس لیے مناظر فطرت اور مجالس عیش و نشاط سجانے کا موقع نہیں ملا ۔

۴- هفت گنبد یا هفت پیکر

یہ مثنوی بحر خفیف مخبون مقصور (فاعلاتن مفاعلن فعلان) میں ہے ۔ کل ۵۱۳۶/ ۵۶۰۰ بیت ۔ سال اختتام ۵۹۳ ھ علاء الدّین کرپ ارسلان حاکم مراغہ کی فرمایش پر منظوم کی ۔

مشمولات : حمد و ستایش باری تعالی ، نعت رسول ، مدح کرپ ارسلان ، در مدح سخن و نصیحت بہ فرزند ، مثنوی کا خاکہ یہ ہے کہ بہرام گور بادشاہ ساسانی نے سات محل یا سات گنبد بنوائے تھے جن میں سات ملکوں کی شاہزادیاں رہتی تھی . وہ ہر روز ایک کے ساتھ ایک محل میں جاتا اور شاہزادی اپنی داستاں سناتی . سات ستاروں کی مناسبت سے سات محل تعمیر کرائے . اور انھی کی مناسبت سے سات رنگوں سے سجائے ۔

دقیق مطالب ، اشارات فلسفی اور مجالس عیش و سرور کے وصفیہ بیانات کی وجہ سے یہ مثنوی درجۂ اول کی مثنوی شمار ہوتی ہے ۔

حکیمانہ افکار کے چند نمونے یہ ہیں ۔

ستارے انسان کی خوش بختی و بد بختی پر اثر انداز نہیں ہوتے ۔

آفرینش آدم کھانے پینے کیلئے نہیں بلکہ علم حاصل کرنے اور سمجھنے کیلئے ہے ۔ انسان کو چاہیے کہ بلند فکر ہو ۔

۵- اسکندر نامہ

کتاب کے دو حصّے ہیں ۔ ۱- شرفنامہ ۔ ۲- اقبالنامہ / خردنامہ ۔

دونوں حصّے اتابک اعظم ملک نصرة الدّین ابوبکر سلجوقی فرزند اتابک محمّد جھان پہلوان کے نام منسوب ہیں ۔ اقبالنامہ میں ملک عزالدّین مسعود بن ملک نصرة الدّین سلجوقی کی بھی تعریف کی ہے ۔ پہلے کو سکندرنامہ بری اور دوسرے کو سکندر نامہ بحری بھی کہتے ہیں کیونکہ ایک میں خشکی اور دوسرے میں سمندر کے سفروں کا ذکر ہے ۔

یہ مثنوی بحر متقارب مثمن مقصور میں فعولن فعولن فعولن فعول کے وزن میں ہے ۔ شرفنامہ میں ۶۸۵۵/ ۷۱۰۰ اور اقبالنامہ میں ۳۷۸۰ ابیات ہیں . اقبالنامہ ۵۹۷ ھ

میں مکمل ہوا ۔

شرفنامہ میں سکندر مقدونی کی فتوحات کا ذکر ہے ۔ اقبالنامہ میں سکندر کو سکندر ذوالقرنین کے مثل قرار دے کر چین تک پہچنے ، دیوار چین بنانے اور ظلمات میں آب حیات حاصل کرنے کے واقعات کا ذکر ہے ۔

سکندر نامہ میں فلاسفہ یونان ، سقراط ، افلاطون، ارسطو، بلیناس ، فرفوریوی ، ہرمس کے عقاید بیان کیے ہیں . اور خردنامہ سقراط ، خردنامہ ارسطو ، اور خرد نامہ افلاطون منظوم کیا ہے ۔

حکیمانہ نصایح کے علاوہ . آفرینش جھان ، روح ، خودشناسی ، خدا شناسی ، ماہیت خواب اور چشم بد وغیرہ جیسے علمی و فلسفیانہ موضوعات پر بحث کی ہے ۔

پند و نصایح کے اعتبار سے نظامی کی اپنی نگاہ میں سکندرنامہ گران بہا مثنوی ہے ۔

مثنوی سرائی

نظامی کو مثنوی نگار کی حیثیت سے متعارف کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اس کی ہر مثنوی کا تحلیل و تجزیہ کرکے اس کے فضایل و نقایص کو اجاگر کیا جائے ۔ تقریباً تمام ناقدین ادب متفق اللفظ ہیں کہ نظامی مثنوی نگاری میں بے نظیر ہے ۔ بعد کے جلیل القدر شعراء نے ان کی تقلید میں مثنویاں لکھ کر گویا زبان پر تسلط اور شعری استعداد کا سکہ جمانے کی کوشش کی ہے . ان شعراء میں امیر خسرو ، خواجو کرمانی ، عبدالرحمن جامی ، زلالی خوانساری ، عراقی ، فیضی وغیرہ بہت نامور ہیں جنھوں نے خمسۂ نظامی کا تتبع کیا ہے ۔ اساتذۂ فن کا خیال ہے ۔ کہ شاید ہی کوئی شاعر اس سے بہتر کہہ سکا ہوگا .

ہم ذیل میں مجموعی طور پر خمسۂ نظامی کی خصوصیات کا تعارف پیش کرتے ہیں ۔

اگر نظامی کی پہلی مثنوی مخزن الاسرار کا سال تألیف ۵۸۱ ھ مان لیا جائے اور سکندر نامہ کا سال تألیف ۵۹۷ ھ تو معلوم ہوتا ہے ۔ کہ نظامی کی مثنوی نگاری کی عمر تقریباً بیس سال ہوتی ہے ۔ سال ولادت ۵۴۰ ھ کے آس پاس ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ نظامی نے پختہ عمر میں اور اپنے تمام حاصل کردہ علوم و فنون کے بل پر مثنوی لکھنے کی ابتدا کی ۔ عزلت و فراغت سے کلام کی آرایش و پیدایش میں وقت صرف کیا اور علم و حکمت اور تجارب زندگی سے مالا مال نصایح و نکات مثنویوں میں شامل کیے ۔

چونکہ ان کی طبیعت میں ابتکار و اختراع کی استعداد تھی ۔ اس لئے کلام میں

جدت و ندرت کو شیوۂ اظہار بنایا ۔ مثنوی میں بعض ایسی چیزیں داخل کیں جو اوّلیت کا درجہ رکھتی ہیں . مثلاً :

۱- مخزن الاسرار اور ہفت پیکر کیلئے نئی بحریں اختیار کیں ۔

۲- مخزن الاسرار میں رنگ رنگ سے پانچ نعتیں لکھیں ۔

۳- شرفنامہ میں ساقی نامہ ، لکھنے کا آغاز کیا ۔

۴- اقبالنامہ میں مغنی نامہ لکھنے کا نیا طریقہ رائج کیا ۔

۵- اقبالنامہ میں فلسفیانہ مباحث کو فارسی نظم میں لکھا ۔

نظامی نے اپنے زمانے میں مروّج ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو آجکل متروک ہیں۔ اس لیے بعض اشعار کے مطالب سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے ۔ وحید دستگردی نے گنجینۂ گنجوی میں ان الفاظ کی پوری فرہنگ ترتیب دی ہے ۔ علی اکبر شہابی نے بھی ہر مثنوی کے تعارف کے آخر میں قدیم الفاظ کے معانی لکھے ہیں ۔

مخزن الاسرار اخلاقی و عرفانی مثنوی ہے ۔ نظامی نے دوسری عشقیہ ، بزمیہ اور رزمیہ مثنویوں میں موقع و محل کی مناسبت سے فلسفہ و حکمت و اخلاق کے ایسے جواہر آبدار شامل کیے ہیں جو ضرب الامثال کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں ۔ اور زبانزد خلایق ہیں ۔ مثلاً چند ایک یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

کس نگوید که دوغ من ترش است، نیست بالاتر از سیاهی رنگی تیر باید که بر نشانه بود ، دشمن را کوچك مشمار کم گوی و گزیده گوی ، راز دیگران مگوی

نظامی نے علوم و فنون کی اصطلاحات استعمال کرکے اپنے تخصص کا اظہار کیا ہے ۔ ہفت پیکر میں نجوم ، خسرو و شیریں میں موسیقی اور سکندر نامہ میں فلسفہ اور آلات جنگی کے نام منظوم کیے ہیں ۔ فلسفیانہ مباحث تو شاید ناصر خسرو کے علاوہ پہلی مرتبہ نظم میں داخل کیے ہیں ۔

تخلیق شعر کے متعلق نظامی کا نظریہ یہ ہے کہ فرسودہ اور پامال مضامین باندھنا شاعری نہیں . مبتکر مضامین بیان کرنے چاہیں ۔ خوب غور و فکر کے بعد نئے خیال اور موضوع کو پسندیدہ اور دلکش بنانے کیلئے محنت اور کوشش سے آراستہ کرکے پیش کرنا چاہیے ۔ سو باتوں کی بجائے شاعر ایک بات کہے ، عمدہ و پختہ کہے اور ایجاز سے کام لے کر کہے تا کہ بات دل کو لگے نظامی نے خود کہا ہے ۔

بدین دلفریبی سخنهای بکر به سختی توان زادن از راهِ فکر

سخن گفتن بکر جان سفتن است نه هر کس سزای سخن گفتن است

سخن کان از سر اندیشه ناید نوشتن را و گفتن را نشاید
سخن را سهل باشد نظم دادن بباید لیك بر نظم ایستادن
سخن بسیار داری اندکی کُن یکی را صد مکن صد را یکی کن

نظامی نے خود بھی اپنے نظریۂ شعرکے اثبات میں عمل کرکے دکھایا ہے ۔ ابیات میں ایك ایك لفظ تول کر لکھا ہے ۔ بڑےسلیقے سے جملوں کا در و بست مضبوط کیا ہے ۔ کسی واقعہ، منظر یا کسی احساس و جذبہ کو بیان کرنے میں فکر و تخیل سے کام لیا ہے ۔ اور ایك ایك شعر میں دلفریب تشبیہ اور دلآویز استعارے سے ایك پیکر یا نقشہ باندھا ہے ۔ مثلاً :

دارا کی وفات پر یہ ظاہر کرنا چاہا ہے کہ اس کی موت سے کیانی تخت و تاج زیر و زبر ہوگیا ہے ۔ اور سلطنت مٹ گئی ہے ۔ اس بات کو یوں بیان کیا ہے کہ نظامی کی قوۂ متفکرہ پر تعجب ہوتا ہے :

نسب نامۂ دولت کیقباد ورق بر ورق هر سوی برد باد

خسرو پرویز نے رسول اکرم (ص) کا نامہ گرامی دیکھا جس پر اس کے نام سے پہلے ان کا نام درج تھا ۔ وہ جھلا اٹھا اور تڑپ کر غضب آلود ہوا ۔ اس کیفیت کو نظامی نے یوں بیان کیا ہے :

چو عنوانگاه عالمتاب را دید تو گفتی سگ گزیده آب را دید

شیریں تالاب میں نہا رہی تھی ۔ خسرو کی اس پر نظر پڑی لیکن شیریں کے بال اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے ۔ اس لیے شیریں نرگسش اس کو نہ دیکھ سکی ۔ نظامی اس حالت کو اس طرح بیان کرتاہے :

سمن بر غافل از نظارۂ شاه که سنبل بسته بُد بر نرگسش راه

ذہنی کیفیات و جذبات کی عکاسی ۔ عشقیہ داستان میں ایسے مواقع اکثر آتے ہیں کہ ایك با کمال شاعر ان سے فائدہ اٹھاتا ہے ۔ اور عاشق و معشوق میں راز و نیاز ، ہجر و وصال ، شادی و غم، نامہ و پیام ، سؤال و جواب ، دوری و نزدیکی جیسے احوال و کوائف کو پورے شعور اور نفسیاتی آگھی سے بیان کرتا ہے ۔ نظامی نے مثنوی خسرو و شیریں اور ہفت پیکر میں جذب و انہماك اور ہنرمندی سے ایك ایك واقعہ کو بیان کیا ہے کہ پڑھ کر طبیعت شگفتہ ہوتی ہے ۔

نظامی نے مناظر قدرت بیان کرنے اور شخصیتوں کو اجاگر کرنے اور ان کے خد و خال نمایاں کرنے میں بھی مہارت کا ثبوت دیا ہے ۔ قدرتی مناظر جیسے باغ و بہاران، صبح و شب ، مجلس عیش و نشاط ، رقص و سرود ، میدان جنگ اور اشخاص میں خسرو ،

شیریں ، بہرام ، سکندر ، دارا ، نوشابہ ، اور دوسرے کرداروں کو بیان کرنے میں دقت نظر اور عمق مشاہدہ کا اظہار کیا ہے ۔

رزمیہ مثنوی یعنی سکندر نامہ میں نظامی کو جنگوں کی کیفیت ، آلات جنگ استعمال کرنے ، پہلوانوں کے دوبدو مبارزت کرنے ، فتح کرنے و شکست کھانے اور تباہ و برباد ہونے کے احوال و کوائف بیان کرنے کا موقع ملا۔ اگرچہ عام عقیدہ یہ ہے کہ فردوسی ، رزمیہ شاعری میں بے نظیر ہے ۔ لیکن نظامی بھی کسی طرح کم نہیں ۔ بعض جگہ جزئیات نگاری میں وہ فردوسی سے بھی سبقت لے گیا ہے ۔ مولانا شبلی نے بعض مشترک موضوعات خاص طور پر دارا کی وفات اور سکندر کے نوشابہ کے سامنے بطور سفیر بن کر جانے کے مناظر کا مقابلہ و موازنہ کرکے نظامی کی برتری کی نشاندہی کی ہے ۔

دیوان نظامی گنجوی

دولتشاہ سمرقندی نے تذکرۃ الشعراء میں لکھا ہے اور آتشکدۂ آذر، خلاصۃ الافکار ، بہارستان جامی ، ہفت اقلیم ، ترجمہ مجالس النفایس اور مجمع الفصحاء میں بھی مذکور ہے کہ پنج گنج کے علاوہ نظامی کا ایک دیوان بھی تھا ۔ جو قصاید ، غزلیات ، منظومات اور رباعیات پر مشتمل تھا ۔ دولتشاہ نے اشعار کی تعداد بیس ہزار بتائی ہے ۔ وحید دستگردی نے گنجینۂ گنجوی کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کی ۔ اس کو تین حصّوں میں تقسیم کیا : پہلے حصّے میں وہ قصاید و غزلیات ہیں جو تذکروں اور بیاضوں سے اکٹھے کئے ہیں اور یقیناً نظامی کی تخلیق ہیں ۔ دوسرے حصّے میں اشعار مشکوک اور تیسرے حصّے میں وہ اشعار ہیں جو نظامی تخلص رکھنے والے دوسرے اشخاص کے ہیں ۔ سعید نفیسی نے ۱۳۳۸ ھ ش میں بڑی کوشش و اہتمام سے ۳۸ منابع سے اشعار جمع کرکے ایک مجموعہ دیوان قصاید و غزلیات نظامی گنجوی کے نام سے شایع کیا ۔دیوان کے قلمی نسخے اسلامیہ یونیورسٹی علیگڑھ ، کتابخانۂ ریاست رامپور ، کتابخانہ دھلی یونیورسٹی ، کتابخانہ ایا صوفیہ استانبول ، کتابخانہ آصفیہ ، حیدرآباد دکن میں موجود ہیں ۔

نظامی کے قصاید مدحیہ نہیں جن میں کسی سلطان یا امیر کی تعریف کی گئی ہو ۔ نظامی نے درباداری نہیں کی ۔ البتہ مثنویوں میں اپنے محسن ممدوح سلاطین کی تعریف میں ابیات لکھے ہیں ۔ ان قصاید کے موضوع عموماً پند و موعظت ، ملکداری ، خدا ، نعت رسول (ص) اور وصف محبوب ہے اور جدوجہد و سعی و عمل کا پیغام ہے ۔ مثلاً :

گر عاقلی ، مباش مقید به هیچ جا　　نشنیده ای که ملك خدا ، بندهٔ خدا

جا در بهشت اگر بودت جاودان مباش — آدم نه ای، اگر کنی این شیوه را رها
عیسی که کام خویش ندید از جهان نهاد — بر تارك جهان قدم و رفت بر سما
آب روان ممد حیاتست و چون ستاد — یك جا ز حد زیاده ، دهد طعم جان گزا
آن کو به کنج خانه نشیمن کند ، بود — مانند عنکبوت به جولاهگی سزا
بی گرد ره مباش درین تیره خاکدان — با آنکه جنبشی به تنت هست چون صبا

حمد و ثناء

ذات او را صفت وحدت یزدانی بس — هر چه منظور تو شد حجت و برهان آرد
قدرت کامل او خاك پدیدار کند — وانگه از خاك همی صورت انسان آرد
در رحم ز آب کند صورت زیبا و همی — بخشش وافر او باز درو جان آرد
از سر صدق و صفا رو به خداوند آرد — کو بصدق دل خود روی به یزدان آرد

اطاعت قرآن

هم زمین را با خلایق ناموافق شد مزاج — هم فلك را با کواکب نامناسب شد قران
زین قران ایمن شوی چو چنگ در قرآن زنی — مهد قرآن جوی کامد مهدی آخر زمان
هر چه نز قرآن ترازی، بر فشان زان آستین — هر چه نزایمان بساطش ، در نورد آن آستان

نعت رسول (ص)

تیغ شرع آورده ، از پس گردن منکر زده — داوریهای جهان را زین قبل داور شده
وز دگر پیغمبران فردا که باشد رستخیز — بانگ «نفسی» نفسی آید هر که در محشر شده
در شفاعت گاه سلطان او بود تنها و بس — امتی ، گو امتی ، سر خلق را داور شده

خود ستائی

سخن از من آفریده چو فتوت ز مروت — هنر از من آشکارا چو طراوت از جوانی
غزلم به سمعها در ، چو سماع ارغنونی — نکتم به ذوقها در ، چو شراب ارغوانی
به قیاس شیوهٔ من که نتیجهٔ نو آید (؟) — همه طرزهای تازه کهنست و باستانی
ببرم هزار دل را به بدیههٔ معما — بخرم هزار جان را ، به غلوطهٔ نهانی

نصیحت به حاکم / بادشاه

یاوری کن همه را تا همه یار تو شوند — چو همه یارکشی با تو که یاور گردد
لشکرت بایدت ، نان بخش ، که آن مور ضعیف — چون به نان پاره بود ، صاحب لشکر گردد
ملك تو رخنه ز خون خوردن مظلومانست — حیض خورشید خورد مه که مجدر گردد
وای آن روز که در کشمکش مظلومان — بر سرت هر سر مویی سر خنجر گردد

غزل گوئی

نظامی کی غزلیات میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو غزل میں موجود ہونی چاہیں۔ محبوب کی تعریف۔ اس کی جدائی کا کرب ، اس کی بیوفائی ، بے رخی ، عاشق کی ایذا۔ پذیری ، فریاد و فغاں وغیرہ محبوب کو مخاطب کرکے اس کا دل نرم کرنے کی آرزو ، نظامی کی محبوب بھی ترک ، ترسابچہ ، دوست ، جان ، بت اور پری ہے ۔ محبوب کے اوصاف وہی ہیں جو آج تک چلے آتے ہیں مثلاً :

دل فریبی، جان ستانی، کج سری ، عشوہ دھی ، بی وفایی ، پر جفایی ، کین کشی ، شوخ چشمی، سرکشی و ناوك اندازی، بتی، دلپذیری ، زیرکی، مستکبری ، ھشیارہ ای، خوش نوایی، خوش لقایی، خوش وصالی، همچو ماہ ،ماهرویی ، مهوشی ، مہ چھرہ ای ، مہ پارہ ای ، تیز فهمی ، دور بینی ، دلبری ، رامشگری ، راست طبعی ، غمگساری ، مونسی ، دلدادہ ای ۔

چھوٹی بحر میں معشوق کو مخاطب کرکے غزلیں کہی ہیں. وہ گویا اصل غزل ہیں . ان میں غزل کی کسك و فریاد موجود ہے۔ مندرجه ذیل غزل کے اشعار ملاحظه کیجئے .

ای آنکه همه مراد مایی چندین بخلاف ما چرایی
از تشنگی تو خاك گشتیم ای آب حیوة من ، کجایی
امروز جدا مشو که فردا باشد به ضرورت این جدایی
نایی بر من به صد شفاعت اینست طریق بی وفایی
هرگز نبرد نظامی از تو هر چند تعرضش نمایی

غزلیات کا دوسرا مرغوب موضوع محبوب خداوندی ہے . اس تك پهنچنے کیلئے جن صفات کی ضرورت ہے . ان کا ذکر ہے . نظامی نے تصوّف کے مضامین کو می و مغاں کی اصطلاحات میں بیان کیا ہے ۔ وہ خرابات کے جویا ہیں ۔ وہ قلندرانہ زندگی کے بھی قایل ہیں ۔ اور انا الحق کا نعرہ بھی بلند کرنا چاہتے ہیں ۔ اس سلسلے کے اشعار دیکھیے :

دلا یکدم حریف جان ما باش مرید راہِ مردان خدا باش
ز بود خویشتن کلی فنا شو پس آنکه در فنا عین بقا باش
سواد حرص و شهوت محو گردان بری از استماع ماجرا باش
بر اوج سدرہ زن کوس سعادت زمانی مرکز جود و سخا باش
اگر خواهی که بینی روی معشوق چو بلقیس سلیمان با وفا باش
بسوز این خرقۂ نفس بهیمی چو پیران با حقیقت آشنا باش
کلیم اللّٰه تویی برطور قربت ملامت ترکِ گبر و پارسا باش

برون عاشقی کار دگر نیست اگر هست، آن همه سودا و صفراست
نه هر تردامنی را عشق زیبد نشان عاشقی از دور پیداست
بخور تو رطل چند از جام لطفش بزن دستی که چون معشوق باماست
ایا عاشق ، برون نه گام از خود کم سرگیر ، کز سر درد سرهاست
درین ره منزلی بس نامرادست درین ره زخمها بس بی محاباست

عموماً غزل کا مزاج دھیما ہوتا ہے ۔ سنبھل سنبھل کر بات کی جاتی ہے ۔ جیسا کوئی کسی کی منت سماجت کرتا ہے .نظامی کی غزل میں کہیں کہیں عشقبازی سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی آرزو ہے ۔ جوش و ولولہ و بے باکی ہے ۔ مثلاً یہ اشعار :

دستی بدست ساقی و دستی به جام می مستی کنان میانهٔ بازارم آرزوست
دل در هوای عشق نهادم به اختیار با شاهدان فتاده سرو کارم آرزوست
از تلخی فراق تو جانم به لب رسید یك بوسه زان دو لعل شکر بارم آرزوست

اسلوب بیان

مثنویوں میں باریك تشبیہات اور دقیق استعارات اور تلمیحات اور معاصر نامانوس الفاظ کے استعمال سے جہاں اسلوب مشکل اور دشوار ہوگیا ہے وہاں کہیں کہیں تخیل غیر واضح اور بیان غیر صریح ہوگیا ہے ۔ مگر قصاید و غزلیات میں زبان سادہ ، سہل و رواں ہے ۔ تخیل واضح اور بیان صریح ہے ، پیچیدہ نہیں .

نثری ادب

چہار مقالہ

چہار مقالہ کا اصل نام «مجمع النوادر» ہے . چونکہ چہار مقالوں پر مشتمل ہے اس لئے عام طور پر چہار مقالہ کے نام سے معروف ہو گیا . اس کے مصنف ابوالحسن نظام الدّین احمد بن عمر سمرقندی ہیں اور نظامی عروضی کے نام سے معروف ہیں . ان کی تاریخ ولادت معلوم نہیں . کتاب کی تألیف ۵۵۲/۵۵۱ ھ میں ہوئی ہے . اسلیے قیاس ہے کہ پانچویں صدی کے آخر میں پیدا ہوئے . کتاب کی داخلی شہادت سے مندرجہ ذیل معلومات حاصل ہوتی ہیں :

۱- ۵۰۴ ھ میں وہ سمرقند میں تھے اور ابو رجا سے رودکی کے متعلق اطلاعات حاصل کیں .

۲- ۵۰۶ ھ میں بلخ میں عمر خیام سے ملاقات ہوئی ۔
۳- ۵۰۹ ھ میں وہ ہرات میں تھے ۔
۴- ۵۱۰ ھ میں وہ طوس میں تھے ۔ انہوں نے ملك الشعراء معزی کے سامنے اپنے اشعار پیش کیے ۔ اسی سال وہ طوس میں قبر فردوسی پر پہنچے ۔ بعد میں چار پانچ سال نیشاپور میں مقیم رہے ۔
۵- ۵۳۰ ھ میں دوبارہ نیشاپور گئے ۔ اور عمر خیام کی قبر پر پہنچے اور عمر خیام کی پیشگوئی کو خود مشاہدہ کیا جو اس نے کہا تھا کہ ہر بہار میں باد شمال اس کی قبر پر گل افشانی کرے گی ۔
۶- ۵۴۷ ھ میں سلطان علاء الدّین غوری اور سلطان سنجر کی جنگ میں شریك رہے ۔ علاء الدّین کی شکست کے بعد کچھ عرصہ کیلئے ہرات میں چھپے رہے ۔

نظامی عروضی دبیری ، شاعری ، طب و نجوم میں مہارت رکھتے تھے ۔ چنانچہ شاعری ، نجوم اور طب سے متعلق حکایات میں اپنی اہلیت کا ذکر کیا ہے ۔ نظامی نے معزی ، عمر خیام اور ابو جعفر بن محمّد ابی سعد کو اپنے اساتذہ میں شمار کیا ہے ۔

نظامی ملوك آل شنسب میں سے مندرجہ ذیل ملوك بامیاں کے درباروں سے وابستہ رہے ۔

۱- ملك فخر الدّین مسعود بن عزالدّین حسین ۔
۲- ملك شمس الدّین محمّد ۔
۳- شاہزادہ ابو الحسن حسام الدّین علی ، اسکے نام اپنی کتاب منسوب کی ۔
۴- علاء الدّین حسین جہانسوز ، بادشاہ فیروز کوہ (۵۴۵-۵۵۶ ھ) جو سلطان سنجر سے شکست کھا کر اسیر ہوئے ۔

نظامی شعر پر بھی ملکہ رکھتے تھے ۔ چنانچہ چہار مقالہ ، لباب الالباب ، تاریخ گزیدہ ، تذکرۃ الشعراء دولتشاہ میں اس کے اشعار منقول ہیں ۔

چہار مقالہ ایك مقدمہ اور چار مقالوں پر مشتمل ہے ۔ مقدمہ میں حمد کے بعد پانچ فصلوں پر مشتمل ہے :

مدح بادشاهان غور معاصر . شاهزادۂ ممدوح او .

چگونگی آفرینش مخلوقات ـ حواس ظاہر و باطن ـ وجود انسان کامل ، پیغمبری و پادشاهی. مقالات کی تقسیم اس طرح ہے :

۱- ماهیت دبیری و کیفیت دبیر کامل ۔
۲- ماهیت علم شعر و صلاحیت شاعر .

۳- در علم نجوم و مہارت منجم .
۴- در علم طب و صداقت طبیب ۔

یہ چار ایسے ارکان ہیں جن پر بادشاہ اور درباری نظم و نسق کا دارو مدار ہے ۔ بعض بادشاہ کی شان اور استحکام کیلئے ان چار اشخاص کی موجودگی ضروری ہے ۔ ہر مقالہ کے شروع میں دیباچہ لکھا ہے جس میں موضوع کی تعریف کی ہے ۔ پھر ان شرایط و لوازم کو بیان کیا ہے جو صاحب موضوع کیلئے ضروری ہیں . اس کے بعد ہرمقالے کے آخر میں دس حکایات بیان کی ہیں ۔ جن سے ان کے نظریات کی تائید ہوتی ہے اور بہت سی تاریخی معلومات حاصل ہوتی ہیں ۔

دوسرے مقالے میں سامانی ، غزنوی ، خانیہ ، دیالمہ، سلجوقیہ اور غوریہ شعرای قدیم کے نام لیے ہیں اور ان میں سے بعض نامور اشخاص کے متعلق نادر معلومات مہیا کی ہیں . مثلاً رودکی ، عنصری ، فرخی ، معزی ، فردوسی ، ازرقی ، رشیدی ، مسعود سعد سلمان کے اشعار بھی نقل کیے ہیں . اور ان کے کلام پر تبصرہ بھی کیا ہے . تیسرے مقالے میں عمر خیام کے متعلق نہایت اہمیت کی حامل اطلاعات ہیں .

نظامی کو بعض اشخاص کو واقعات سے مربوط کرنے میں تسامحات ہوئے ہیں ۔ سنین کے ضبط میں سہو ہوا ہے ۔ مثلاً :

۱- اسکافی کو نوح بن منصور کا دبیر لکھا ہے ۔ حالانکہ وہ نوح بن نصر کا دبیر تھا .

۲- البتگین غزنوی کو نوح بن منصور سامانی کا معاصر لکھا ہے .

۳- لکھا ہے . سبکتگین نے سیمجوریوں سے مل کر خراسان پر حملہ کیا ۔ حالانکہ سبکتگین خود سیمجوریوں کے ساتھ جنگ آزما ہوا تھا .

۴- سردار سامانی ابو علی احمد بن محتاج جغانی کو نوح بن منصور کا معاصر بتایا ہے حالانکہ وہ اس زمانے میں زندہ ہی نہ تھا.

۵- ابو علی بن محتاج کو «لشکر کشی سبکتگین بر خراسان» کے وقت زندہ بتایا ہے .

۶- ماکان بن کاکی کو نوح بن منصور کا معاصر بتایا ہے ۔ حالانکہ وہ نصر بن احمد کا معاصر تھا .

۷- تاش سپہ سالار نے ماکان بن کاکی کو قتل نہیں کیا بلکہ ابو علی بن محتاج نے قتل کیا .

۸- حسن بن سہل کو ذوالریاستین کہا ہے حالانکہ یہ لقب اس کے بھائی فضل بن سہل کا ہے ۔

۹- مامون کی ملکه بوران فضل بن سہل کی بیٹی نہیں تھی ۔ وہ حسن بن سہل کی بیٹی تھی ۔

۱۰- المسترشد باللّٰہ کی لشکر کشی سلطان سنجر کے خلاف نہیں تھی بلکه سلطان مسعود سلجوقی کے خلاف تھی ۔

۱۱- بغراخان کو معاصر سلطان محمود غزنوی لکھا ہے ۔ حالانکه ایلك خان ماوراء النہری محمود کا معاصر تھا ۔

۱۲- یعقوب بن اسحاق کندی کو یہودی لکھا ہے اور ایك جھوٹا قصه بیان کیا ہے ۔

۱۳- خواجه نظام الملك طوسی بغداد میں قتل نہیں ہوئے بلکه نہاوند میں ۔

۱۴- محمّد بن زکریا رازی طبیب کو منصور بن نوح سامانی کا معاصر بنا کر ایك جعلی کہانی لکھی ہے ۔ حالانکه وہ تیس سال پہلے فوت ہو چکا تھا ۔

۱۵- ابو علی سینا علاء الدوله کے وزیر نہیں تھے بلکه وہ شمس الدوله کے وزیر تھے اور وہ ری میں وزیر نہیں تھے بلکه همدان میں تھے ۔

ان کے علاوہ بھی ناموں اور تاریخوں کی غلطیاں موجود ہیں ۔ لیکن ان اغلاط کے باوجود نظامی کی فراہم کردہ بعض اطلاعات منحصر به فرد ہیں ۔

اسلوب نگارش

چہار مقاله کا عمومی اسلوب سادہ روان ، واضح اور صریح ہے ۔ جملوں کا در و بست موضوع کے مطابق ہے ۔ محاورے کا استعمال موزوں ہے ۔ ہر لفظ کو موقع کے مطابق استعمال کیا ہے ۔ ایجاز و اطناب اپنی حدوں سے نہیں گزرا ۔ صرف دیباچے میں اور مقالات کی ابتدا میں فلسفه ، طبیعات ، نجوم و طب کی اصطلاحات استعمال کی ہیں اور عربی الفاظ لائے گئے ہیں ۔ متن میں بھی بادشاہ ، امراء، اشخاص کی تعریف میں مقفی مسجع یا موزوں عبارات لانے کا التزام کیا ہے لیکن ناگوار نہیں ۔

نظامی نے بعض الفاظ و افعال کو نئے معنوں میں استعمال کیا ہے ۔ ملك الشعرا بہار نے سبك شناسی میں ان کی نشاندہی کی ہے ۔

متقدمین میں سیاست نامه ، قابوسنامه ، تاریخ مسعودی اور متأخرین میں تذکرۃ الاولیای عطار، تاریخ گزیدہ اور منشآت قائم مقام کے مشابه قرار دیا جا سکتا ہے ۔

سیاست نامه

اس کے مصنف نظام الملك طوسی مشہور ہیں . ان کا نام حسن ، ابو علی کنیت اور لقب نظام الملك تھا ۔ طوس کے قریب قریه رادکان میں پیدا ہوئے ۔ طوس میں ابتدائی تعلیم

حاصل کرنے کے بعد مرو اور نیشاپور میں حدیث اور فقه شافعی پڑھی . نظام الملك شروع میں بلخ میں چغری بیگ داؤد سلجوقی کے ملازم ہوئے ۔ بعد میں الپ ارسلان کی ملازمت میں داخل ہوئے اور مستقل وزیر بن گئے ۔ ان کی قابلیت ، تدبر، اور انتظامی و عسکری صلاحیت کی بنا پر مملکت سلجوقیه کو وسعت ہوئی . وہ ملکشاہ کے عہد حکومت میں بیس سال تك حکومت سلجوقی کے نگران و حکمران رہے . حریفوں کے حسد و رقابت کی وجه سے ملکشاہ نے انہیں معزول کیا . ۴۸۵ ھ میں اسماعیل فدائی کے ہاتھوں قتل ہوئے .

نظام الملك ایران کے عظیم الشان وزراء میں شمار ہوتے ہیں ۔ وہ علماء ، فقہا اور عرفاء کے مربی تھے ۔ انہوں نے تعلیم عام کرنے کیلئے نظامیه مدارس قائم کیے .

نظام الملك نے اپنے عہد وزارت کے طویل عرصے میں امور مملکت کے متعلق جو تجارب حاصل کیے ان کو کتاب کی صورت میں مرتب کرکے اس کا نام سیاست نامه یا سیر الملوك یا پنجاہ فصل رکھا. کتاب میں امور مملکت داری کے متعلق سیاسی ، دینی اور تاریخی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے ۔ بادشاہ کی رعایا پروری اور عدالت گستری ، حکام و عمال ، شحنه و مشرف ، قاضی و محتسب اور دوسرے منصبداروں کے فرایض بیان کیے گئے ہیں . درباداری اور مجالس شاہی کے آداب و مراسم پر گفتگو کی ہے ۔ چار فصلوں میں مزدك ، سنباد گبر ، بابك خرم دین ، قرمطیوں اور باطنیوں کی تاریخ و عقاید بیان کرکے بادشاہ کو ان سے محترز رہنے کی تلقین کی ہے . ضمناً دلچسپ تاریخی اور غیر تاریخی حکایات لکھی ہیں . قرآنی آیات و احادیث سے بھی استدلال کیا ہے بد مذهبوں کے متعلق ان کے قلم سے کچھ ناسزا باتیں بھی نکل گئی ہیں .

سیاست نامه میں کہیں کہیں رجال و واقعات کے بارے میں غلطیاں بھی ہوئی ہیں . کتاب کا اسلوب بیان آسان ، رواں اور ایجاز کا حامل ہے . جملے پیچیدہ اور مغلق نہیں . مترادفات بالکل کم ہیں . مسجع و مقفی جملے ایك دو جگه آئے ہیں ۔ واقعات کی جزئی تفاصیل کا بیان اور مطالب کا محاکاتی انداز تاریخ بیهقی جیسا ہے ۔ یه کتاب زبان و بیان کے لحاظ سے مقبول کتابوں میں شمار ہونے کے لایق ہے ۔

قابوسنامه

قابوسنامه کے مصنف عنصر المعالی کیکاؤس بن اسکندر بن قابوس وشمگیر ہیں . انہوں نے دادا کے نام کی مناسبت سے اس کا نام «قابوس نامه» رکھا ۔ قابوس آل زیار میں سے تھے اور گرگان و طبرستان کے حکمران تھے ۔ اگرچه کیکاؤس کو مملکت داری کا زیادہ

تجربہ نہ ہوا لیکن وہ فاضل تجربہ کار جہان آشنا شخص تھا ۔ اس نے قابوس نامہ اپنے بیٹے گیلان شاہ کی رہنمائی کیلئے تألیف کی ۔ قابوسنامہ کے عنوانات سے موضوع کے تنوع کا اندازہ ہوتا ہے ۔ کیکاؤس سلطان محمود غزنوی کے داماد تھے اور عمر کا کافی حصہ انہوں نے غزنین ، ھندوستان اور دوسرے علاقوں میں عسکری مہموں میں گزارا ۔ ۴۹۲ سے ۵۰۸ ھ تك کسی زمانے میں وہ شیرزاد بن مسعود بن ابراھیم کے ساتھ برصغیر میں تھے ۔ قابوسنامہ کی تألیف ۴۷۵ ھ میں شروع ہوئی ۔ مصنف نے بتایا کہ اس نے اپنی عمر کے ۶۳ سال بچپن سے بڑھاپے تك کتاب میں مذکور نصایح کے مطابق زندگی گزاردی ۔ کیکاؤس شاعر بھی تھے اور فارسی و طبری میں شعر کہتے تھے ۔

قابوسنامہ ایك دیباچہ اور چوالیس ابواب پر مشتمل ہے ۔ پہلے چار باب ذات باری ، تخلیق کائنات اور آداب مذہب سے متعلق ہیں ۔ پانچواں باب حقوق والدین ، اور چھٹا باب ذہنی تربیت پر ہے ۔ متعدد ابواب کھانے پینے ، شطرنج اور پولو کھیلنے ، شکار کرنے ، بزم آرائی ، مہمان داری ، انتخاب دوستان اور احتراز دشمنان ، سونے جاگنے ، اٹھنے بیھٹنے کے آداب سے متعلق ہیں ۔ شادی بیاہ ، تربیت اولاد ، تعلیم اور علوم و فنون کی تحصیل کے بارے میں ہیں ۔ جرم و سزا ، عطا و بخشش کے متعلق بھی نصیحتیں کی ہیں ۔ کافی حصّہ بادشاہ ، وزراء ، ارکان سلطنت اور دوسرے منصبداروں کے اوصاف و فرائض پر مشتمل ہے ۔ کتاب میں پچاس کے قریب حکایات درج ہیں ۔ جن سے حالات وقایع کی بنا پر مواعظ کو مؤثر بنانے کی کوشش کی گئی ہے ۔

باپ نے ذاتی تربیت کیلئے بیٹے کو مندرجہ ذیل قسم کی نصیحتیں کی ہیں ۔ احمقوں سے عقل سیکھو ۔ بہت زیادہ شرم و حیا نہ کرو ۔ راستگوئی میں شہرت حاصل کرو تا کہ اگر کبھی جھوٹ بھی بولو تو لوگ سمجھیں کہ سچ ہے ۔

معاشرتی آداب و اخلاق کے متعلق ذیل کے نکات پر زور دیا ہے ۔ مہمان کی موجودگی میں نوکروں کو سرزنش نہ کرو ۔

صبح کے وقت کبھی شراب نہ پینا تا کہ تمہاری نمازیں قضا نہ ہو جائیں ، شراب پینا گناہ ہے ۔ اگر یہ گناہ کرنا ہے تو سلیقے سے کرو ۔

اسلامی احکام و ضوابط کے نقطہ نظر سے کافی باتیں قابل اعتراض ہیں ۔ لیکن اس کتاب سے معاشرے کے اعلی طبقے میں خاص کر ، امراء ، اراکین سلطنت ، شاھزادوں اور امیرزادوں کے آداب و اخلاق و مراسم پر روشنی پڑتی ہے ۔ اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ درباراری اور دنیاداری کیلئے کن کن مصلحتوں کا جواز تلاش کیا جاتا تھا ۔

قابوسنامہ کا اسلوب نگارش وہی ہے جو قرن چھارم و پنجم میں مروج تھا ۔ سادہ و

مصنوع باہم ۔ اگرچہ زبان سیاست نامه کی طرح ساده ہے لیکن قرن پنجم کی اصطلاحات و ترکیبات پرانی ہیں ۔

بخش پنجم :

ایلخانی دور میں فارسی ادب کا جائزہ

ایلخانی دورِ حکومت ۶۲۸ سے ۷۷۱ ھ تک قائم رہا ۔ اس کے نامور حکمران ، ہلاکو خان ، اباقاخان ، احمد تکودار ، ارغون ، غازان خان اور ابو سعید تھے ۔ ۶۱۲ ھ سے ہی چنگیزی حملے شروع ہوگئے تھے ۔ یورش تاتار کا سلسلہ ۶۵۶ ھ تک رہا. جب عباسی سلطنت کا خاتمہ ہوا اور بغداد پر قبضہ ہوا ۔ قتل و غارت اور شہروں کی تباہی و بربادی سے علم و ہنر کے مراکز بھی متاثر ہوئے اور علماء اور شعراء بھی منتشر ہوگئے ۔ کچھ بچے کھچے مراکز دوردراز علاقوں میں محفوظ رہے ۔

ایران کے دوسرے علاقے میں خوارزمشاہ ، خاندان جلائر ، آل مظفر ، اینجو ، اتابکان فارس ، اتابکانِ یزد ، قراختائیان ، کرمان ، آلِ کرت ، سربدار کی حکومتیں قائم تھیں ۔ ان میں سے بعض کی سلطنتیں نابود ہو گئیں ۔ اَور بعض نے اطاعت قبول کرلی اور دیر تک قائم رہیں ۔ ان کے درباروں سے بھی اہل علم و فضل وابستہ تھے ۔

شاعری

منگول فارسی زبان و شعر سے ناآشنا تھے ۔ اس لئے درباروں میں قصیدہ گو شاعر ناپید ہوگئے ۔ چنانچہ اس دور میں قصیدہ گوئی ختم ہو گئی.

اس دَور کے ابتدا میں صوفی شاعر فرید الدّین عطار اور کمال الدّین اسماعیل اصفہانی قتل ہوئے ۔ سیف الدّین اسفرنگی ماوراء النہر میں قصاید لکھتا رہا. اس عہد کے نامور شعراء کے نام حسب ذیل ہیں ۔ مصلح الدّین عبداللّٰہ سعدی ، جلال الدّین بلخی (رومی)، فخر الدّین عراقی (۶۸۶ ھ)، مجد الدّین ہمگر (۶۸۶ ھ) امامی ہروی (۶۶۷ ھ)، ہمام تبریزی (۷۱۴ ھ)، نزاری قہستانی ، محمود شبستری ، (۷۲۰ ھ) اوحد الدّین کرمانی (۷۳۶ ھ)، اوحدی مراغی (۷۳۸ ھ) ابن یمین (۷۶۹ ھ) خواجو کرمانی (۷۵۳ ھ)، عبید زاکانی (۷۷۲ ھ)، سلمان ساوجی (۷۷۹ ھ) اور خسرو دہلوی (م ۷۲۵ ھ)۔

اسی دور میں غزل کو زیادہ فروغ ہوا ۔ غزل میں تصوف و عرفان کی آمیزش سے جذب و شور نے بڑی کشش پیدا کی اور آئندہ کیلئے نئی راہ کھل گئی ۔ عطار، سعدی، رومی ، عراقی کی غزلیں دل و دماغ میں وجد و سماع پیدا کرتی تھیں ۔ سعدی کو مؤسس غزل کہتے ہیں ، کیونکہ اس نے عشقیہ واردات اور ذہنی کیفیات کو غزل میں سمویا اور تغزل کو جنم دیا ۔

غزل کے علاوہ عرفانی مثنویوں نے ذھنوں کو بہت متأثر کیا ۔ مولانا روم کی مثنوی معنوی عشق و عرفان کے معارف کا خزینہ ہے ۔ عطار کی مثنوی منطق الطیر اور دوسری مثنویاں ، محمود شبستری کی گلشن راز اور اوحدی مراغی کی جام جم اور منطق العشاق مشہور ہیں ۔ نظامی کی مثنویوں کا اتباع بھی جاری رہا ۔ خواجو کرمانی اور خسرو کی مثنویاں بہترین جواب شمار ہوتی ہیں ۔

اس دَور میں اخلاقی اور اجتماعی خرابیاں پیدا ہوئیں ۔ اس لئے شعراء نے ان کی اصلاح کیلئے توجہ کی اور قصاید، غزلیات اور قطعات اور مثنویات میں مواعظ و نصایح بیان کیے .

قصاید میں سعدی ، غزلیات میں سعدی ، رومی ، عطار اور مثنویات میں مولانا روم اور سعدی نے نہایت مفید اور سبق آموز واقعات پیش کیے ۔ قطعات میں ابن یمین اور عبید زاکانی کے نام سربر آوردہ ہیں ۔ عبید زاکانی اس دور کا منفرد شاعر ہے جس نے طنز و مزاح سے کام لے کر لوگوں کو غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی .

اس دور کی شاعری کی خصوصیات واضح کرنے کیلئے مختلف اصناف سخن میں سے ذیل کے اشعار پیش کئے جاتے ہیں :

غزل

دیدۂ سعدی و دل همراه تست تا نپنداری که تنها می روی(سعدی)
به طواف کعبه رفتم به حرم رهم ندادند که برون در چه کردی که درون خانه آئی(عراقی)
چه کنم ترا طلبِ خانه به خانه در به در چند گریزی از برم گوشه به گوشه کو به کو(رومی)

قطعات

مرد باید که هر کجا باشد عزتِ خویش را نگهدارد(ابن یمین)

بنی آدم اعضای یکدیگرند که در آفرینش ز یك جوهرند(سعدی)

مثنوی

مصلحت در دین ما جنگ و شکوه مصلحت در دین عیسی غار و کوه (رومی)
بگو آنچه دانی که حق گفته به نه رشوت ستانی و نه رشوه ده (سعدی)

نثر

ایلخانی دور میں مغل سلاطین کی یہ خواہش تھی کہ ان کے خاندان کے کارنامے زندہ رہیں ۔ چنانچہ اپنی تاریخیں لکھنے کیلئے انہوں نے مؤرخین کو مأمور کیا ۔ یہ دور مغل تاریخوں کے لحاظ سے تاریخ کا زریں دور شمار ہوتا ہے . اس زمانے کی مشہور کتب

مندرجہ ذیل ہیں ۔

۱- تاریخِ وصاف جس کا اصل نام «تجزیۃ الامصار و ترجمۃ الاعصار» ہے ۔ اس کے مؤلف شہاب الدّین عبداللّٰہ شیرازی ہیں ۔ یہ تاریخ ۷۱۲ ھ میں مکمل ہوئی ۔

۲- جامع التواریخ از رشید الدّین فضل اللّٰہ ۔

۳- نظام التواریخ از قاضی بیضاوی ۔

۴- تاریخ جہانگشای جوینی از عطا ملك جوینی ۔

۵- تاریخ گزیدہ اور ظفر نامہ منظوم از حمد اللّٰہ مستوفی ۔

۶- طبقاتِ ناصری از منہاج سراج ۔

۷- ترجمہ تاریخ یمینی از ابو اشرف ناصح گلپائگانی ۔

۸- تاریخ بناکتی از ابو سلیمان داؤد ۔

مندرجہ بالا تواریخ میں سے تاریخ جہانگشای جوینی ، تاریخِ وصاف اور جامع التواریخ ایلخانی خاندان کے احوال و کوائف کیلئے مستند کتابیں ہیں ۔ کیونکہ ان کے مؤلف وہ لوگ ہیں جو درباروں میں منصبدار تھے ۔ اور ہر قسم کی اطلاعات ان کی دسترس میں تھی ۔ تاریخ وصاف اور جہانگشای جوینی اپنے پُر تکلف اور مصنوع انداز بیان کی وجہ سے بدنام ہے ۔ عربی مآب اسلوب کی وجہ سے عام قاری کیلئے مطالب تك رسائی مشکل ہے ۔ جامع التواریخ اور تاریخ گزیدہ سادہ و رواں نثر میں ہیں ۔ اس دَور میں کتب تواریخ کے علاوہ موضوعات پر بھی کتابیں لکھی گئیں ۔ ان کے اسالیب بیان بھی مختلف ہیں ۔ بعض کی نثر پُر تکلف اور مصنوع ہے اور بعض کا اسلوب تکلف اور سادگی کا آمیزہ ہے ۔

نثر مصنوع

۱- سمط العلی لحضرۃ العلماء از ناصر الدّین یزدی ، قراختائیوں کی تاریخ ۔

۲- نفثۃ المصدور از نورالدّین محمّدی نسوی ، خوارزمشاہوں کی تاریخ ۔

نثر سادہ

۱- طبقات ناصری از منہاج سراج ۔

۲- تاریخ گزیدہ ، نزہۃ القلوب از حمداللّٰہ مستوفی ۔

۳- اخلاقِ ناصری ، اساس الاقتباس ، معیار الاشعار از نصیر الدّین طوسی۔

۴- تجارب السلف از ہندو شاہ ۔

۵- اخلاق الاشراف ، تعریفات از عبید زاکانی ۔

مرسل اور مصنوع
گلستان از مصلح الدّین سعدی .

شیخ عطار نیشابوری (۱)

فرید الدّین لقب ، محمّد نام ، باپ کا نام اور کنیت ابوبکر ابراہیم ، دولتشاہ نے تاریخ ولادت ۶ شعبان ۶۱۳ ھ لکھی ہے ۔ وفات ۱۱۴ سال کی عمر میں یعنی ۶۲۷ ھ بتاتی ہے . لیکن یہ درست نہیں ۔ محققین کی رائے میں سال ولادت تقریباً ۵۴۰ ھ اور سال وفات تقریباً ۶۱۸ ھ ہے ۔ وہ تاتاریوں کے قتل عام میں نیشابور میں ہلاک ہوئے ۔

اپنے والد سے عطاری اور دارو شناسی کے علم اور تجربے کو ورثے میں پایا ۔ انہوں نے نیشاپور جیسے مرکز علم و فن میں حکمت و کلام و نجوم و ہیأت اور علوم دینی میں تفسیر ، حدیث اور فقہ پڑھی ۔ شیخ عطار عمر بھر طبابت کرتے رہے اور دواخانہ چلاتے رہے ۔

نفحات الانس میں لکھا ہے کہ ایک درویش ان کی دکان پر آیا اور اس نے سوال و جواب کیے ۔ ایک سوال کے جواب میں کہ موت کیسے آتی ہے ؟ درویش کشکول سرہانے رکھ کر سو گیا اور جان جان آفرین کے سپرد کر دی ۔ عطار یہ حالت دیکھ کر حیرت زدہ ہوئے اور کاروبار چھوڑ کر بقول تذکرۃ الشعراء شیخ رکن الدّین اکاف کی خانقاہ میں چلے گئے اور ریاضت و عبادت میں مشغول رہے ۔ یہ قصّہ درست نہیں ۔ یہ بات بھی صحیح نہیں عطار مجد الدّین بغدادی کے مرید ہوئے جو خود نجم الدین کبری کے مرید و خلیفہ تھے . دولتشاہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ نے قطب الدّین حیدر سے بھی تربیت پائی . اس کی بھی کوئی حقیقت نہیں ۔ بعضو ں نے عطار کو اویسی کہا ہے ۔ یعنی براہ راست رسول اکرم (ص) سے مستفیض ہوئے ہیں جس طرح کہ اویس قرنی ہوئے تھے ۔

جامی نے بتایا ہے کہ بلخ سے مہاجرت کے بعد جلال الدّین محمّد اپنے والد کے ہمراہ نیشاپور سے گزرے تو شیخ عطار سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے اسرار نامہ کا ایک نسخہ دیا جسے وہ منبع حقیقت و معرفت سمجھتے رہے ۔ استاد مدرس رضوی نے اپنی تألیف احوال و آثار خواجہ نصیر میں ابن الفوطی کے حوالے سے لکھا ہے کہ خواجہ نصیر الدّین نے شیخ عطار سے ملاقات کی تھی ۔

۱- تفصیل کے لئے دیکھئے : اسرار نامہ مرتبہ محمّد عباسی ، تہران ۱۳۶۳ ھ ش ، مقدمہ ، الٰہی نامہ مرتبہ فواد روحانی ، تہران ، جستجو در احوال و آثار عطار ، سعید نفیسی ، طبع تہران .

عطار نے اپنی عمرکا کچھ حصّہ سیر و سیاحت میں گزارا اور مکّہ سے ماوراء النہر تک میں مشایخ سے ملاقاتیں کیں اور تذکرۃ الاولیاء کیلئے اطلاعات بھی جمع کیں ۔

عطار کے روحانی رہنما

۱- نجم الدّین کبری جو سلسلۂ کبرویہ کے بانی ہوئے ۔ خوارزم میں ان کی خانقاہ تھی ۔

۲- مجد الدّین بغدادی ، مدرس و حکیم و طبیب اھل خوارزم تھے ۔ عطار نے ان سے علم طب پڑھا۔

۳- رکن الدّین اکاف ۔ عطار نے ان کے اقوال کو اپنی تصانیف میں نقل کیا ہے ۔ الٰہی نامہ میں بھی دو جگہ ذکر ہے ۔

تصنیفات

مختلف تذکروں اور کتب خانوں میں موجود کلیات میں حسب ذیل تصانیف عطار سے منسوب کی گئی ہیں ۔

۱- آغاز عشق ۔ ۲- اسرارنامہ ۔ ۳- اسرار نامہ (مطبوعہ مسیحائی پریس)
۴- اشتر نامہ ۔ ۵- اسرار الشہود ۔ ۶- اخوان الصفا ۔ ۷- الٰہی نامہ ۔
۸- بیسر نامہ ۔ ۹- بلبل نامہ ۔ ۱۰- پند نامہ ۔ ۱۱- تذکرۃ الاولیاء ۔
۱۲- جوھر الذات یا جوہر نامہ ۔ ۱۳- حلاج نامہ یا منصور نامہ ۔
۱۴- حقایق الجواہر ۔ ۱۵- حیدرنامہ ۔
۱۶- خسرو نامہ یا گل و ھرمز ۔ ۱۷- خیاط نامہ ۔ ۱۸- دیوان ۔
۱۹- سیاہ نامہ ۔ ۲۰- شرح القلوب ۔
۲۱- کنز الاسرار ۔ ۲۲- کنز البحر ۔ ۲۳- کنز الحقایق ۔
۲۴- لسان الغیب ۔ ۲۵- منطق الطیر ۔ ۲۶- مصیبت نامہ ۔ ۲۷- مختار نامہ ۔
۲۸- مظہر العجائب ۔ ۲۹- مفتاح الفتوح ۔ ۳۰- نزھت الاحباب ۔
۳۱- وصیت نامہ ۔ ۳۲- وصلت نامہ ۔ ۳۳- ولد نامہ ۔
۳۴- ھیلاج نامہ ۔ ۳۵- ہفت وادی ۔

حافظ محمود شیرانی[۱] نے ان میں سے مندرجہ ذیل کو تفصیلی تجزیہ کے بعد مجعول ثابت کیا ہے ۔

۱- آغاز عشق ۔ ۲- اسرار الشہود ۔ ۳- اسرار نامہ ۔ ۴- کنز الحقایق ۔
۵- مفتاح الفتوح ۔ ۶- وصلت نامہ ۔ ۷- منصور نامہ یا حلاج نامہ ۔

۱- تنقید شعرالعجم ۔

۸- بیسرنامه۔ ۹- خیاط نامه۔ ۱۰- کنز الاسرار۔ ۱۱- وصیت نامه۔
۱۲- مظهر العجائب۔ ۱۳- جوهر الذات و هیلاج نامه۔

ان کے علاوہ مندرجه ذیل کو بھی انھوں نے مشتبه اور مجھول قرار دیا ہے ۔
اشتر نامه ، بلبل نامه ، نزهت الاحباب ، هفت وادی ، لسان الغیب ، حیدر نامه ، حقایق الجواہر ، کنز البحر یا کنز الاسرار ۔

مندرجه ذیل کتابوں کے نام ایسے ہیں جن کو بے شك عطار کی تصانیف میں شمار کیا جانا چاہیے :

۱- اسرار نامه۔ ۲- الهی نامه۔ ۳- پند نامه۔ ۴- شرح القلب ۔
۵- منطق الطیر۔ ۶- مصیبت نامه۔ ۷- مختار نامه۔ ۸- دیوان ۔
۹- تذکرة الاولیاء (نثر)۔

مولانا جامی نے لکھا ہے که عطار کے متعلق مولانا روم کی رائے یه تھی :
«در سخنان مولانا جلال الدّین رومی مذکور است که نور منصور بعد از صد و پنجاه سال بر روح فرید الدّین عطار تجلی کرد و مربی او شد» ۔

قصیده نگاری

قصیده نگار سے یه تأثر پیدا ہوتا ہے که شاید عطار نے بھی مدحیه قصاید لکھے ہونگے ۔ لیکن ایسا نہیں. اس نے صرف قصیده کے بحور و اوزان کو استعمال کیا ہے . مضامین صرف سلوك و طریقت اورعشق و معرفت سے متعلق ہیں . عطار همه اوست کے قایل تھے . انہوں نے قرآنی آیات و احادیث سے استدلال کرکے بیان کیا ہے . که خدا ہر جگه موجود ہے . ہمارے قریب ہے ۔ سب کو محیط ہے . ہر جگه اس کا نور ہے .وہ سمندر ہے ہم قطرہ ہیں . وہی جلوہ گر ہے وہی جلوہ ہے وہی ناظر وہی منظور ، رب ارنی بھی اسی نے کہا. لن ترانی بھی اسکا جواب تھا۔ انا الحق بھی اسی نے کہا اور سردار بھی وہی گیا .
عطار کی اپنی زبانی سنیے تو بہتر ہے :

نحن اقرب علیه آمده است — دور افتاده ای تو از پندار
کل شیئ محیط می بینم — آنچه می بینمش به نقش و نگار
کاروان نفخت من روحی — برای تو بر گشاید بار
ثم وجه الله، آیدت به نظر — و هـو معکم نمایدت دیدار
بس تماشا چو ننگری گویی — لیس فی الدار غیره دیّار
همه یك قطره ایست از دریا — همه یك دانه ایست از خروار
خود انا الحق زد از لب منصور — خود برآمد ز فوق بر سردار

گفت انا احمد بلامیم از زبان پاك احمد مختار
رب ارنی به گوش خود خود گفت خود بخود کرد حسرت دیدار
ناظر خود خودست و خود منظور خود تماشا و خود تماشاگار

همه اوست کے ساتھ بعض ہندی فلاسفه قایل ہیں که وہ خدا دوسری اشیا میں حلول کرجاتا ہے اور وہ اشیا خدا بن جاتی ہیں . عطار اس کے قایل نہیں انہوں نے کہا :

چه جای حلولیان طاعتیست من تابع سنت رسولم

عطار اپنے آپ کو صوفی صافی کہتے ہیں :

ما صوفی صفۂ صفاییم بیخود ز خودیم و با خداییم

ان کے قصاید و غزلیات مضامین تصوّف و عشق و معرفت سے مالا مال ہیں . تصوّف کے عام مضامین یہ ہیں ۔ کبر و پندار کو ترك کرو ۔ خودی سے باہر نکلو ۔ خدا کی طرف دل لگاؤ . اسکی لگن میں تڑپو. اپنا مرشد لو ۔ فنا فی الشیخ ہو جاؤ . پھر فنا فی اللّٰہ ہو جاؤ پھر بقا باللّٰہ بن جاؤ ۔ همه تن اس کو دیکھو پاؤ . اس کی یاد میں مست رہو . اور بیخودی میں سرشار رہو ۔ عشق میں غم لگانا ، خون جگر پینا اور جان کھونا پڑتا ہے ۔ اپنے آپ کو فنا کرکے بقا حاصل ہوتی ہے ۔

راه عشق او که اکسیر بلاست محو در محو و فنا در فناست
فانی مطلق شود از خویشتن هر دل کو طالب این کیمیاست
گر بقا خواهی فنا شو ، کز فنا کمترین چیزی که می زاید بقاست

صوفی اپنی روحانیت کے ایسے مقام پر پہنچتا ہے که سب کائنات میں اسے ایك حقیقت جلوہ نما نظر آتی ہے ۔ دیر و مسجد صومعه و خانقاه اور دوسرے مراکز عبادات میں ایك ہی خدا موجود ہوتا ہے ، سب اس کی تلاش کرتے ہیں لیکن صوفی عارف کفر و دین کے امتیازات سے بالا ہو کر سوچتا ہے .یه مذاہب کی علامات لوگوں کو خدائے واحد سے بیگانه کرتی ہیں اور انسانوں میں تفرقه پیدا کرتی ہیں . میخانۂ عشق کے متوالے ہی ظاہری قیود سے بالا ہوکر ایك ہوتے ہیں ۔ وہ تعصب نہیں رکھتے ۔ کفر و دین کے جھگڑوں میں نہیں پڑتے ۔ عطار نے ایك غزل میں عشاق کے اوصاف گنوائے ہیں :

عشاق از خویشتن بیگانه اند و ز شراب بیخودی دیوانه اند
فارغند از خانقاه و صومعه روز و شب در گوشۂ میخانه اند
راه جسم و جان بیك تگ می برند در طریقت این چنین مردانه اند
آشنایان خودند از بیخودی وز خودی خویشتن بیگانه اند
فارغ از کون و فساد عالمند زین جهت دیوانه و فرزانه اند

غزل گوئی

عطار نے عشق حقیقی اور محبوب حقیقی سے تعلقات بیان کرنے کیلئے محبوب دنیوی کے رخسار ، لب، چشم و ابرو و زلف اور شراب ، مینا ، ساقی ، خرابات کی اصطلاحات استعمال کی ہیں . بعض جگہ تو واضح طور پر شراب عشق و میکدۂ عشق کہہ کر واضح کر دیا ہے ۔ لیکن بعض جگہ محبوب یا ساقی کا اس طرح ذکر ہے ۔ کہ وہ سچ مچ چلتا پھرتا دل بہلانے والا ، لذت بخشنے والا ، شراب پلانے والا خوبصورت نوجوان ہے. عطار جیسے صوفی پاکباز سے اس قسم کی بے باکی متوقع تو نہیں لیکن شاعری کیا کچھ نہیں کراتی :

ترسا بچه ای شکر لبم دوش — صد حلقهٔ زلف بر بنا گوش
صد پیر قوی که حلقه می داشت — زان حلقهٔ زلف ، حلقه ای در گوش
آمد بر من ، شراب در دست — گفتا که بیاد من کی این نوش
در پرده اگر حریف مایی — چون می نوشی خموش مخروش
دل چون شنید این سخن زو — ناخورده شراب گشت مدهوش
چون بستدم آن شراب و خوردم — در سینهٔ من فتاد صد جوش

ذیل کی غزل میں محبوب کو روایتی انداز میں روایتی تشابیہ میں بیان کیا گیا ہے .

سرو چون قد خرامان تو نیست — غنچه چون پستهٔ خندان تو نیست
نیست یك کس که به لب آمده جان — ز آرزوی لب و دندان تو نیست
به ز جان عاشق دیدار ترا — سپر ناوك مژگان تو نیست
غرقه باد آنکه به صد سوختگی — تشنهٔ چاه زنخدان تو نیست

عطار نے اپنی غزلوں میں اپنے آپ کو گبر و بت پرست ، زنار بند ، خراباتی رند کہا ہے .جو شخص ان کے ظاہری معنوں پر جائے گا ۔ وہ تو ان کے کفر کا فتوی دے گا . لیکن وہ تو ایسے نہیں تھے ۔ اس لیے ان الفاظ کے وہ مجازی معنی لیتے ہونگے جو اصطلاحات تصوف میں ان کیلئے معین کئے گئے ہیں ۔ مثال کے طور پر ذیل کی غزل میں ان اصطلاحات کا استعمال دیکھیے :

مسلمانان، من آن گبرم که دین را خوار می دانم — مسلمانم هی خوانند و من زنار می دارم
طریق صوفیان ورزم و لیکن از صفا دورم — صفا کی باشدم چون من سر خمار می دارم
به بستم خانقه را در ، در میخانه بگشودم — ز می من فخر می گردم ز مسجد عار می دارم
چو یار اندر خراباتست ، اندر کعبه چون باشم — خراباتی صفت خود را ز بهر یار می دارم

عطار کا دل عشق خداوندی سے سرشار ہے۔ وہ اس کی یاد سے غافل نہیں رہتا ۔ وہ اپنی عاجزی و نیازمندی کا ذکر کرتا ہے ۔ اس کی التفات و رحمت کا طالب رہتا ہے ۔ خواب میں کبھی اس کی تجلیات کا منتظر رہتا ہے ۔ کبھی کبھی اس کے قرب و وصال کی کیفیت بیان کرتا ہے اور کبھی اپنی محرومیوں کا بھی تذکرہ کرتا ہے ۔ عشق کی نوعیت ، کیفیت اور اس کے حصول کے متعلق تو اکثر اصول و رموز بتاتا ہے ۔ مثلا ذیل کی غزل میں خدا سے مخاطب ہو کر اپنا حال بیان کر رہا ہے :

تو بلندی عظیم و من پستم   چکنم تا به تو رسد دستم
تا که سر زیر پای تو ننهم   نرسم بر چنان که خود هستم
چون ز هستی خویش نیست شدم   لاجرم یا نه نیست یا هستم
خود تو دانی کز اشتیاق تو بود   در دو عالم بهر چه پیوستم

غزلیات عطار کی زبان سہل و سادہ ہے ۔ بیان بھی واضح و صریح ہے ۔ صنایع لفظی و معنوی کا اہتمام نہیں کرتے ۔ بیان میں سوز و اخلاص ہے ۔ جذبہ تخلیق تیز ہے ۔ اسلیے اشعار امڈے چلے آتے ہیں ۔ خصوصاً چھوٹی بحروں میں غزل کی خوبیاں موجود ہیں ۔ جہان محبوب سے مخاطب ہے ۔ وہاں کسك و فریاد بھی ہے ۔ مثلا یہ غزل :

دردِ دل را دوا نمی دانم   گم شدم ، سر ز پا نمی دانم
چند از من کنی سؤال ، که من   درد را از دوا نمی دانم
حلِ این مشکلی که افتادست   در خلا و ملا نمی دانم

غزل عطار کا اکثر موضوع عشق ہے ۔ وہ رنگ رنگ سے اس کے احوال و کوائف بیان کرتا ہے ۔ عشق آگ ہے جو دل میں جلتی ہے اور اغیار کو بھسم کر دیتی ہے ۔
عشق انسان کو دنیا اور مافیہا سے بیگانہ کر دیتا ہے وہ زمان و مکان بھول جاتا ہے :

گر جام عشق دم زند آتش درین عالم زند   این عالم بی اصل را چون ذره ها برهم زند
عشق جمال جانان دریای آتشینست   گر عاشقی ، بسوزی ، زیرا که راهش اینست

عطار محض فقیر درویش یا زاهد خشك نہیں تھے ۔ ان کے اندر شاعر زندہ تھا ۔ وہ بیرونی دنیا میں مناظر فطرت سے لطف اندوز ہونا جانتے تھے ۔ باغ ، بہار ، سبزہ و شراب میں ان کیلئے ولولہ زندگی تھا ۔ ان کی غزل کے مندرجہ ذیل اشعار میں وہ کیفیت نمایاں ہے :

باد شمال می وزد ، جلوهٔ نسترن نگر   وقت سحر ز عشق گل بلبل نعره زن نگر
سبزهٔ تازه روی را نو خط جویبار بین   لالهٔ سرخ روی را سوخته دل چو من نگر
خیز و بیا بوقت گل باده بده که عمر شد   چند غم جهان خوری ، شادی انجمن نگر

اسرار نامه

عطار نے ساٹھ سال کی عمر میں تقریباً ۶۰۰ ھ میں اسے منظوم کیا کل ۳۳۰۵ ابیات ہیں . اس میں ۲۲ مقالات ہیں ۔ اور ہر مقالے میں تمثیلات و حکایات درج ہیں ۔

پہلے مقالے میں توحید ، تخلیق ، زمین و آسمان اور خدائے بزرگی کی حمد و ثنا بیان کی ہے۔ دوسرے مقالے میں نعت رسول اکرم (ص) اور معراج نبوی کی تفصیل بتائی ہے . آخرمیں دعا کی ہے :

خدایا نور دین همراه ما کن محمّد را شفاعت خواہِ ما کن

تیسرے مقالے میں فضایل صحابہ کبار یعنی خلفائے راشدین کا ذکر ہے۔ اس میں بہتر فرقوں سے باز رہنے کی تلقین کی ہے ۔ چوتھے مقالے میں روح انسانی سے بحث کی ہے . اور فلسفیانہ مطالب کو صراحت سے بیان کیا ہے . پانچویں مقالے میں عشق کا بیان ہے جس میں اهل دل کو شمع عشق روشن کرنے کیلئے کہا ہے ۔ عقل و عشق کا موازنہ کر کے بتایا ہے کہ عشق بچہ ہے اور عشق استاد . آخر میں کمال عشق ، کمال عرفان کی توضیح کی ہے ۔ چھٹے مقالے میں مادہ و ذہن کے مباحث پر تبصرہ کیا ہے ۔ شیخ عطار کا عقیدہ ہے کہ مادی دنیا مولود ذهن آدمی ہے .

ع : خیالست این همه عالم بیندیش

ساتویں مقالے میں اصل حقیقت کا بیان ہے ۔ حقیقت مشاہدہ ربوبیت ہے ۔ اور تین مرحلوں سے حاصل ہوتی ہے ۔ شریعت ، طریقت ، حقیقت ، عارف کا اصل مقصد خدا یابی ہے ۔ اس کیلئے جنت کا خیال بھی چھوڑیے ۔ اوردس حکایتیں بیان کی ہیں ۔ آٹھویں مقالے میں کائنات کا ارتقاء بیان کیا ہے ۔ بعد میں بتایا ہے کہ انسانی اعمال میں آخرت میں نیکی و بدی کا ثمر پیش کرتے ہیں ۔ اسی مقالے میں موتوا قبل ان تموتوا ، اور وحدت الوجود پر روشنی ڈالی ہے ۔ اور دو حکایتیں لکھی ہیں ۔ نوین مقالے میں بہشت کی تفصیل بتائی ہے ۔ پھر اخلاق حمیدہ کی تعریف کی ہے اور عوارض نفس یعنی حسد ، بخل ، غضب ، حرص وغیرہ کی نشاندہی کی ہے جو ارتقائے روحانیت میں حائل ہیں . آخر میں علم الیقین ، حق الیقین اور عین الیقین کی تشریح کی ہے اس میں پانچ حکایتیں ہیں دسویں مقالے میں بتایا ہے . کہ عبادت کی غرض بہشت نہیں ہونا چاہیے عبادتگزاروں کو عجب و غرور سے پرہیز کرنا چاہیے ۔ گیارھواں مقالہ گیارہ تمثیلات و حکایات پر مشتمل ہے ۔ جس میں مختلف موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ بارھویں مقالے میں نصیحت کی ہے کہ دل کو مال دنیوی سے پاک کرو . منافقت اور دورویی کو ترک کرو ۔ اس کے بعد حکایات و تمثیلات ہیں . تیرھویں مقالے میں اپنی کوشش کے

باوجود اپنی کم علمی اور بے علمی پر افسوس کا اظہار کرکے صرف ایک حکایت بیان کی ہے ۔ چودھویں مقالے میں دنیا کی نعمتوں کا ذکر کیا ہے ۔ اور بتایا ہے کہ یہ ظاہر فریب ہے ۔ ان سے پائیدار نفع حاصل نہیں ہو سکتا ۔ اسکے بعد پانچ تمثیل و حکایات لائے ہیں۔ پندرھویں مقالے میں اختصار سے بتایا ہے کہ یہ دنیا اور اسکی متاع ناپائیدار ہے ۔ اور اس کے لئے غمزدہ نہیں ہونا چاہیے ۔ پھر چار حکایات بیان کی ہیں ۔ سولھویں مقالے میں بتایا ہے کہ دنیا سے تو نے دل لگایا لیکن آخر مال و متاع یہیں چھوڑ کر جانا ہے اس لئے دنیا پر فریفتہ نہیں ہونا چاہیے ۔ پھر چار کہانیاں بیان کی ہیں ۔ سترھویں مقالے میں پانچ ابیات میں تنبیہ کی ہے کہ زندگی غفلت میں گزار دی ہے ۔ اور بے ثمر رہے ہو ۔ چار حکایات و تمثیلات بیان کی ہیں ۔ اٹھارھویں مقالے میں کہا ہے کہ تو نے زندگی حرص و آز میں گزاری، عمر گزر رہی ہے ۔ آیندہ کی فکر کرنی چاہیے ۔ میں بوڑھا ہوگیا ہوں جوان بھی میری حالت دیکھ کر پریشان ہونگے اور ایک حکایت کہی ہے ۔

انیسویں مقالے میں نصیحت کی ہے ہوا اور ہوس کو چھوڑو ۔ قناعت اختیار کرو ۔ دنیا پر نازاں نہ ہو ۔ اس میں چودہ حکایات درج کی ہیں ۔ بیسویں مقالے میں بھی نصیحتیں کی ہیں کہ تم زندگی خور و خواب میں گزار رہے ہو ۔ چاہیے کہ رات اور فجر خدا کی یاد میں گزارو ۔

اس میں تین حکایات بیان کی ہیں ۔ اکیسویں مقالے میں گوناگون نصیحتیں کی ہیں ۔ امتحان کے بغیر کسی کو ہم راز نہ بناؤ ، کم بات کرو ۔ اچھی بات کرو ۔ عیب چن کر پاس نہ آنے دو ۔ نادانوں سے اچھا سلوک کرو ۔ خندان و شگفتہ رہو ۔ دشمن کو حقیر نہ جانو۔ ظاہر و باطن پاک رکھو ۔ صبر کو پیشہ بناؤ ۔ یہاں صرف ایک تمثیل بیان کی ہے ۔ بائیسویں مقالے میں اختتامیہ ہے ۔ بتایا ہے کہ میرے اندر تخلیق معانی کا طوفان برپا ہے۔ نیند نہیں آتی ۔ ایک خیال چھوڑتا ہوں سو چلے آتے ہیں ۔ اپنے آپ کو مخاطب کرکے کہا ہے کہ خاموش رہو ، صبر کرو ۔ اس کی حضوری طلب کرو اور نور پاؤ ۔ آخر میں سات کہانیاں بیان کی ہیں ۔

تمثیل و حکایت کے زیر عنوان عرفاء کے اقوال ، مکالمے یا مختصر حکایات ہیں اور پھر ان سے اخذ کردہ مطالب بیان کیے گئے ہیں ۔ تمام اسرار نامہ حکمت و معرفت کے جواہر کا خزینہ ہے ۔ معلوم ہوتا ہے عطار نے اپنے دل و دماغ میں اس مقدار میں حکمت کے ذخائر جمع کر رکھے ہیں ، جو کبھی ختم نہیں ہونگے ۔

مصیبت نامہ

بحر رمل مسدس مقصور میں منظوم ہوئی ، تقریباً سات ہزار اشعار پر مشتمل ہے ۔

اس مثنوی میں سالک معرفت و حقیقت کی تلاش میں سفر کرتا ہے ۔ اور ہر شخص اور ہر چیز سے رہنمائی حاصل کرتا ہے ۔ عطار ہر مقام پر اس کی رہبری کرتے ہیں. جب سالک ایك مرحلہ کو ختم کر دیتا ہے ۔ تو وہ اس کو دوسرے مرحلے کیلئے آمادہ کرتے ہیں ، اور آخر میں اسے تعجب انگیز منزل تك پہنچاتے ہیں ۔ تمثیلیں اور حکایتیں جو ضمناً آئی ہیں وہ اپنے اندر جہاں معنی رکھتی ہیں ۔ مثنوی کے نام کے متعلق خود اختتامیہ میں سبب بتایا ہے :

زانکه هر بیتی که می بنگاشتم بر سر آن ماتمی می داشتم
در مصیبت ساختم هنگامه من نام این کردم مصیبت نامه من

مصیبت نامہ چالیس مقالات یعنی عنوانات پر مشتمل ہے ۔ شروع میں توحید ، نعت رسول ، معراج النبی ، خلفای راشدین، حسن و حسین ، اسلام کے فضایل بیان کیے ہیں . بعد میں تعصب کو مطمع سخن بنا کر تین حکایات بیان کی ہیں. اور ماہیت شعر پر بھی بحث کی ہے ۔ اس کے بعد مقالات کا سلسلہ شروع ہوجاتاہے ۔ اور سالك کا سفر شروع ہو جاتا ہے ۔ وہ پہلے جبریل ، اسرافیل ، میکائیل ، عزرائیل اور پھر تمام ملائکہ کے پاس جاتا ہے ۔ اس کے بعد عرش ، لوح ، قلم ، دوزخ ، آسمان ، آفتاب اور ماہ کے پاس سوال لے جاتا ہے ۔ اس کے بعد چار عناصر ، جماد ، نبات ، جوش ، طیور ، حیوان کے پاس فریاد دے جاتا ہے .اس کے بعد شیطان، جن ، آدمی ، انبیاء یعنی آدم، موسی، داؤد ، عیسی ، اور مصطفی کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے ۔ آخر میں اپنے نفس کی طرف مڑتا ہے اور حِس خیال، دل اور جان کی طرف رجوع کرتا ہے ۔ ہر مقالے کے درمیان پندرہ پندرہ تك تمثیل و حکایات لائی گئی ہیں ۔

سالك کی آخری منزل اس کی اپنی روح ہے ۔ روح دریا ہے . وہ قطرہ ہے جب قطرہ دریا کو پا لیتا ہے تو وہ خود دریا بن جاتا ہے :

قطره ای تو می زنی چون چشمه جوش تا کنی دریای اعظم جمله نوش

پند نامه

عطار کی مقبول عام مثنوی ہے جو ایران اور برّصغیر میں کئی مرتبہ شایع ہوئی اور اس کی شروح اور فرہنگیں بھی لکھی گئیں ۔ یہ مثنوی واعظوں اور خطیبوں کی زبانوں پر رہی اور مساجد و مکاتب کے دروس میں شامل رہی . عوام اس کی مناجات کو اپنے دل کی پکار سمجھ کر خدا کے حضور التجا کرتے رہے ۔ مثنوی کی ابتدا حمد و ثنا سے شروع ہوتی ہے :

حمد بی حد مر خدای پاك را آنکه ایمان داد مشت خاك را

مناجات کے دو اشعار یہ ہیں :

پادشاها جرم ما را در گذار ما گنه گاریم و تو آمرزگار
تو نکو کاری و ما بد کرده ایم جرم بی پایان و بیحد کرده ایم

خاتمہ میں دعائی ہے :

رحمت حق باد بر روح آن کسی کین نصایح را بخواند او بسی

پندنامہ دین ، تصوف ، اخلاق ، اور انفرادی و اجتماعی تہذیب نفس کیلئے نصایح کا خزینہ ہے . مندرجہ ذیل عنوانات سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے گا .

دین : اصل ایمان ، عمل صالح ، نیك بختی ، بدبختی ۔

تصوف : نفس امارہ ، ریاضت نفس ، ترك دنیا ، فقر و صبر ، رستگاری ، ذکر اللہ، کرامات ، معرفت الہی ، تجرید و تفرید ، صحبت درویشان .

اخلاق :خاموشی، عافیت،تواضع و ترك تکلف ، اخلاق ذمیمہ ، ورع ، تعظیم مہمان. علامتہائے احمق ، فاسق ، بخیل ، منافق ، قناعت ، سخاوت .

معاشرت : سیرۃ ملوك ، اہل سعادت ، خدمت ، صدقہ ، صحبت صلحا ، اجتناب از اهل ظلم ، رعایت یتیم ، صلہ رحم ، فتوت .

چار چیز : چار ایسی چیزیں جن سے چار چیزیں پیدا ہوتی ہیں ۔ باقی رہتی ہیں ۔ جن سے بچنا محال ہے ۔ ایسی چیزین جو چار چیزوں سے حاصل ہوتی ہیں ۔ جو عمر کو بڑھاتی ہیں ۔ اور جو عطیہ خداوندی ہیں ۔

پانچ چیز : پانچ ایسی چیزیں جن سے آبرو تباہ ہوتی ہے ۔ آبرو بڑھتی ہے ۔ اور پانچ ایسی چیزیں جو پانچ اشخاص سے نہیں ہو سکتیں .

ان نصایح کو پڑھ کر شیخ عطار کی وسیع النظری اور دقیقہ رسی پر حیرت ہوتی ہے کہ معاشرے کی اصلاح کیلئے کس قدر جامع سودمند اور ہمہ گیر نصیحتیں کی ہیں ۔ جو اس کے اپنے معاشرے میں بھی مفید تھیں اور آج بھی مفید ہو سکتی ہیں .

منطق الطیر

یہ مثنوی معمول کے مطابق حمد و ثنا ، مناجات ، نعت رسول (ص) فضایل خلفائے راشدین کے بعد شروع ہوتی ہے .شاعر ہدہد ، طوطی، کبك ، چرغ ، دراج ، بلبل ، طاؤس، تدرو ، فاختہ ، قمری ، باز ، مرغ زرّین کو الگ الگ خطاب کرکے ان کی خصوصیات بیان کرتے ہیں . بعد میں کہانی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ تمام پرندے اکٹھے ہو کر مشورہ کرتے ہیں کہ ہمارا بھی کوئی بادشاہ ہونا چاہیے ۔ ہد ہد اپنے فضایل

بیان کرکے سیمرغ کو بادشاہ متعین کرنے لئے اسکے فضایل سے آگاہ کرتا ہے . بلبل ، طوطی ، طاؤس ، بط ، کبک ، هما ، باز ، بوتیمار ، بوف ، صعوہ اور دوسرے پرندے ایک ایک کرکے ہد ہد سے سیمرغ کے متعلق سوال کرتے ہیں ۔ اور ہدہد ان کی تشفی کیلئے ان کو جواب دیتا ہے ۔ اور وہ تلاش میں مجبوری و معذوری کا اظہار کرتے ہیں . آخر کار پرندے سیمرغ کی تلاش کیلئے آمادہ ہوگئے اور ہدہد کو اپنا رہنما قبول کر لیا ۔ سفر شروع ہوا تو بعض پرندے اپنی ناتوانی ، گناھگاری ، شك و شبه ، نفس امارہ ، رہزنی ابلیس ، زر دوستی، عشق مجازی میں رغبت ، خوف مرگ ، نامرادی دنیا جیسی خامیاں بتا کر ہدہد سے منزل مقصود پر پہنچنے کے موانع بیان کیے اور ہدہد نے ان کی تشفی کیلئے مفصل جواب دیے . بعض پرندوں نے فرمانبرداری ، پاکبازی ، عالی همتی ، عدل و وفا ، گستاخی دربارۂ حق ، لایق عشق ، کمال و خود بینی جیسی خوبیاں بتا کر کامیابی کے مواقع کے متعلق سوالات کیے اور ہدہد نے مناسب جوابات دیے .پھر بعض نے دریافت کیا سفر میں کیسے خوش رہیں گے ، بادشاہ سے کیا چیز مانگیں گے ، اس کے سامنے کیا تحفه پیش کرینگے .آخر میں ہدہد بتاتا ہے کہ سیمرغ تك پہنچنے کیلئے سات وادیوں سے گزرنا پڑے گا ۔

۱- وادی طلب ، ۲- وادی عشق ، ۳- وادی محبت ، ۴- وادی استغنا ،
۵- وادی توحید ، ۶- وادی حیرت ، ۷- وادی فقر و فنا ۔

منزل کے پاس پہچنے پر پرندوں کی عجب کیفیت ہوئی بعض نڈھال ہوئے ، بعض مر گئے ۔ انہیں معلوم ہوا کہ جس سیمرغ کی تلاش میں تھے وہ تو ان کے اندر موجود تھا ۔ ان وادیوں سے گزر کر سالك خود محبوب کو پا لیتا ہے ۔ اس تمثیلی قصّے کو اس طرح معانی پہنائے گئے ہیں کہ پرندے سالکان طریقت ہیں ۔ ان کے بیانات وہ نفسانی ، صفاتی ، اور اجتماعی رکاوٹوں ہیں جو سلوك و طریقت میں حایل ہوتی ہیں . ہدہد پیر و مرشد ہے ۔ سیمرغ محبوب و منتھای نظر حقیقی ہے ۔ اور سفر میں وادیاں مراحل ہیں جن کو عبور کرنا پڑتا ہے ۔ سالك درجۂ فنا میں پہنچتا ہے تو سیمرغ اور سیمرغ میں فرق مٹ جاتا ہے .مصنف نے یه قصّه مسلسل بیان نہیں کیا ۔ یعنی ایسے نہیں جیسا کہ اوپر خلاصه بیان کیا گیا ہے ۔ اس تمثیل کے ضمن میں اولیاء و عرفاء کے متعلق حکایات ہیں ۔ اور بعض مقامات پر براہ راست پیر مریدوں کو فقر و سلوك کے رموز و حقایق بیان کرتا ہے . منطق الطیر تصوّف اور اس کے تمام مسائل پر قصے کی صورت میں احاطه کرتی ہے .

الهی نامه

یہ مثنوی تقریباً سات ہزار اشعار پر مشتمل ہے . ابتدا میں ایک مقدمہ ہے جو مناجات، نعت پیغمبر ، مدح خلفا و خطاب بہ موقع پر محیط ہے ۔ یہ مثنوی چھ فصلوں میں منقسم ہے . جس میں بائیس مقالات اور ایک خاتمہ شامل ہے ۔ کتاب کا خلاصہ یہ ہے ۔ ایک خلیفہ کے چھ بیٹے تھے جو تمام مروجہ علوم سے آشنا تھے اور انہیں راحت کا تمام ساز و سامان حاصل تھا . لیکن ہر ایک کے دل میں ایک ناکام آرزو کا غم تھا ۔ ایک دن باپ نے ان کو بلا کر کہا . اگر تم اپنی اپنی آرزو بیان کرو ، شاید میں اس کی بر آری کیلئے تمہیں کوئی راہ بتا سکوں ۔ کتاب کے چھ حصوں میں ہر بیٹے کی آرزو اور باپ کا جواب بیان کیا گیا ہے ۔

پہلے بیٹے نے بتایا کہ وہ شاہ پریاں کی بیٹی پر فدا ہے اور ہر قیمت پر اسے حاصل کرنا چاہتا ہے . دوسرے نے کہا کہ وہ سحر و جادو پر دیوانہ وار جان دیتا ہے ۔ تیسرے نے کہا کہ وہ جام جم کا خواہشمند ہے ۔ چوتھے نے کہا کہ وہ آب حیات کا جویاں ہے ۔ پانچویں نے کہا کہ وہ انگشتری سلیمان حاصل کرنے کا آرزومند ہے ۔ چھٹے نے بتایا کہ وہ کیمیا حاصل کرنے کی تمنا رکھتا ہے ۔

باپ چند حکایات اور حکیمانہ اقوال و امثال کے ذریعے ان کی ان فضول آرزوں کی حقیقت بیان کرتا ہے اور انہیں نصیحت کرتا ہے کہ ان نفسانی خواہشات سے روگردانی کرکے عالم بالا سے ناطہ جوڑیں ۔ ان سؤالات کے ضمن میں ہر بیٹا مزید سؤال کرتا ہے . اور باپ سلوک و عرفان کے نقطہ نظر سے جواب دیتا ہے . اور یہ سلسلہ سؤال و جواب ۲۲ مقالات تک پھیل گیا ہے ۔ عطار نے اس گفت و شنید میں بے شمار عرفانی ، فلسفی اور اخلاقی مضامین و مطالب بیان کیے ہیں ۔ اور حکایت و تمثیل کے واسطے سے سلوک و عرفان کے اسرار و رموز بیان کئے ہیں اور سالک کے احوال و مقامات پر روشنی ڈالی ہے . ضمناً طلب ، توبہ ، عشق ، توکل، وفا ، معرفت ، توحید ، فقر ، فنا کے متعلق روشناس کرایا ہے ۔ یہ کتاب در حقیقت گنجینۂ معارف الہی ہے . عطار نے خود آخر میں فرمایا ہے :

در گنج الهی بر گشادم　　الهی نامه نام این نهادم

اکیسویں مقالہ میں رابعہ بن کعب کا عشق موضوع سخن ہے . تمام کتاب کا عمومی موضوع عشق و درد ہے ۔

فتوت نامه

شیخ عطار کی ۸۲ ابیات پر مشتمل مثنوی ہے . جو اپنے نصایح کی بدولت بڑی اہمیت

کی حامل ہے ۔ انہوں نے اس میں فتوت کے ثبات و استواری کیلئے ۷۲ نصیحتیں کی ہیں ۔ ایک ایک نصیحت تہذیب اخلاق اور اصلاح معاشرہ کی ضامن ہے ۔ یہاں دو تین بیت نقل کیے جاتے ہیں :

نخستین راستی را پیشه کردن چو نیکان از بدی اندیشه کردن
همه کس را به یاری داشتن دوست نگفتن : آن یکی مغز و دگر پوست
ز بند نفس بد آزاد بودن همیشه پاك باید چشم و دامن

عطار کا اسلوب نگارش سادہ و سلیس ہے ۔ ان کی شاعری ان کے خیالات و جذبات کی ترجمان ہے ۔ ان کے بیان میں تکلف و تصنع نہیں ۔ ان کی طبیعت بہت موزوں تھی ۔ رموز جذبات سے مضامین امڈے چلے آتے تھے ۔ انہوں نے خود کہا ھے ۔

چنانم قوت طبع است در فکر که یك معنی بخوانم صد دھد بکر

پُر گوئی کے باوجود کلام استوار ہے اور حشو و زواید نہیں لائے گئے ۔ کلام کا اصلی جز ان کا سوز و اخلاص ہے ۔ جو کلام کو پر تأثر بناتا ہے ۔ مثنویوں میں پند و موعظت اور علم و حکمت کا عنصر زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کے اشعار مقبول ہیں ۔ پند نامہ اکثر قطباء وعاظ کے زبانزد رہا ہے ۔

مولانا روم (۱)

مولانا روم کا نام محمّد تھا ، جلال الدّین لقب ، بعض تذکرہ نگاروں نے خداوندگار بھی لکھا ہے ۔ عموماً مولانا روم ، مولانای روم ، یا صرف رومی کے نام سے معروف ہیں ۔ مولانا ۶ ربیع الاولؔ ۶۰۴ ھ بلخ میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد محمّد بن حسین بن محمّد خطیبی تھے ۔اور بہاء الدّین ولد کے لقب سے معروف تھے ۔وہ اپنے زمانے کے علامہ شمار ہوتے تھے ۔ مولانا کی والدہ سلطان خوارزمشاہ کی بیٹی تھی ۔ بہاء ولد اکابر صوفیہ میں شمار ہوتے تھے ۔ خرقۂ خلافت احمد غزالی سے حاصل کیا تھا ۔ امرِ معروف اور نہی منکر کیلئے مشہور تھے ۔ مجلس کرتے اور وعظ کہتے تھے ۔ اہل بلخ کو ان سے گہری عقیدت تھی ۔ بہاء ولد حکماء و فلاسفہ پر تنقید کرتے تھے ۔ کہتے ہیں کہ فخر الدّین رازی محمّد خوارزمشاہ کے استاد تھے ۔ اس کو مولانا کی تنقید و تعریض ناگوار تھی اور وہ مولانا کے مخالف ہوگئے .بہاء ولد نے بلخ چھوڑنے کا ارادہ کر لیا اور حج کے

۱- تفصیل کے لئے دیکھیے : غزلیات شمس تبریزی با مقدمہ جلال همائی و پرتو علوی ، تهران .

ارادے سے بغداد کی طرف روانہ ہوئے ۔ نیشاپور میں شیخ فرید الدّین عطار سے ملاقات ہوئی ۔ انہوں نے اپنی مصنفہ مثنوی اسرار نامہ جلال الدّین محمّد کو دی اور کہا : « زود باشد که این پسر تو آتش در سوختگان عالم زند » ۔

مولانا حج کے بعد شام گئے ۔ ملطیه اور لارنده میں قیام کے بعد قونیه میں مستقل اقامت اختیار کر لی ۔ لارنده کے دوران قیام میں خواجه ارلائی سمرقندی کی بیٹی گوهر خاتون سے جلال الدّین کی شادی ہوئی ۔ اسی ازدواج سے دو بیٹے بہاء الدّین محمّد اور علاء الدّین محمّد پیدا ہوئے ۔

۶۳۸ ھ میں بہاء ولد کی وفات کے بعد مولانا روم کی عمر ۲۴ سال تھی ۔ وہ باپ کے جانشین مقرر ہوئے اور وعظ و تذکیر اور افتاء میں مصروف ہوئے ۔ درس و تدریس اور بحث و مناظرہ کا سلسلہ شروع ہوگیا ۔ بہاء ولد کے شاگرد سید برهان الدّین محقق (م – ۶۳۸ ھ) نے سلوك و معرفت کے اسرار و رموز سے آگاہ کیا ۔ مولانا حلب و دمشق بھی گئے ۔ اور کئی سال وہاں مقیم رہے ۔

۶ جمادی الآخر ۶۴۲ ھ کو شمس الدّین تبریزی قونیه پہنچے ۔ شمس اپنی ابتدائی زندگی میں عالم و مکتب دار تھے ۔ بعد میں سلوك و طریقت کی طرف متوجه ہوئے ۔ حلب میں ۱۴ ماہ عبادت و ریاضت میں مشغول رہے ۔ سیر و سیاحت پر نکلے تو سیاہ نمدہ بدن پر ہوتا۔ چٹائی اور لوٹا ہاتھ میں اینٹ کا تکیه لیتے ۔ مولانا روم شمس تبریزی کی شخصیت سے اس قدر متأثر ہوئے کہ درس و تدریس اور فقه و فتوی کا کام چھوڑ کر فقیر و درویش ہوگئے اور پیر و مرشد کے زیر اثر عشق محبوب خداوندی میں مستغرق رہنے لگے ۔ مریدوں اور شاگردوں کو یه حال ناگوار گزرا ۔ شمس یه شور و ہنگامه دیکھ کر یکدم غائب ہوگئے ۔ رومی بے قرار رہنے لگے ۔ ان کے بیٹے بہاء الدّین سلطان ولد ان کو تلاش کرکے واپس لائے ، رومی پھر ان کی مجلس میں مشغول و مستغرق رہنے لگے ۔ شہر کے ارادتمندوں کو درس و تدریس سے رومی کی بے اعتنائی پسند نه آئی ۔ شمس کے متعلق ان کی نفرت و بیزاری زیادہ ہو گئی ۔ شمس ایك دن پھر ایسے غائب ہوئے ؟ واپس نه آئے ۔

مولانا روم شمس کی آمد سے پہلے ہی تصوّف و طریقت کی روح سے آشنا تھے ۔ اور ان کے دل میں تلاش حقیقت اور قرب خداوندی حاصل کرنے کا جذبه خوابیدہ تھا ۔ شمس تبریزی نے اس جذبے کو بیدار کیا ۔ مبہم تصورات کو یقین کی روشنی عطا کی ۔ عشق کا ایك ایسا شعله دکھایا که تمام ظواہر رسوم و آداب بھسم ہوکر رہ گئے ۔ تبریزی چلے گئے تو صلاح الدّین زرکوب نے ان کی جگه لی ۔ انہیں اپنا جانشین اور خلیفه بنایا ۔

۶۶۲ ھ میں ان کی وفات کے بعد ان کے مرید حسام الدّین چلبی ان کے روحانی ہمدم رہے جو انھیں مثنوی لکھنے پر اکساتے رہے تبریزی کے بعد پہلی شیفتگی اور وارفتگی صلاح الدّین زرکوب کی طرف منتقل ہوگئی تھی ۔ دیوان کی ۷۱ غزلوں میں صلاح الدّین زرکوب کا نام آیا ہے ۔

رومی ۶۴۵ ھ سے ۶۶۲ ھ تک غزل کہہ کر اپنی بے قرار روح کو تسلی دیتے رہے ۶۶۲ سے ۶۷۲ھ تک یعنی دم واپس تک مثنوی کی تسوید و تدوین میں مصروف رہے ۔ مولانا ۵ جمادی الآخر ۶۷۲ ھ کو فوت ہوئے ۔

تصنیفات

۱- دیوان شمس تبریزی ۔ ۲- مثنوی معنوی ۔ ۳- فیہ مافیہ (نثر)۔
۴- مکتوبات و خطبات (نثر)۔

فیہ مافیہ

یہ کتاب مولانا روم کے ملفوظات کا مجموعہ ہے ۔ مریدین اور متعلقین مولانا کی مجلس میں حاضر ہوتے اور اپنے شکوک و ابہامات دور کرتے اور معلومات میں اضافہ کرتے اور علم و حکمت سیکھنے کی غرض سے مولانا سے سؤالات کرتے اور وہ جوابات مرحمت فرماتے ۔ سؤال پوچھنے والوں میں سے معین الدّین پروانہ وزیر سلطنت اور مرید مولانا اور دوسرے اشخاص مخاطب ہیں ۔

فیہ مافیہ میں کل ۷۴ فصلیں ہیں ۔ ان میں ۶۸ فصلیں فارسی میں اور چھ فصلیں عربی میں ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے عنوانات بعد میں لگائے گئے ہیں ۔ ان مجالس میں مولانا کے صاحبزادے بہاء الدّین محمد بھی موجود ہوتے تھے ۔ وہی ان مجالس کی روئیداد لکھتے جاتے ہونگے ۔ بعد میں مولانا کی وفات کے انتالیس چالیس سال بعد یعنی ۷۱۱ ھ میں ان ملفوظات کو کتاب کی صورت میں مرتب کیا ۔

فیہ مافیہ میں قرآن و حدیث کی تفسیر ہے ۔ تصوّف و عرفان کے نکات و اسرار ہیں جن کی تشریح کی گئی ہے ۔ تقریباً وہی موضوعات ہیں جو مثنوی معنوی اور دیوان شمس تبریزی میں بیان ہوئے ہیں ۔ انھی ملفوظات کو پڑھ کر آدمی مولانا کے افکار و نظریات سے آگاہ ہو سکتا ہے ۔ نفس ، روح ، خودی ، عقل و عشق ، کفر و دین ، ولی ، مرشد ، علم و حیوان ، معرفت ، ظن و یقین وغیرہ عام موضوعات ہی جن پر مولانا نے اظہار خیال کیا ہے ۔

مکتوبات و خطبات رومی

رومی نے اپنی زندگی میں بے شمـــــار خطوط لکھے ہونگے ۔ مختلف ذرایع سے

ڈاکٹر فریدون نافذبك نے ۱۹۳۷ میں مختلف ذرایع سے مکتوبات کا مجموعہ شایع کیا . بعد میں ۱۹۵۶ میں یوسف جمشیدی پور اور غلام حسین امین نے تہران سے تعلیقات کیساتھ یہ مجموعہ شایع کیا ۔ ان مکتوبات کے مخاطبین میں اعزا و اقرباء، دوست احباب ، شاگرد، ارادتمند اور امراء ، وزراء شامل ہیں ۔ بعض خطوط حاجتمندوں کی امید برآری کیلئے سفارش نامے ہیں ۔ بعض میں تصوّف و طریقت کے رموز و نکات پر روشنی ڈالی گئی ہے . چار خط عربی میں ہیں . باقی فارسی میں ہیں ۔ تقریباً ہر مکتوب کا آغاز اللّٰہ مفتح الابواب کے کلمات سے ہوتا ہے .

خطبات یا مجالس سبعہ/ تسعہ . عموماً ان کو سات مجالس کہا جاتا ہے ۔ لیکن چونکہ پہلی مجلس میں تین الگ الگ موضوعات زیر بحث آئے ہیں اس لئے ان کو نو مجالس کہنا چاہیے ۔ مولانا روم نے نو مرتبہ مسجد میں یا خانقاہ میں مختلف موضوعات پر تقریریں کیں یا وعظ کہے ۔ ان کے موضوعات مندرجہ ذیل ہیں :

سنت رسول ، اتحاد ملت کا سبب ، غزوۂ احد، شہادت امیر حمزہ ، برکات بسم اللّٰہ ، تقوی ، مؤمنامہ بصیرت کی توضیح ، ارتقائے انسانی سے مقام نبوت ، آداب زندگی، علم اور تزکیۂ نفس . ان خطبات کی زبان عربی آمیز ہے ۔ قرآن، حدیث ، اشعار اور حکایات و تماثیل سے مطالب کی توضیح کی گئی ہے ۔

دیوان

دیوان میں غزلیات و قصاید ، ترجیعات اور رباعیات ہیں . بقول ریپکا اشعار کی تعداد ۳۶۳۴۹ ہے . اس کا اکثر حصہ ۶۴۲ ھ یعنی شمس کی آمد اور ۶۵۲ ھ شمس کی جدائی اور استقرار حال یعنی صلاح الدّین زرکوب کی وفات ۶۶۲ ھ کے درمیان مکمل ہوا ۔

دیوان شمس تبریزی میں اکثر غزلیں وہ ہیں . جن میں شمس تبریزی کی شخصیت زیر بحث ہے ۔ کبھی وہ حاضر ہیں یعنی شاعر کے پاس موجود ہیں . وہ ان کی موجودگی سے پورا استفادہ کرناچاہتے ہیں ۔ وہ ان کے محبوب ہیں ۔ وہ ان کے ساقی ہیں . پیر و مرشد ہیں ۔ والہانہ طور پر ان کی بلائیں لینا چاہتے ہیں ۔ اور ایك لمحہ کیلئے ان سے جدا نہیں ہونا چاہتے ۔ انہوں نے نئے نئے رنگ سے ان کے قرب و وصال کو چاہا ہے .بعضی ایسی غزلیں ہیں جن میں اسے بت پرست صنم کہہ کر پکارا ہے ۔ اپنی محبت و شیفتگی کے اظہار کیلئے یہ تمام استعارات استعمال کیے ہیں ۔ جس شخص کو اس عشق کا پس منظر معلوم نہ ہو وہ ایسی غزلوں کو تغزل و رومانوی عشق کی داستان تصور کرے گا .

بعض غزلیں ایسی ہیں ۔ جن میں شمس تبریزی ، رومی کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں ۔ اور وہ ان کی غیر حاضری اورجدائی میں تڑپ رہے ہیں اور ان کو پانے کیلئے نالہ و فریاد کر رہے ہیں ۔ ایسی غزلوں میں وہ کسك و سوز موجود ہے جو ایك عاشق کی روح میں اپنے معشوق کیلئے ہوتا ہے. شمس تبریزی رومی کی نظر میں کیا مقام رکھتے تھے ۔ اور وہ ان کیلئے بے قرار و بے تاب کیوں تھے ۔ یہ جاننے کیلئے مندرجہ ذیل اشعار دیکھیے :

از پی شمس حق و دین دیدۂ گریان ما از پی آن آفتابست اشك چون باران ما

کشتی آن نوح کی بینیم هنگام وصال چونك هستیها نماند از پی طوفان ما

از فراق شمس دین افتاده ام در تنگنا او مسیح روزگار و درد چشم بی دوا

گر چه درد عشق او خود راحت جان منست خون جانم گر بریزد او ، بود صد خونبها

عشق شمس الدینست یا نور کف موسیست این این خیال شمس دین تا خود دو صد عیبیست این

عشق شمس حق و دین کان گوهر کانیست آن در دو عالم جان و دل را دولت معنیست آن

شمس تبریزی کی وفات کے بعد مولانا کی ارادت و عقیدت کا مطمع نظر صلاح الدّین زرکوب ہوگئے۔ان کے دیوان میں اکثر غزلیں ہیں جن میں انہوں نے زرکوب کو مخاطب کیا ہے ۔ ان کی تعریف کی ہے اور ان کی یاد میں بےقرار ہوئے ہیں۔ ان کے متعلق بھی چند اشعار قابل یادداشت ہیں :

صلاح الدّین یعقوبی جواهر بخش زرکوبان که دو خورشید اسرارست و علام الغیوب آمد
حکمت از شه صلاح الدین رسد آنك چون خورشید یکتا می رود
یکی گنجی پدید آمد در آن دکان زرکوبی زهی صورت زهی معنی زهی خوبی زهی خوبی

کچھ ایسی غزلیں بھی ہیں . جن میں تغزل اور رومانوی کیفیت کا بھرپور اظہار ہوا ہے ۔ شاعر کا محبوب گوشت پوست کا وجود رکھتا ہے ۔ وہ اس کا قرب چاہتاہے ۔ آغوش میں لینا چاہتا ہے ۔ تلذذ کی خاطر دست درازی بھی کرنا چاہتا ہے ۔ اس نے بے حجابی اور بے باکی سے ان احوال و کوائف کو بیان کیا ہے جو قرب و وصال کے وقت پیش آتے ہیں . مثلاً :

آن دلبر من آمد بر من زنده شد ازو بام و در من
گفتا بروم کاریست مهم در شهر مرا جان و سر من
گفتم بخدا گر تو بروی امشب نزید این پیکر من
آخر تو شبی رحمی نکنی بر رنگ و رخ همچو زر من

باغست و بهار و سرو عالی ما می نرویم ازین حوالی
بگشای نقاب و در فرو بند مائیم و تویی و خانه خالی
ای ساقی شاد کام خوش حال پیش آر شراب را تو خالی
تا خوش بخوریم و خوش بخسپیم در سایهٔ لطف لایزالی

غزلیات رومی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اوزان موسیقی سے ہم آھنگ ہیں ۔ خود مولانا موسیقی کے دلدادہ تھے ۔ اکثر اشعار میں مطرب کو نغمہ سرا ہونے کی دعوت دیتے ہیں ۔ چنگ و رباب کو ہم صدا کرنے کیلئیے آواز دیتے ہیں ۔ زیر و بم کے ساتھ ان کی روح وجد و کیف سے آشنا ہوجاتی ہے ۔ صاحب نفحات الانس کی یہ روایت درست ہے کہ وہ سر راہ صلاح الدّین زرکوب کی دکان کے پاس سے گزرے اور ہتھوڑی کی ضربات سن کر ان پر حال طاری ہوگیا اور وہ رقص کرنے لگے اور خود بخود شعر کہنے لگے ۔ اس سے نغمہ و سرود سے ہم آہنگ طبیعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۔ غنائیت غزل کاایک اساسی رکن ہے ۔ غزلیات روح کی چھوٹی بڑی بحور موسیقی سے ہم آہنگ ہیں ۔ الفاظ کی تکرار اور ردیف کی نوش نوائی قوالی کا سماں پیش کرتی ہے ۔ مولانانی کے شیدائی ہیں ۔ اس کی آواز سے انہیں عشق کی گرمی حاصل ہوتی ہے ۔ اور فراق یار کی فریاد سنائی دیتی ہے ۔ انہوں نے مثنوی معنوی کی ابتدا «حکایت نی » سے کی ہے اس سے پہلے انہوں نے ایک غزل میں «نی» کے متعلق اپنی شیفتگی کا اظہار کیا ہے :

ای نای خوش نوای کہ دلدار و دلخوشی دم می دھی تو گرم و دم سرد می کشی
ای نای سر بریدہ بگو سر بی زبان خوش می چشان ز حلق از آن دم کہ می چشی
آتش فتاد در نی و عالم گرفتہ دود زیرا ندای عشق ز نی هست آتشی

مندرجہ بالا نظریہ کی بنا پر مولانا سماع کے دلدادہ ہیں ۔ موسیقی کی تان پر ان کے دل کے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں اور وہ جھومنا شروع کر دیتے ہیں ان کے پیرو فرقہ مولویہ میں یہ رقص و سرود کی ریت جاری ہے ۔ سماع کے متعلق صوفیہ میں بھی اختلاف رہا ہے ۔ مولانا نے سماع کے جواز کے بارے میں اس طرح اظہار نظر کیا ہے ۔

سماع از بهر جان بی قرارست سبك هر چه چه جای انتظارست
سماع آرام جان زندگانیست کسی داند کہ او را جان جانست
سماع آنجا بکن کانجا عروسیست نہ در ماتم کہ آن جای فغانست
چنین کس را سماع و دف چہ باید سماع از بهر وصل دلستانست
کسانی را کہ رو شان سوی قبلہ ست سماع این جهان و آن جهانست
خصوصاً حلقہ ای کاندر سماعند همی گردند و کعبہ درمیانست

عشق کا موضوع غزل کی جان ہے ۔ عشق نہیں تو غزل نہیں ۔ عشق محبوب مجازی

کا ہو یا محبوب حقیقی کا یا پیر و مرشد کا ۔ ایك جذبہ سرشار ہے جو سراسر بیان میں ساری رہتا ہے ۔ مولانا نے جا بجا عشق کی تعریف کی ہے اور اس کی حقیقت سے آگاہ کیا ہے ۔ مثلاً :

آن روح را کہ عشق حقیقی شعار نیست نابودہ بہ کہ بودن او غیر عار نیست
در عشق مست باش کہ عشق مست ہرچہ ہست بی کاروبار عشق بر دوست یار نیست
عشقیست و عاشقیست کہ باقیست تا ابد دل بجز این منہ کہ جز مستعار نیست

بعض غزلوں میں مولانا نے خود اپنے دل و دماغ کی کیفیت بیان کی ہے ۔ راہ عشق میں جن منزلوں سے گزرے ہیں ۔ ان کا حال بتایا ہے ۔ طریقت کے ادوار عبادت و ریاضت کے بعد جو سوز و گداز پیدا ہوا ہے اور وہ اسی تب و تاب اندرونی سے دوچار ہوئے ہیں ، ان کی کیفیت برملا بیان کی ہے ۔ مثلاً یہ غزل :

می رسد بوی جگر از دو لبم می بر آید دودھا از یاربم
می بنالد آسمان از آہ من جان سپردن ہر دمی شد مذہبم
مکتب تعلیم عشاق آتش است من شب و روز اندرون مکتبم
روی خود بر روی زرد من بنہ دست نہ بر سینہ ام کاندر تبم

غزل رومی کا مہتمم بالشان موضوع تصوّف و سلوک کی تعلیم ہے ۔ مولانا ایك ماہر صوفی عالم کی طرح دل و دماغ اور نفس و روح کی کیفیات بتاتے ہیں پھر ان کی اصلاح و ترقی کیلئے ہدایات دیتے ہیں ۔ یہ غزلیں مولانا کی وسعت تجربہ اور دقیق النظری کی آئینہ دار ہیں ۔ مثلاً :

یکی لحظہ بنہ ای برادر چہ باشد از برای آزمون را
یکی دم رام کن از بہر سلطان چنین سگ را چنین اسب حرون را
تو دوزخ دان خود آگاھی عالم فنا شو کم طلب این سرفزون را
چنان اندر صفات حق فرو رو کہ بر نایی نبینی این برون را

اگر دل از غم دنیا جدا توانی کرد نشاط و عیش بہ باغ بقا توانی کرد
اگر بہ آب ریاضت برآوری غسلی ہمہ کدورتِ دل را صفا توانی کرد
ز منزل ہوسات ار دو گام پیش نہی نزول در حرم کبریا توانی کرد
بہ ہمت ارنشوی در مقام خاك مقیم مقام خویش بر اوج علا توانی کرد
اگر بہ جیب تفکر فروبری سر خویش گذشتہ ہای قضا را ادا توانی کرد

مولانا نے بعض غزلوں میں اپنے زمانے کی فکری ، روحانی اور معاشرتی زندگی پر بھی تبصرہ کیا ہے ۔ اور اس وقت کے انسانوں کی ذہنی اور اخلاقی سطح کا بھی نقشہ

کھینچا ہے ۔ ایك معرکۃ الآرا غزل کے چند اشعار اس کے متعلق ہیں :

دی شیخ با چراغ همی گشت گرد شهر کز دیو ودد ملولم و انسانم آرزوست
زین همرهان سست عناصر دلم گرفت شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتند یافت می نشود جسته ایم ما گفت آنکه یافت می نشود آنم آرزوست

مولانا روم شراب ، ساقی ، خم و پیمانه اور میکده و خرابات کی اصطلاحات تصوف و سلوك سے متعلق معانی و مفاہیم کیلئے استعمال کرتے ہیں ۔ بعض اوقات تو خود ہی اصطلاحات کا مفہوم واضح کر دیتے ہیں ۔ مثلاً بادۂ عشق ، میکدۂ الفت، خرابات محبت ، لیکن بعض جگه ان کو اسی طرح لغوی معنوں میں استعمال کیا ہے ۔ اسے مجازی معانی نہیں پہنائے جا سکے مثلاً یہ اشعار :

فرمای تو ساقی را ، آن شادی باقی را تا باد نه پیماید تا باده به پیماید
رطلی ز می باقی کز غایت راواقی هر نقش که اندیشی در دل به تو بنماید

مولانا وحدت انسانی کے قائل ہیں . جب دوئی کے پردے ہٹ جاتے ہیں تو ہر طرف خدائی خدائی نظر آتی ہے . بنی نوع انسان مخلوق خدا کی ایك برادری دکھائی دیتی ہے . قومی، مذہبی اور وطنی تعصب ختم ہو جاتا ہے ۔ صوفی بھی اپنے آپ کو ان میں سے ایك سمجھتا ہے ۔ اور نفرتوں سے بالا سمجھتا ہے ۔ مثلاً ان کے یہ اشعار :

چه تدبیر ای مسلمانان که من خود را نمی دانم نه ترسا نه یهودم من نه گبرم نه مسلمانم
نه شرقیم نه غربیم نه برّیم نه بحریم نه از کان طبیعت نه از افلاك گردانم
از هندم نه از چینم نه از بلغار و سقینم نه از ملك عراقیم نه از خاك خراسانم

غزل گوئی

رومی طبعاً شاعر نہیں تھے ۔ شمس تبریزی سے ملاقات ہونے سے پہلے انہوں نے شعر نہیں کہے ۔ اگر کہے ہیں تو ان کا وجود نہیں ۔ وہ اپنی شعر گوئی سے متعلق کہتے ہیں :

«من از بیم آنکه یارانم ملول نشوند، شعر می گویم تا به آن ملول شوند وگرنه من کجا و شعرکجا ۔ واللّٰه که من از شعر بیزارم و پیش من ازین بدتر چیزی نیست».(فیه مافیه).

ایك اور جگه فرمایا ہے :

هر چه باشد بر من تا که ازو لاف زنم هست مرا فن دگر غیر فنون شعراء

رومی کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ایك خاص کیفیت میں شعر کہنا شروع کر دیتے تھے ۔ جوں ہی ان میں شور و مستی کا غلبہ ہوتا اور بیخودی میں شعر کہنے لگتے اور حاضرین لکھتے جاتے ۔ چونکہ ان کے دل میں مرشد کیلئے شدید جذبہ موجزن تھا وہ ان کو بار بار پکارتے تھے اور اس طرح کلمات کو دہراتے ۔ اس طرح تأثر میں اضافه ہوتا. اگرچه کبھی کبھی تکرار بلاغت کے منافی ہوتی ہے ۔ لیکن شدت جذبه کی آمیزش کے

ساتھ کلمات کا استعمال بات میں اثر و نفوذ پیدا کرتا ہے ۔ مثلاً ذیل کے اشعار دیکھیے :

ای شمس دین ، ای شمس دین ، در من نگر ، در من نگر روزی شود کز جان و دل یکتا شوم یکتا شوم
ای عاشقان ، ای عاشقان ، پیـــدا شدم بر روی آن مه روی خود شیدا شوم شیدا شوم
بهار آمـد بهـار آمد ، بهار مشکبار آمـد نگار آمـد نگار آمـد ، نگار بردبار آمـــد

رومی کے زمانے تک غزل کی زبان صاف ، شستہ اور حشو و زاوید سے پاک ہوچکی تھی ۔ غزل سعدی اس کا بہترین نمونہ ہے ۔ یہ رومی کے معاصر تھے ۔ لیکن رومی اپنے جوش و ولولہ میں الفاظ کی فصیح و مصفا صورت کا خیال نہیں رکھتے ۔ ان کے کلام میں ترخیم ، اشباع ، تخفیف اور حروف زایدۂ کا استعمال عام ہے ۔ مثلاً یہ الفاظ :

ستارہ = استارہ ۔ اوان = آوان

ستون = استون ۔ پیرهن = پیراهان ۔ سپردنا = سپردن ۔ راوقی = راواقی ۔

مولانا اپنے زمانے کے متداول لیکن اب متروك اور بعض ترکی کے الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں ۔ کئی جگہ قافیہ کی فنی پابندی کی پروا نہیں کرتے ۔

کسی عاشق وارستہ یا کسی صوفی مجذوب کی غزلوں میں یہ جوش ، روانی اور عشق و فلسفہ کا امتزاج اور ادبی قواعد سے بے اعتنائی موجود نہیں ۔ رومی کا رہبر و رہنما عشق اور اس کا اندرونی جذبہ ہے ۔ ہر حادثہ واقعہ پُر زبان کھولنے پر مجبور کرتا ہے ۔ مولانا کی غزلیات میں احساسات و جذبات کا ایک طوفان ہے ۔ جو باہر امڈا چلا آتا ہے ۔ انہوں نے کہا ھے :

همه جوشم همه موجم سر دریای تو دارم یا خون چو می جوشد منش از شعر رنگی می دهم

عموماً غزل کا ہر شعر مختلف موضوع رکھتا ہے ۔ اور ہر شعر میں گوناگون فکر و خیال کا اظہار ہوتا ہے ۔ لیکن اس روایت کے برخلاف دیوان شمس کی اکثر غزلیں ایك کیفیت اور موڈ کا اظہار کرتی ہیں ۔ اور بیان میں ایك تسلسل لیے ہوتی ہیں ۔

رومی نہ صرف ایران کے بلکہ دنیا کے عظیم شاعر شمار ہوتے ہیں ۔ کسی اور شاعر میں جذب و حال ، شـور و هیجان ، دنیاوی علایق سے انقطاع اور بے کران و بے غایت کی طرف حرکت و پرواز موجود نہیں ۔

می جهد شعلۂ دیگر ز زبانِ دل من تا ترا وهم نباید که زبانیم همه

مثنوی معنوی

مثنوی دس سالوں میں یعنی ۶۶۲ سے ۶۷۲ ھ تك یعنی مولانا کے سال واپسین تك تکمیل کے مراحل طے کرتی رہی ۔ اس مثنوی کے محرك حسام الدین چلپی مولانا کے

مرید مخلص تھے ۔ مولانا بولتے جاتے اور حسام لکھتے جاتے اس کےدرمیان میں زوجۂ چلپی کی وفات پر اور مولانا کی بیماری پر سلسلۂ تألیف رك بھی گیا ۔ کل چھ دفتر مکمل ہوئے ۔

مثنوی ابواب و فصول میں مرتب نہیں ۔ جیسے جیسے موضوعات ابھرتے رہے ان پر اظہار خیال ہوتا رہا ۔ ایك موضوع کے درمیان دوسرے موضوع آگئیے تو پھر سلسلہ کلام پہلے سے ملا دیا جاتا ۔

مثنوی گنجینۂ معارف اور خزینۂ اسرار و رموز تصوف ہے ۔ اس میں قرآن اور حدیث اقوال عرفا سے استفادہ کیا گیا ہے ۔ اخلاق و عرفان و فقہ و کلام کے بے شمار مسائل زیر بحث آئے ہیں ۔ خدا کائنات و حیات کے متعلق فلسفیانہ اور حکیمانہ نکات بیان کئے گئے ہیں ۔ روحانی زندگی کا اعلی و ارفع تصور پیش کیا گیا ہے یہ کتاب علم کا ہدایت نامہ اور زندگی کا منشور ہے ۔

مولانا نے مثنوی میں اکثر حکایات و تمثیلات سے کام لیا ہے ۔ کہانی یا تمثیل بیان کرکے نتیجہ اخذ کیا ہے ۔ اور منطقی استدلال سے اپنے فکر و خیال کو مؤید و مؤکد کیا ہے ۔

ما قبل اخلاقی و عرفانی مثنویوں کی طرح مثنوی معنوی حمد و ثنا ، نعت، معراج، منقبت مرشد مدح سلطان جیسی تمہیدات کے بغیر غیر رسمی طور پر شروع کی گئی ہے ۔ لیکن آغاز میں ہی مطالب مثنوی کا لب لباب پیش کر دیا ہے ۔

مثنوی کی عالمگیر شہرت کا سبب اس کا سوز و اخلاص ہے ۔ جو ہر قلب حساس کو متأثر کرتا ہے ۔ مثنوی اکثر ایك خاص لے میں بانسری سے ہم آہنگ پڑھی جاتی رہی ہے ۔ اس لیے سننے والوں کی پوری جماعت کو وجد میں لاتی رہی ہے ۔

مولانا روم نے دفتر چھارم کے نثری دیباچے میں مثنوی کے متعلق لکھا ہے کہ «دوستوں کیلئے یہ نور ہے اور اخلاف کیلئے خزانہ »۔

رومی صوفی شعراء میں سے سنائی اور عطار سے متأثر ہیں ۔ چنانچہ انھوں نے مثنوی میں سنائی کو حکیم غزنوی کہہ کر پکارا ہے ۔ ان کے اشعار کو بھی جزو مضمون بنا لیا ہے ۔ عطار کی بعض حکایات کو بھی اپنا لیا ہے ۔ مولانا روم کہتے ہیں :

عطار روح بود و سنائی دو چشم او ما از پی سنائی و عطار آمدیم

صوفی بزرگوں میں سے ذوالنون مصری ، سلطان ابراہیم ادھم ، بایزید بسطامی ، شبلی اور محمّد بن حسین بن منصور حلاج رومی کے عزیز بزرگ تھے ۔ ان کے متعلق حکایات مثنوی کے مختلف دفتروں میں ملتی ہیں ۔ بایزید بسطامی اور حلاج کے نظریہ

تصوف سے وہ ہم آھنگ تھے ۔ انہوں نے انا الحق کہنے کی جا بجا تشریح و توضیح کی ہے ۔

تصوّف پر مندرجہ ذیل کتابیں تألیفہو چکی تھیں ۔

۱- کتاب اللمع از ابو نصر سراج ۔ ۲- کتاب التعرف از کلاباذی ۔

۳- کشف المحجوب از علی هجویری ۔ ۴- قوت القلوب از ابو طالب مکی ۔

۵- رساله قشیریه از قشیری ۔

ان کتابوں کے علاوہ باقی کتابیں رومی کے پیش نظر تھیں ۔ مثنوی میں ان کتابوں کے حوالوں سے بعض مضامین زیر بحث لائے گئے ہیں ۔

رومی کے معاصر صوفی فلسفی ابن عربی (م - ۶۴۰ / ۱۲۴۰) کا بڑا چرچا ہوا ۔ مولانا روم کی عمر ۳۵ سال تھی ۔ خیال ہے کہ صدرالدّین قونوی کی معرفت ان کے خیالات سے متأثر ہوئے ہونگے ۔ ابن عربی کا نظریہ ہے کہ بادشاہ رعایا کا غلام ہے ۔ کیونکہ رعایا کے بغیر بادشاہ نہیں ۔ اسی طرح محبوب کیلئے عاشق لازمی ہے ۔ اور محبوب بھی عاشق ہے ۔ یعنی عشق حسن کا طلبگار ہے تو حسن بھی عشق کا محتاج ہے ۔ خدا اس سے محبت کرتا ہے جو اس سے محبت کرتا ہے ۔ خدا جس سے محبت کرتا ہے اس پر بے خودی طاری کر دیتا ہے ۔ اور وہ دونوں ایک ہو جاتے ہیں یعنی ایک ہی محبوب اور ایک ہی محب ۔ رومی نے اس نظریے کو مندرجہ ذیل اشعار میں بیان کیا ہے ۔

جمله شاهان بندۀ بندۀ خوداند جمله خلقان مردۀ مردۀ خوداند
می شود صیاد مرغان را شکار تا کند ناگاه ایشان را شکار
دلبران را دل اسیر بیدلان جمله معشوقان شکار عاشقان

سعی و عمل

رومی عام صوفیه کی طرح رضا بالقضا کے قائل نہیں ۔ یعنی صرف توکل کرکے سعی و عمل چھوڑ کر گوشۀ نشین ہو جائیں ۔ وہ جدوجہد اور عمل پیهم کی تاکید کرتے ہیں ۔

اندرین ره می تراش و می خراش تا دم آخر دمی فارغ مباش
کسب کن ، سعی نما و جهد کن تا بدانی سر علم من لدن

مقصود و مطلوب کیلئے کوشش کرنا کامیابی کی کلید ہے ۔

این طلب مفتاح مطلوبات تست این سپاه و نصرت رایات تست

مسلمانوں کیلئے جنگ و جدل اور خلافت و تمکن حاصل کرنے کا حکم ہے ۔ نہ کہ خانقاہوں اور غاروں میں عزلت گزینی کا کیونکہ یہ تو عیسائیوں کی رہبانیت ہے ۔

مصلحت در دین ما جنگ و شکوه مصلحت در دین عیسی غار و کوه

جدوجہد سے انسان نور و مستی حاصل کرتا ہے ۔

«جہد کن تا مست و نورانی شوی »

جبر و اختیار

اگرچہ مولانا کہتے ہیں ۔ جبر و اختیار کا مسئلہ پیچیدہ ہے ۔ لیکن انہوں نے بہت سی مثالیں دے کر سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اختیار کے حق میں انہیں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں ۔ کہ ایك تو جبلی طور پر انسان کو نیکی و بدی کا احساس عطا ہوا ہے ۔ آدمی کو اختیار ہے کہ وہ نیکی کا راستہ اختیار کرے یا برائی کا ۔ کیونکہ اگر کسی کام میں آدمی کو ارادہ و اختیار حاصل نہیں تو پرسش اعمال و مکافات کا قانون بے کار ہو جاتا ہے ۔ اللہ کا عذاب و ثواب دینے کا بھی حق نہیں رہتا ۔ اگر آدمی یہ سمجھے کہ وہ مجبور محض ہے ، اس کی قسمت میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا ۔ پھر اس کا اس میں کچھ دخل نہیں ۔ اس سے تو خدا کے قہار و رحیم ہونے پر حرف آتا ہے ۔ کائنات کی کوئی شے اپنے اعمال کی جوابدہ نہیں رہتی ۔ دنیا کا سارا نظم و ضبط بے معنی ہو جاتا ہے ۔

خدا علام الغیوب ہے وہ خالق و قادر ہے ۔ وہ تمام اسرار کائنات سے آگاہ ہے ۔ اس نے کائنات کو چلانے کیلئے قوانین و ضوابط نافذ کیے ہیں ۔ انہی کے مطابق سارا نظام چلتا ہے ۔ ہر کام کی کوئی نہ کوئی علت ہوتی ہے ۔ انسان ان سب قوانین سے آگاہ نہیں اسے معلوم نہیں کہ آئندہ اس پر کیا گزرے گی ۔ اس لیے اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے مستقبل کیلئے محنت نہ کرے ۔ اسے چاہیے کہ وہ اپنی طرف سے کوشش کرے اور اس کا نتیجہ و ثمرہ رضائے الہی پر چھوڑ دے ۔ وہ خیر کا بدلہ ضرور دے گا۔ اور ظلم کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔

خدا ان کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں ۔ رضائے الہی طلب کرنے والوں کیلئے خدا خود ان کا دست و بازو بن جاتا ہے ۔

در خرد جبر از قدر رسواترست زانکہ جبری حسن خود را منکرت

جمادات و نبادات اختیار نہیں رکھتے اس لیے قانون مکافات ان پر عاید نہیں ہوتا ۔

عشق

عشق غایت آرزو ہے کسی کو حاصل کر لینے کا شدت عمل ہے ۔ اگر مقصود عالی ہو تو عاشق قربانی دینے کیلئے آمادہ ہوتا ہے ۔ وہ تمام قوتوں کو اس کے حصول کیلئے مرکوز کرتا ہے ۔ اس میں ایسی قوت آجاتی ہے کہ بقول رومی :

عشق جوشد بحر را مانند دیگ عشق ساید کوہ را مانند ریگ

عشق بشکافد فلك را صد شگاف　　عشق لرزاند زمین را از گزاف

عشق ایك ایسا عزم بالجزم ہے اور کام کرنے کی بے پناہ تڑپ ہے کہ وہ زندگی کے گوناگون اعمال میں ایك حرکت و تغییر پیدا کرنے کی اہلیت رکھتی ہے ۔ رومی کہتے ہیں :

از محبت تلخہا شیرین شود　　از محبت مسہا زرین شود
از محبت دردها صاقی شود　　از محبت دردها شافی شود

اگر عشق کا مطمح نظر باری تعالی ہو تو انسان تمام دیگر علایق سے کٹ کر اس کی طرف لگ جاتا ہے . تمام رکاوٹوں کو دور کرتا ہے ۔ یعنی تمام نفسانی خواهشات اور اخلاق ذمیمہ ہوس ، حسد ، کینہ نخوت کٹ جاتے ہیں ۔ یہ گویا عشق کی برکت اور اس کا ثمر ہے . اس لیے مولانا عشق کو کہتے ہیں کہ :

شادباش ای عشق خوش سودای ما　　ای طبیب جملہ علتہای ما
ای دوای نخوت و ناموس ما　　ای تو افلاطون و جالینوس ما

رومی نے اکثر جگہ عشق کو آگ سے تشبیہ دی ہے . عشق ایسا شعلہ ہے جو چیزوں کو بھسم کرکے اپنے اندر جذب کر لیتا ہے ۔ عاشق ایسا فولاد ہے جو آگ میں داخل ہوتا ہے . اور آگ کی تب و تاب و سوز سے آگ کی مانند زرد و گرم ہو جاتا ہے ۔ اور گویا اسکے مثل ہو جاتا ہے ۔ یہی خیال عاشق کا ہے وہ آتش عشق محبوب حقیقی میں اپنے آپ کو اس قدر مدغم کر دیتا ہے . کہ محبوب کی تمام صفات یعنی گرمی و روشنی سے منصف ہو جاتا ہے ۔ دوسرے معنوں میں اس میں اوصاف خداوندی پیدا ہوجاتے ہیں :

رنگ آهن محو رنگ آتش است　　ز آتشی می لافد و آهن وش است
چوبہ سرخی گشت همچو زر کان　　پس انا النار است لافش بی گمان

عشق میں ایك منزل ایسی آتی ہے کہ عاشق سب کچھ مٹا کر محبوب کی ہستی میں کھو جاتا ہے ۔ وہ اب خود نہیں رہتا ۔ همہ تن وہی ہوجاتا ہے ۔ حسین بن منصور حلاج کی بھی یہی کیفیت تھی کہ وہ ہستی خداوندی میں اس قدر جذب ہوگئے تھے کہ وہ اپنی انا فنا کرکے بقا حاصل کرچکے تھے . اسلئے انہوں نےجب انا الحق کہا تو وہ خود نہیں بول رہے تھے بلکہ خدا بول رہا تھا . اس نکتہ کو ظواہر پرست نہیں سمجھ سکتے تھے ۔ مولانا روم اس حقیقت کو جانتے تھے انہوں نے مشہور کے اس پکار کو حق جانا ۔

گفت منصوری انا الحق و برست

عموماً صوفیہ کا یہ نظریہ ہے کہ خدا حسن مطلق ہے ۔ اس نے چاہا کہ وہ پہچانا جائے تو اس نے عشق پیدا کیا اور آدم میں حسن کیلئے جذب و کشش پیدا کردی تا کہ وہ اس

کی طرف لپك کے آئے ۔ چونکه انسان حسن عریاں کی تاب نہیں لا سکتا . خدا نے مظاہر قدرت میں اپنے حسن کو نمایاں کیا تا که وہ ان کو دیکھ کر ان کے خالق کو یاد کرے اور اس کی خالقیت کو پہچانے ۔ رومی کا خیال ہے که انسانی حسن اس حسن مطلق کا با کمال پرتو ہے .خاص طور پر عورت کا حسن اپنی تمام رعنائیوں سے جلوہ افروز ہے ۔ اور اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا ہے ۔ مولانا نے بڑی جرأت سے کام لیا ہے که عورت کو جمال الٰہی کا پرتو قرار دیا ہے ۔ ورنه اکثر صوفیه تو نوجوان امرد کو ہی حسن مطلق کا جلوہ سمجھتے تھے اسلئے اس سے محبت کرتے تھے اور حسن مطلق تك رسائی کا ایك واسطه جانتے تھے ۔

عقل و ایمان

رومی کے نزدیك عقل کی افادیت مسلم ہے۔ لیکن عقل شك و گمان و استدلال سے کام لیتی ہے اور کشف حقایق میں عاجز رہتی ہے۔ عشق یا علم ایمان و ایقان ایسی قوت ہے جو اصل حقیقت کے مشاہدہ میں مدد دیتی ہے ، رومی کہتے ہیں :

زانکه هست اندر طریق مفتتن علم کمتر از یقین و فوق ظن
علم جویای یقین باشد بدان و آن یقین جویای دیدست و عیان
دید زاید از یقین بی احتمال آنچنانکه از ظن می زاید خیال

عقل مفید ہے لیکن عشق و ایمان کے بغیر وہ تباہی کی طرف بھی لے جاسکتی ہے .
عقل و عشق میں تصادم ہے عقل راہ عشق میں کام نہیں آتی. رومی کہتے ہیں :

به خرد راه عشق می پویی به چراغ آفتاب می جویی

رومی اور مسئلۂ ارتقاء

رومی فرماتے ہیں که اے انسان تو پہلے جماد تھا ، پھر نبات ہوا ۔ بعد میں حیوان اور پھر علم و ایمان والا انسان بنا ۔ ان کا خیال ہے یه ارتقا رکے گا نہیں بلکه انسان فرشته بن جائے گا اور اس کا مقام آسمان ہوگا ۔ اس کے بعد فرشتگی سے بھی بالاتر ہو کر بحر بیکراں میں جا ملے گا .

جماد سے انسان تك کے تخلیقی ارتقا سے متعلق تو قرآن سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے ماده سے نباتات پیدا ہوئیں ۔ ان میں ازواج قائم کیے جو بعد میں ارتقا پا کر حیوان اور انسان میں تکمیل پذیر ہوسکے ۔ جن میں جاندار بننے تك جو صورتیں پیدا ہوتی ہیں وہ بھی تخلیقی ارتقا کی آئینه دار ہیں ۔ اس کے بعد مولانا کا یه نظریه که آدمی ترقی پا کر فرشته بن جائے گا . یه مادی ارتقا سے ماوراء بات ہے ممکن ہے انسان روحانی ترقی پا کر ایسی صفات کا حامل ہو جائے جو فرشتوں سے مخصوص ہیں ۔ اس

سے اگلی ارتقائی صورت یہ ہے کہ اسے قرب خداوندی حاصل ہو جائے اور خدا کی قوتوں یعنی ملائکہ میں شامل ہوجائے ۔

دوسری طرف مولانا کا نظریہ ہے :

من آن روز بودم که اسما نبود   نشان از وجود مسمٰا نبود
ز ما شد مسمّا و اسما پدید   در آن روز کانجا من و ما نبود

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان روح تھا ۔ اور عالم ارواح میں تھا ۔ اور خدا کے قریب ۔ پھر انسان کو جسم عطا ہوا اور وہ مادی زندگی سے آلودہ ہو کر اس دنیا میں آگیا اور اپنے مرکز سے جدا ہوگیا ۔ دنیا کی دلچسپیاں اسے خدا سے غافل کر دیتی ہیں اور ان میں الجھ کر اپنی اصلیت سے دور ہو جاتا ہے ۔ لیکن اپنی حقیقت سے باخبر روح اپنے اصل کی طرح جاننے کیلئے بے قرار رہتی ہے اور اس جسد عنصری سے آزاد ہو کر پھر اپنے مقدس عالم ارواح میں جانا چاہتی ہے ۔ مولانا نے اپنی مثنوی کا آغاز تمثیلاً اسی بے قرار روح کی فریاد سے کیا ہے :

بشنو ازنی چون حکایت می کند   وز جدائیہا شکایت می کند

مولانا کے نزدیك زندگی کی تمام جدوجہد یہ ہے کہ وہ تمام بندھنوں سے روح کو آزاد کرے اور اپنی حقیقی منزل پر پہنچنے کی کوشش کرے ۔ تمام سلوك و طریقت کا مقصد و مآب یہی ہے ۔

وحدت وجود و وحدت شہود

وحدت وجود کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے سوا اور کوئی چیز موجود نہیں یعنی ہمہ اوست ۔ تمام مظاہر میں خدا موجود ہے ۔ ہر چیز کی اصل خدا ہے ۔ مثلاً حباب و موج نام مختلف ہیں لیکن اصل پانی ہے یا دھاگے میں گرہیں اپنا نام رکھتی ہیں لیکن اصل دھاگہ ہی ہے ۔ ہر چیز کو خدا کہہ سکتے ہیں ۔ وحدت شہود میں ایسا کہنا جائز نہیں ۔ تمام مظاہر ہستی مطلق کے پرتو ہیں ۔ سایہ کو خدا نہیں کہا جا سکتا ۔ وحدت وجود میں شخصیت فنا ہو جاتی ہے ۔ وحدت شہود میں شخصیت قائم رہتی ہے ۔ مثلاً چراغ آفتاب کی روشنی میں کم ہو جاتا ہے ۔ لیکن اپنی روشنی قائم رکھتا ہے ۔ اور آگ میں آگ کی مانند سرخ و گرم ہو جاتا ہے اور انا النار بھی کہہ سکتا ہے ۔ لیکن وہ آگ نہیں بن جاتا ۔ جب یہ صفات نہیں رہتیں تو لوہا اپنی ہستی الگ قائم رکھتا ہے ۔

مولانا کی مثنوی میں وحدت وجود اور وحدت شہود ، دونوں قسم کے خیالات کا اظہار ہوا ہے ۔ مثلاً وحدت وجود کے متعلق ان کے یہ اشعار :

جملہ معشوق است و عاشق پردہ ای

گر هزاران اند یك کس بیش نیست   جز خیالات عد و اندیش نیست
بحر واحدانیست جفت و زوج نیست   گوهر و ماهیش غیر موج نیست

وحدت شهود کے متعلق آہن اور آتش کی مثال مثنوی میں موجود ہے ۔

رنگ آهن محو رنگ آتش است   ز آتشی می لافد و آهن وش است
چون به سرخی گشت همچو زرکان   پس انا النار است لافش بیگمان

مرد خدا

انسان روحانی مراحل طے کرکے ایك ایسے ارفع مقام پر پہنچتا ہے که وہ اپنے آپ کو همه تن صفات خداوندی سے متصف کرتا ہے وہ راضی برضائے خداوندی ہوتا ہے ۔ اور خدا اس سے راضی ہوتا ہے ۔ ایسی حالت میں خدا ان کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ اور ان کے فعل کو اپنا فعل کہتا ہے ۔ ایسا شخص قوت و حرمت کا مالك ہوتا ہے اور تسخیر ارض و سماء پر بھی تمثیلا اختیار رکھتا ہے ۔ مولانا روم نے ایسے شخص کی طرف جا بجا اشارے کیے ہیں ۔ مثلاً :

مرد خدا شاه بود زیر دلق   مرد خدا گنج بود در خراب
مرد خدا دارد صد ماه و چرخ   مرد خدا دارد صد آفتاب
مرد خدا عالم از حق بود   مرد خدا نیست فقیه کتاب

دوسری جگه اس کی صفات گنوائی ہیں :

به زیر کنگرهٔ کبریاش مردانند   فرشته صید و پیمبر شکار و یزدان گیر

جو شخص خدا کو اپنا لیتا ہے ۔ خدا اس کے اندر قوت و تأثیر پیدا کر دیتا ہے که وہ جہان کو مسخر کرنے اور اس پر حکمرانی کے قابل ہو جاتاہے :

هر که عاشق شد جمال ذات را   اوست سیّد جمله موجودات را

معاشرتی اصلاح

مولانا روم نے انفرادی اور اجتماعی اخلاق و کردار سنوارنے کیلئے جو نصیحتیں کی ہیں ۔ وہ معاشرتی اصلاح کیلئے بڑا سرمایه ہیں ۔ مثنوی ایسے جواہر بے بہا سے معمور ہے ۔ واعظ و خطیب کیلئے نہایت مفید مآخذ ہے ۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں ۔

علم و حکمت زاید از نانِ حلال   عشق و رقت آید از نان حلال
کار مردان روشنی و گرمی است   کار دو نان حیله و بی شرمی است
دوست دارد دوست این آشفتگی   کوشش بیهوده به از خفتگی
علم را بر تن زنی مارے بود   علم را بر دل زنی یارے بود
آنچه شیران را کند روبه مزاج   احتیاج ای احتیاج ای احتیاج

شیخ سعدی شیرازی

تاریخ گزیدہ ، نفحات الانس اور مجمل فصیحی جیسے اکثر تذکروں اور تاریخوں میں ان کا نام مشرّف الدّین یا مشرف الدّین مصلح شیرازی لکھا ہے ۔ لیکن نام ، لقب اور کنیت کے سلسلے میں قدیمترین معاصر شہادت ابن الفوطی کی ہے ۔ جس نے ۶۸۵ ھ میں شیخ سعدی کو خط لکھ کر اُن سے اُن کے عربی اشعار کا نمونہ مانگا ۔ اس نے اپنی کتاب مُعجم الالقاب میں سعدی کا نام و نسب اس طرح درج کیا ہے ۔ اور یہی معتبر ہے :

« مُصلح الدّین ابو محمّد عبداللّٰہ بن مشرف الدّین ابو عبداللّٰہ بن مُصلح بن مشرف. »

سعدی کے سالِ ولادت کے بارے میں دیباچۂ گُلستان میں یہ شعر درج ہے :

ای کہ پنجاہ رفت و در خوابی مگر این پنج روزہ دریابی

گُلستان ۶۵۶ ھ میں تألیف ہوئی ۔ بعض مؤرخین نے ۶۵۶ سے ۵۰ منفی کرکے ۶۰۶ ھ سالِ ولادت قرار دیا لیکن بوستان مؤلّفہ ۶۵۵ ھ میں مندرجہ ذیل دو شعر درج ہیں :

ای کہ عُمرت بہ هفتاد رفت مگر خفتہ بودی کہ برباد رفت
چو پنجاہ سالت برون شد ز دست غنیمت شمر پنج روزی کہ هست

اس لیے ۶۰۶ ھ سالِ ولادت مشتبہ ہوگیا ۔ سعدی نے بعض دوسرے واقعات کا ذکر کیا ہے ۔ جن سے ان کے سالِ ولادت کے تعیّن میں مدد مل سکے گی ۔ مثلاً :

۱- سعدی نے بوستان میں ذکر کیا ہے کہ وہ غیاث الدّین پیر خوارزمشاہ کے حملے سے پہلے (۶۲۱ ھ) اصفہان میں تھے جہاں ایک تنومند جوان سے ان کی دوستی ہوئی ۔ پھر دوبارہ اُس سے ملاقات ہوئی تو بڑھاپے سے اُس کے بال سفید ہوچکے تھے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ سعدی بھی اس وقت بڑی عمر کو پہنچے ہونگے ۔

۲- بوستان میں مذکور ہے :

سفر کردہ بودم ز بیت الحرام در ایّام ناصر بہ دارالسلام

ناصر الدّین اللّٰہ عبّاسی کا آخری سالِ حکومت ۶۲۲ ھ تھا ۔

۳- دیدن سرهنگ زادہ در سرایِ اغلمش (۶۱۱ ھ - ۶۱۴ ھ)

۴- جامع مسجد کاشغر میں اُن کی حاضری (۶۰۶ ھ)

۵- ۶۱۳ - ۶۱۴ ھ میں شمال مشرقی ایران میں خوارزمشاہ کی حکومت تھی ۔ سعدی ۶۱۳ ھ میں طویل سفر کیلئے روانہ ہوئے اور اصفہان ، رے ، خراسان ، ماوراء النہر، کاشغر ، بلخ، بامیان، اور سند و ہند پہنچے ۔ پھر بحری راستے سے حبشہ ، یمن ، حجاز ، بغداد ، دمشق ، بیت المقدس ، مصر، بعلبک ، بیابانِ قدس، طرابلس ، حلب،

اماسیه ، دیار بکر ، گنجه ، کوفه ، بصره ، کش اور ہرمز گئے ۔ وہ بغداد سے شام گئے اور ۶۴۳ ھ تک شام میں مقیم رہے ۔ ۶۳۶ ھ سے پہلے وہ بیت المقدس پہنچ چکے تھے ۔ چالیس سال کے بعد وہ دوبارہ شیراز میں پہنچے ۔

۶- دمشق میں قحط (۶۴۳ ھ) کے وقت سعدی وہاں موجود تھے ۔

۷- اماسیہ میں بابا اسحاق کفر سودہ سے ان کی ملاقات ۶۳۰ ھ کے قریب ہوئی ۔

سرائے اغلمش (۶۱۱ھ - ۶۱۴ ھ) اور جامع کاشغر (۶۰۶ ھ - ۶۱۶ ھ) میں سعدی کا ورود اور ۶۱۳ ھ میں اُن کے طویل سفر کا آغاز یقینی ہے ۔ اس لیے ۶۰۶ ھ سالِ ولادت درست نہیں ہوسکتا ۔ سعدی کا دوسرا بیان کہ بوستان کی تألیف کے وقت ان کی عمر ستّر سال تھی زیادہ قرینِ قیاس ہے ۔ اس طرح اُن کا سالِ ولادت ۶۵۵- ۷۰ = ۵۸۵ نکلتا ہے ۔ اور دوسرے واقعات سے کڑیاں ملانے میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی ۔

سعدی کا سالِ وفات تاریخ گزیدہ میں ۶۹۰ ھ ، مجمل فصیحی میں ۶۹۱ ھ ، ابن الفوطی کی الحوادث الجامعہ میں ۶۹۴ ھ درج ہے لیکن از رُوئے تحقیق سعدی ۲۷ ذی الحجہ ۶۹۱ ھ میں فوت ہوئے ۔

اب تک یہی خیال کیا جاتا تھا کہ سعدی نے اپنا تخلّص اتابك سعد زنگی(۵۹۱ ھ - ۶۲۳ ھ) یا سعد بن ابابکر بن سعد کے نام کی مناسبت سے سعدی رکھا ۔ اُستاد محمّد طباطبائی نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ایك شیرازی الاصل خاندان دمشق میں آباد تھا جس کا سربراہ فقیہ ابوالفرج عبدالواحد بن محمّد الانصاری سعدی عبادی خزرجی گُزرا ہے ۔ پانچویں صدی ہجری میں وہ فرمانروائے سلجوق کا منظورِ نظر تھا ۔ اس خاندان کی نسبت حضرت سعد بن عبادہ خزرجی صحابی سے ہے ۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو سعدی لکھتے آئے ہیں ۔ اغلب ہے کہ سعدی نے بھی اس نسبت سے اپنا تخلّص سعدی رکھا ہو ۔

گلستان باب دوم میں ابوالفرج ابن جوزی سے سعدی کی ملاقات کا ذکر ہے ۔ جس میں ان کو ترکِ سماع کی نصیحت کی گئی ہے ۔ سوانح نگاروں نے اس کو جمال الدّین عبدالرّحمن ابوالفرج الجوزی ، واعظ ، عالم ، مورّخ بغدادی (م - ۵۹۷ ھ) مشخّص کیا ۔ جن محققین نے سعدی کا سالِ ولادت ۶۰۶ ھ یا ۶۰۵ ھ مانا تھا ان کیلئے یہ مشکل در پیش تھی ۔ عبّاس اقبال آشتیانی نے ایك اور جمال الدّین عبدالرّحمن بن جوزی کی نشاندہی کی جو قبل الذکر ابن جوزی کا پوتا تھا ۔ اور اپنے دادا کے لقب و کنیت سے معروف تھا ۔ اور جو المستعصم باللّٰہ (۶۴۰ ھ - ۶۵۶ ھ) کے عہدِ حکومت میں بغداد کا محتسب تھا ۔ چنانچہ گلستان کی یہ کہانی اس دوسرے ابن جوزی سے منسوب ہونے لگی ۔

استاد طباطبائی نے انکشاف کیا ہے کہ ابوالفرج عبدالواحد انصاری کے پوتے تواریخ شام میں « النّاصح ابوالفرج عبدالرّحمن بن نجم الدّین عبدالوّھاب بن شیخ ابوالفرج جوزی السعدی العبادی الشیرازی الاصل الدمشقی معروف بہ ابن الحنبلی کے القاب سے مذکور ہیں ۔ یہ ابوالفرج دمشق میں پیدا ہوئے ۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ ۵۸۵ ھ میں فتحِ بیت المقدّس کے موقع پر صلاح الدّین ایوبّی کے ہمراہ تھے ۔ ۶۲۰ ھ میں موفق مقدّس شیخ حنبلیاں کی وفات پر وہ حنبلیوں کے معاملات کی نگرانی کیلئے عراق سے شام آئے اور وہ ۶۳۴ ھ تک زندہ تھے اور رُشد و ہدایت میں مصروف تھے ۔ چنانچہ اغلب ہے کہ سعدی بھی اپنے سفر کے بعد دمشق آئے ہوں اور اس شیرازی الاصل ابنِ جوزی سے ان کی ملاقات ہوئی ہو اور انہوں نے ہی سعدی کو ترکِ سماع کا مشورہ دیا ہو ۔

تألیفات

نظم : بوستان ، دیوان قصائد ، طیبات ، بدایع ، خواتیم ، غزلیات قدیم ، صاحبیہ ، مفردات ، مطائبات ، ھزلیات ، مضحکات ، رباعیات ، الترجیعات ، المقطّات ، المراثی ، المعمیات .

نثر : نصیحۃ الملوك ، رسالہ در عقل و عشق ، در تربیت یکی از ملوك ، مجالس پنجگانہ ، تقریراتِ ثلاثہ ، در تقریر دیباچہ ، گلستان .

شخصیّت

سعدی ایك جامع و ممتاز شخصیت ہیں . ان میں زہد و تقوی ، اخلاق و تصوّف ، عشق و مستی اور ایسی علمی و عملی خصوصیات موجود ہیں کہ ادبیات ایران میں شاید ہی ایسا جَامعُ الصّفات شخص موجود ہو ۔ جہانگردی ، تجربہ آموزی ، پیری میں جوانی ، جوشِ تمنّا ، نصیحت آموزی اور مصلحت بینی جیسی متضاد کیفیّات اُن کی ذات میں جمع ہیں ۔ اور وہ ایك بھرپور انسان کی حیثیت میں نظر آتے ہیں . انہوں نے انفرادی و اجتماعی زندگی اور معاشرے کی اصلاح کیلئے جو نصیحتیں کی ہیں وہ ایك ماہر فلسفی اور عظیم مفکّر و مدبّر ہی کر سکتا ہے ۔

سعدی میں واعظ و خطیب کی تمام صفات موجود ہیں ۔ یہ خدمت انجام دینے کیلئے انہوں نے تاریخ و سیرت ، آداب و اخلاق ، تدبیر منزل اور سیاستِ مدن سے متعلّق عُلمائے قدیم کے عقائد و آراء کا مطالعہ کیا ۔ جوانی میں وہ شاعر، فقیہ ، مفسّر ، متکلّم اور واعظ و خطیب شمار ہوتے تھے ۔ بعد میں انہوں نے دُنیا بھر کی سیر و سیاحت ، عوام و خواص سے روابط اور ان کی نفسیات سے آگاہی حاصل کی ہے اور عملی تجربات سے مالامال ہوئے ۔ اس لیے ایسا شخص ہی حق رکھتا ہے کہ دوسروں کو عملی زندگی کے

تجربات سے آگاہ کرے اور بے باکی سے نصیحت و ملامت کرے ۔ انہوں نے لکھا ہے :

دوست دارم که همه عُمر نصیحت گویم   یا ملامت کنم و نشنود الاّ مسعود

وہ اپنی بے مثال شخصیت کے متعلّق خود لکھتے ہیں :

هرکس بزمانِ خویشتن بود   من سعدیِ آخر الزّمانم

دوسرے بڑے بڑے شعراء نے بھی سعدی کو اُستادِ غزلَ تسلیم کیا ہے ۔ اور اس کی عظمت کا اعتراف کیا ہے اوراس کی خوبیوں کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے :

در شعر سه تن پیمرانند   هر چند که لانبی بعدی
ابیات و قصیده و غزل را   فردوسی و انوری و سعدی

ع - سخن مُلکی ست سعدی را مسلّم

ع - استادِ غزل سعدی ست پیش همه کس امّا

قصیده سرائی

قصاید کا نام لیتے ہی خیال ہوتا ہے کہ یہ مدحیه قصاید ہونگے لیکن ایسا نہیں ۔ ہیأت قصیدہ کی ہے ۔ مدحیه قصاید کے علاوہ حمد ، نعت ، توحید اور پند و موعظت پر بھی قصاید ہیں ۔

یہ قصاید مختصر ہیں ۔ قصیدہ کا روایتی شان و شکوہ نہیں ۔ نہ علوم و فنون کی زیادہ تلمیحات ہیں نہ غریب و بعید تشبیہات و استعارات ہیں ۔ نہ بیان میں پیچیدگی و ابہام ہے ۔ چند ایك قصاید میں بہاریه و عشقیه تشبیبیں آئی ہیں اور اکثر قصیدے بے تشبیب ہیں ۔ انہیں خود احساس تھا کہ تعریف میں غلو و اغراق مناسب نہیں اور نہ دعاؤں میں ہی زیادہ مبالغه چاہیے ۔ چنانچه انہوں نے کہا ہے :

هزار سال نگویم بقای عمر تو باد   که این مبالغه دانم ز عقل نشماری
من این غلط نپسندم زرای روشن خویش   که دست و طبع تو گویم به بحر و کان ماند

امیر کیاتو حاکم فارس کی مدح میں جو قصاید ہیں ۔ ان میں نام کی ہی ستایش ہے ۔ باقی سراسر پند و موعظت پر مشتمل ہیں اور بڑی بے باکی سے نصیحتیں کی ہیں اور یہاں تك کہا ہے :

سعدیا چندانکه می دانی بگو   حق نباید گفتن الاّ آشکار

سعدی نے اپنے قصاید میں جو پند و موعظت کے جواہر نثار کیے ہیں وہ انسان کی اصلاح احوال کیلئے بیش بہا متاع ہیں ۔ ایك ایك شعر حکمت سے مالامال ہے ۔ سلاطین و امراء کو عدل و سخا کی تعلیم دی گئی ہے ۔ دو ایك نصیحتیں یه ہیں :

توانگری نه به مالست پیش اهل کمال   که مال تا لب گور است و بعد ازان اعمال

بس بگردید و بگردد روزگار دل بدنیا در نبندد ہوشیار

خوشست عمر دریغا که جاودانی نیست پس اعتماد برین پنج روز فانی نیست

مرثیہ سرائی

سعدی نے ابابکر بن سعد ، سعد بن ابی بکر اور زوال خلافت عباسی پر مرثیے لکھے ہیں . غم و اندوہ سے بھری ہوئی روح کاغذ پر نکال کر رکھ دی ہے ۔ سعد بن ابی بکر کی تعزیت کی ہے ۔ ترجیعی شعر :

نمی دانم حدیث نامه چونست همی دانم که عنوانش به خونست

اور مستعصم باللّٰہ آخری امیر المؤمنین خلافت عباسی کے مرثیے کا یہ شعر :

آسمان را حق بود گر خون ببارد بر زمین بر زوال ملك مستعصم امیر المؤمنین

یہ دونوں مرثیے اپنے سوز و اخلاص کی وجہ سے ادبیات فارسی میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں .

اخلاقی شاعری

اخلاقی موضوعات پر سعدی سے پہلے سنائی ، اوحدی ، عطار اور نظامی نے طبع آزمائی کی ہے ۔ اور قرآن ، احادیث ، اقوال عرفاء اور یونانی فلسفۂ اخلاق کے مدنظر پند و نصیحت کی ہے ۔ ہر ایك کا انداز بیان جدا ہے . پند نامه عطار کو بہت شہرت حاصل ہے . اسی طرز پر سعدی کا کریما مقبول عام رہا ہے . کریما کے علاوہ سعدی کی دو کتابیں گلستان (نثر و نظم) اور بوستان (نظم) سراسر اخلاقی موضوعات پر مشتمل ہیں ۔

گلستان میں سیرت پادشاهان ، درویشی ، قناعت ، خاموشی ، عشق و جوانی ، ضعف و پیری ، تأثیر تربیت اور آداب صحبت اور بوستان میں عدل و تدبیر، احسان عام ، عشق و محبت ، تواضع ، رضا و قناعت ، تربیت اور شکر و توبہ جیسے موضوعات شامل ہیں ۔ ان کے علاوہ قصاید و غزلیات میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام اخلاقی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اور ایسے ایسے نکات بیان کیے ہیں کہ دل پر اثر کرتے ہیں . سعدی نے روزمرہ واقعات اور مشاہدات سے یا فرضی یا اصلی حکایتوں سے اخلاقی نتائج نکالے ہیں اور انسانوں کو عبرت دلا کر اخلاق حسنہ و اعمال شایستہ کی طرف متوجہ کیا ہے مثلاً بلی اپنے فضلے کو خاك سے چھپا دیتی ہے ۔ اس سے نتیجہ اخذ کیا ہے :

تو آزادی از ناپسندیده ها نه ترسی که بروی فتد دیده ها

ایك لڑکی نے کہا کہ بابا اگر تجھے کتے نے کاٹا ہے تو بھی اسے کاٹ لے ، سعدی نے اس کا جواب منظوم کیا ہے :

محال است اگر تیغ بر سر خورم که دندان به پای سگ اندر برم
توان کرد با ناکسان بدرگی و لیکن نیاید ز مردم سگی

خوشبودار مٹی دیکھ کر تأثیر صحبت کا ایسا دلنشین قطعه پیش کیا ہے ۔ که ہمیشه یاد رہے گا :

گل خوشبوی در حمام روزی رسید از دست محبوبی به دستم
بدو گفتم که مشکی یا عبیری که از بوی دلآویز تو مستم
بگفتا من گل ناچیز بودم و لیکن مدتی با گل نشستم
جمال هم نشین در من اثر کرد وگرنه من همان خاکم که هستم

متذکره صدر اخلاقی عنوانات کے علاوه کلام سعدی میں ذیل کے موضوعات پر بے شمار اشعار ملتے ہیں ۔ مثلاً اتحاد و اتفاق ، امید و آرزو ، پیش بینی ، خوش بینی ، سرمایه داری و تہی دستی ، صلح و جنگ ، غم و شادی ، میانه روی ، عزت نفس و بلند نظری ۔

بنی نوع بشر کے اتحاد سے متعلق سعدی کا مندرجه ذیل قطعه اقوام متحده نے «موٹو » کے طور پر قبول کیا ہے ۔ اور پھر دنیا کی زبانوں میں اس کا ترجمه ہوا ہے . اگرچه یه قطعه در اصل حدیث نبوی کا ترجمه ہے لیکن سعدی نے اسے خوبصورتی سے نظم کیا ہے ۔ اور وه زبانزد خلایق ہوا ہے ۔ اور پھر فارسی کی وساطت سے اقوام متحده تك پہنچا ہے ۔

بنی آدم اعضای یکدیگر که در آفرینش ز یك جوہرند
چو عضوی بدرد آورد روزگار دگر عضوها را نماند قرار
تو کز محنت دیگران بیغمی نشاید که نامت نهند آدمی

سعدی نے ناپایداری جهان ، عمر کوتاه ، درویشی ، فقیری ، صبر و توکل ، تسلیم و رضا ، قناعت ، فروتنی و عاجزی بیچارگی جیسے موضوعات پر لکھا ہے جن سے شبه ہوتا ہے که یه تمام سلبی صفات ہیں اور آدمی کو بے چاره ،کم ہمت اور ناکاره بناتی ہیں ۔ یه تأثر صحیح نہیں ۔ سعدی نے جرأت و حوصله ، کوشش و کار اور عزت نفس و خودداری پر بھی اظہار خیال کیا ہے اور آدمی کو ایجابی صفات کا حامل ہونے کی تاکید کی ہے مثلاً :

بدست آهك تفته کردن خمیر به از دست بر سینه نزد امیر
حقا که با عقوبت دوزخ برابر است رفتن به پایمردی همسایه در بهشت
برو شیر غرنده باش ای دغل مپندار خود را چو روباه شل

بگیر ای جوان دست درویش پیر نه خود را بیفگن که دستم بگیر
نا برده رنج گنج میسر نمی شود مزد آن گرفت جان برادر که کار کرد

سعدی نے نوجوانوں کو ذاتی خوبیوں سے آراستہ کرنے کیلئے ایسی پایدار نصیحتیں کی ہیں جن سے شخصی کردار بلند ہوتا ہے ۔ اور آدمی قابل اعتماد سمجھا جاتا ہے ۔ مثلاً وہ کہتا ہے ۔ سچ کہو ، جھوٹ نہ بولو ۔ غرور نہ کرو ، ریا کاری سے کام نہ لو ، تواضع کرو ، شجاع بنو ۔ حق دو ، حق نہ مارو۔

سعدی نے بعضی جگہ ایسے عقاید کا اظہار کیا ہے جس سے اختلاف کیا جاتا ہے ۔ اسی قسم کے عقاید سے بے باکی ، بلند نظری اور ثبات جیسے بلند اخلاق پر حرف گیری ہوتی ہے مگر بعض کی رائے ہے کہ سعدی اپنے زمانے کے جبر و ظلم سے مجبور تھا ۔ وہ اقوال یہ ہیں : «دروغ مصلحت آمیز به از راستی فتنه انگیز».

اگر شاه روز را گوید شب است این بباید گفت اینك ماه و پروین

غزل گوئی

سعدی نے اپنی غزل میں عشقیہ ، عرفانی اور اخلاقی مضامین بیان کئے ہیں ۔

سعدی نے بھی اپنے متقدم شعراء کی طرح غزل میں محبوب کے سراپا کو بیان کیا ہے ۔ اس سے پہلے شعراء نے محبوب کے چشم و ابرو ، لب و رخسار و زنخدان ، قامت و کمر و رفتار کو مختلف تشابیہ سے بیان کیا تھا اور تشابیہ عموماً جنگ و شکاری آلات سے متعلق ہوتی تھیں ۔ سعدی کی اس قسم کی غزلوں میں جدت و ندرت ہے ۔ نئی اپج ہے اور تشابیہ بھی لطیف و شگفتہ ہیں ۔ مثال کیلئے ذیل کی غزل کے یہ اشعار دیکھیے :

ای که هرگز ندیده ای به جمال جز در آیینه مثل خویشتنی
در دهانت سخن نمی گویم که نگنجد در آن دهن سخنی
بدنت درمیان پیرهنت همچو روحیست رفته در بدنی

سعدی کی غزلوں میں دوسری قسم کا محبوب وہ ہے جو اسے جان و دل سے عزیز ہے ۔ جس کے فراق میں تڑپتا ہے ۔ اسے حاصل کرنا چاہتا ہے ۔ لیکن وہ بے وفا ہے ۔ اسے تڑپانا چاہتا ہے ۔ اس قسم کی غزل بھی محبوب کی صفات کو بیان کرتی ہے لیکن ساتھ میں شاعرکی محبت کرنے والی روح کو بھی اجاگر کرتی ہے ۔ ذیل کی غزل ان جذبات کی آئینہ دار ہے :

گردست دهد هزار جانم در پای مبارکت فشانم
آخر بسرم گذر کن ای دوست انگار که خاك آستانم

تو خود سر وصل ما نداری من عادت بخت خویش دانم
من ترك وصالی تو نگویم الاً به فراق جسم و جانم

سعدی نے غزل کو ایك نئی روش عطا کی یعنی ایك نہج پر ڈالا . غزل کی ایك تعریف یہ ہے کہ اس میں چاہنے والے دل کی فریاد ، دردمندی اور چیخ شامل ہو تا کہ محبوب کا دل ، پسیج جائے سعدی کی غزلوں میں محبوب سے ہلکے ہلکے گلے شکوے ہیں ۔ اس کیلئے تڑپ اور بے قراری بھی ہے اور جان نثاری بھی ہے ۔ اس کی اکثر غزلوں میں دل کی پکار ملے گی ۔ جس سے پڑھنے والا بھی لطف لیتا ہے ۔ اور رومانوی کیفیت سے آشنا ہوتا ہے .

سعدی کی زندگی نشیب و فراز میں گزری ہے ۔ بہت دکھ جھیلے ہیں . لوگوں کے دکھوں سے بھی آشنا ہوئے ہیں ۔ زمانے کے انقلاب دیکھے ہیں . اس لیے اس کا دل غم آشنا ہوا ہے ۔ ان کی باتوں بھی سوز ہے وہی شخص عشق و محبت کی باتیں کر سکتا ہے جس کا دل دردمند ہو اور عشق کے رموز سے آشنا ہو . سعدی نے خود جابجا عشق و عاشق کی خصوصیات و کیفیات پر روشنی ڈالی ہے ۔ مثلاً :

حدیث عشق نداند کسی که در همه عمر بسر نکوفته باشد در سرائی را
دلی که عاشق و صابر بود مگر شکست ز عشق تا به صبوری هزار فرسنگست
مرا و عشق تو گیتی بیك شکم زادست دو روح در بدنی چون دو مغز در یك پوست
صفت عاشق صادق بدرستی آنست که گرش سر برود از سر پیمان نرود
به ملامت نبرند از دل ما صورت عشق نقش بر سنگ نبشتست به طوفان نرود
هر کسی را بتوان گفت که صاحب نظر است عشقبازی دگر و نفس پرستی دگر است

سعدی کی روح قدرتی مناظر سے سرشار ہے. موسم سرما گھر کے اندر گزارنا پڑتا ہے ۔ بہار کا موسم آتا ہے .باد صبا چلتی ہے ۔ پھول کھلتے ہیں ۔ اور بلبل چھکتا ہے تو سعدی کا دل بھی پھڑك اٹھتا ہے ۔ سعدی نے اپنی غزلوں میں جا بجا ایسی پر لطف فضا کا ذکر کیا ہے ۔ اور عیش و نشاط کی ایك کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے . مثلاً یہ غزل :

برخیز که می رود زمستان بگشای در سرای بستان
نارنج و بنفشه بر طبق نه منقل بگذار در شبستان
برخیز که باد صبح نو روز در باغچه می کند گلفشان

سعدی زمانے کے ہاتھوں بھی فریادی ہے ۔ اس لیے جو اس کے دل و دماغ پر گزری ہے وہ بھی غزل میں بیان کرنے سے نہیں رکتا ۔ ایسی غزلیں بھی شاعر کے دردمند دل کی

آئینہ دار ہوتی ہیں ۔ یہ غزل خاص طور پر اس کیفیت کو نمایاں کرتی ہے :

گر غصهٔ روزگار گویم بس قصه بی شمار گویم
یك عمر هزار سال باید تا من یکی از هزار گویم
چشمم به زبان حال گوید نی آنکه به اختیار گویم
بر من دلِ انجمن سوزد گر درد فراق یار گویم
مرغان چمن فغان بر آرند گر فرقت نوبهار گویم

سعدی شراب تو نہ پیتے ہونگے مگر مانگتے ضرور ہیں ۔ نسیم صبحدم پر وہ جان نثار کرتے ہیں ۔ ایسی روح افزا فجر میں تو بڑا پیالہ کیا کام کرتا ہوگا . سعدی نے کئی غزلوں میں ساقی کو پکارا ہے ۔ ذیل کی غزل اس کا بہترین نمونہ ہے :

ساقیا می ده که مرغ صبح بام رخ نمود از بیضهٔ زنگار فام
در دماغ می پرستان باز کش آتش سودا به آب چشم جام

سعدی کی غزلوں میں کہیں کہیں محبوب مجازی کے بجائے محبوب حقیقی بھی مخاطب ہیں ۔ اس کے عشق میں دنیا چھوڑنے کی باتیں کی ہیں . وہ فقیر درویش تو تھے ہی لیکن انہوں نے سلوك و تصوف کی اصطلاحوں میں مضمون نہیں باندھے بلکہ براہ راست معشوق خداوندی سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے . مثلاً یہ چند اشعار :

ای ولولهٔ عشق تو بر هر سر کوئی روی تو ببرد از دل ما هر غم روی
هر که به خویشتن رود در میزد به سوی او بیتش ما نیاورد طاقت حسن روی او
من از آن روز که در پند توام آزادم بادشاهم که بدست تو اسیر افتادم

سعدی ایك عام بات کو جدت و ندرت سے ادا کرتے ہیں . تا کہ بات میں دلکشی و شگفتگی پیدا ہو اس نسبت سے متقدم شعراء پر ان کو تقدم حاصل ہے مثلاً یہ اشعار :

دوستان منع کنندم که چرا دل به تو دادم باید اوّل به تو گفتن که چنین خوب چرائی
دل و جانم به تو مشغول و نظر در چپ وراست تا ندانند حریفان که تو منظور منی

سعدی انسان کی ذہنی کیفیات سے واقف ہیں ۔ آج کل کی اصطلاح میں نفسیات سے آشنا تھے وہ بعض اشعار میں دل کی ایسی حالتیں بیان کر گئے ہیں جو ایك چاہنے والے دل پر گزرتی ہیں مثلاً یہ دو اشعار :

یادت نمی کنم بهم عمر زان که یاد آن کس کند که دلبرش از یاد می رود
گفته بودم چو بیایی غم دل با تو بگویم چه بگویم که غم از دل برود چون تو بیایی

شعراء کا ایك انداز یہ ہے کہ وہ ایك مصراع میں کوئی بات پیش کرتے ہیں . تو دوسرے میں ایك مثال سے اس قول کی وضاحت کرتے ہیں اس کی تائید میں عام مشاہدات

سے ایک مثال لاتے ہیں ۔ اس سے ایک تو بات دلچسپ ہو جاتی ہے دوسرے مطلب کی وضاحت سے شگفتگی پیدا ہوتی ہے ۔ سعدی نے بھی کہیں کہیں اس روش سے فائدہ اٹھایا ہے ۔ برّصغیر میں یہ ایک روش بن گئی اور بعض شعراء کا امتیازی نشان شمار ہونے لگی ۔ مثلاً صائب و غنی وغیرہ ، سعدی کی مثالیں درج ذیل ہیں ۔

خواستم تا نظری افکنم و باز آیم گفت : ازین کوچۂ ما راہ بدر نمی رود

سعدیا : این همه فریاد تو بی چیزی نیست آتشی هست که دود از سر آن می آید

غزل کا مزاج ایسا ہے کہ اس کا طرز بیان سادہ و سلیس ہونا چاہیے تا کہ بات فوراً دل میں اتر جائے اور تاثیر پیدا کرے ۔ سعدی کی غزلیں بھی اس معیار پر پوری اترتی ہیں ۔ الفاظ نرم و ملائم ہیں ۔ اکثر مکالماتی انداز ہے ۔ محبوب سے براہ راست بات کی جارہی ہے اپنا دکھ اسکو سنایا جا رہا ہے اسلئے زبان سادہ و سلیس ہے ۔ درشت و ثقیل الفاظ بہت کم ہیں ، بات کہنے کا انداز واضح و صریح ہے ۔ لیکن کہیں شاعرانہ صنعتگری بھی دکھائی ہے ۔ حروف کی تکرار سے آہنگ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ مثلا:

شبست و شاہد و شمع و شراب و شیرینی غنیمتست چنین شب که دوستان بینی

بعض مصرعے ایسے ہیں ، معلوم نہیں ہوتا کہ شاعر نے بحر و وزن کی قید کو مدّنظر رکھتے ہوئے شعر نکالا ہوگا ۔ وہ تو ایک قسم کی نثر ہے لیکن شعر کی خوبی سے مالا مال ہے ۔ ایسے اشعار سہل ممتنع کی ذیل میں آتے ہیں ۔ مثلاً :

ای مسلمانان ، به فریادم رسید کان فلانی بیوفائی می کند

دیدۂ سعدی و دل همراهِ تست تا نه پنداری که تنها می روی

سعدی غزل میں صفت تضاد اور محاورے کا استعمال کرتے ہیں ، مثلاً :

سرو سیمین به صحرا می روی نیک بد عهدی که بی ما می روی

سعدی صحیح معنوں میں اپنی عرفانی غزلوں میں ، شیخ سعدی ، نظر آتے ہیں ۔ بلند پایہ معلم اخلاق، صوفی درویش ، مرشد ، حقیقت اور استاد بزرگ ۔ ان غزلوں میں عموماً عشق و معرفت اور پند و موعظت کے مضامین آتے ہیں ۔ بیان ایسا پختہ اور دلآویز ہے کہ عظمت سعدی رگ و پے میں سمائی جاتی ہے ۔ جیسا کہ انہوں نے گلستان و بوستان لکھنے سے پہلے بتایا تھا کہ :

به اقصای عالم بگشتم بسی تمتع ز هر گوشه ای یافتم

اس روایت کو بتاتے ہوئے انہوں نے اشعار میں بھی اپنے آپ تجارب زندگی کو

دلنشین انداز میں پیش کیا ہے ۔ اور دوسروں کی زندگیاں سنوارنے کیلئے بیش بہا نصیحتیں کی ہیں ۔ اخلاقیات میں بلند همتی کی تلقین کرتے ہیں ۔ دنیا کی حقیر و ناپایدار چیزوں کے پیچھے بھاگنے سے منع کرتے ہیں . نفسانی خواہشات سے پرہیز اور وقت کو ضایع کرنے سے روکتے ہیں ۔ ہر غزل زندگی آموز مشوروں سے مالا مال ہے . مثال کیلئے یه غزل نقل کرتے ہیں :

اگر لذت ترک لذت بدانی　　دگر شهوت نفس لذت نخوانی
هزاران در از خلق بر خود ببندی　　گرت باز باشد دری آسمانی
سفرهای علوی کند مرغ جانت　　گر از چیز آز بازش پرانی
و لیکن تو را سیر عنقا نباشد　　که در دام شهوت به گنجشك مانی
به ملکی دمی زین نشاید خریدن　　که از دور عمرت بستد رایگانی
چنان می روی ساکن و خواب در سر　　که می ترسم از کاروان باز مانی
صدف وار باید زبان در کشیدن　　که وقتی که حاجت بود دُر چکانی
همه عمر تلخی کشیدست سعدی　　که نامش برآمد به شیرین زبانی

عرفانی غزل کا دوسرا موضوع فقر و درویشی ہے ۔ سعدی کے نزدیك درویش کی شخصیت گرامی ہے ۔ انہوں نے جایی درویشوں کی تعریف کی ہے اور ان کی خصوصیات بتائی ہیں مثلاً :

ای که انکار کنی عالم درویشان را　　تو ندانی که چو سودا و سرست ایشان را
گنج آزادگی و کنج قناعت ملکیست　　که به شمشیر میسر نشود سلطان را

درد عشق از تندرستی خوشترست　　ملك درویشی ز هستی خوشترست

آن را که جای نیست همه شهر جای اوست　　درویش هر کجا که شب آید ، سرای اوست
بی خانمان که هیچ ندارد بجز خدای　　او را گدا مگوی که سطان گدای اوست
مرد خدا به مشرق و مغرب غریب نیست　　چندانکه می رود همه ملك خدای اوست

که حق بینند و حق گویند و حق جویند و حق باشد　　هر آن معنی که آید در دل دانای درویشان
دو عالم چیست تا در چشم اینان قیمتی دارد　　دوئی هرگز نباشد در دل یکتای درویشان

عصر سعدی میں تصوف کے روایتی مضامین رواج پا چکے تھے اور صوفی کیلئے خدا تك پہنچنے کیلئے جن مراحل سے گزرنا ہوتا ہے وہ معروف تھے ۔ سعدی نے بھی انھی مضامین کو بیان کیا ہے ۔ مثلاً ترك دنیا ، ترك شهوت ، عبادت و ریاضت ، مرشد ، حضور خاقان اور پھر روحانی مدارج اور آخر میں قرب خداوندی کا حصول ۔ چونکه یه سب منازل عشق اور لگن سے طے کی جاتی ہیں اس لئے اس میں مستی و سرور کا عنصر

بھی آجاتا ہے ۔ ان مضامین کو بیان کرنے کیلئے صوفی شعراء نے شراب، میخانہ، خرابات ، جام و مینا ، پیر مغان جیسی اصطلاحات سے کام لیا ہے ۔ سعدی نے بھی انھیں اصطلاحات کے سہارے تصوّف و معرفت کے بنیادی مضامین کو بیان کیا ہے ۔ مثلاً یہ غزل اس کی آئینہ دار ہے :

شبی در خرقه رند آسا گذر کردم به میخانه ز عشرت می پرستان را منور بود کاشانه
چو ساقی در شراب به نوشا نوش در مجلس بنا فرزانگی گفتند کاول مرد فرزانه
به تندی گفتم آری من شراب از مجلسی خوردم که مه پیر امن شمعش بیارد بود پروانه
گمان بردم که طفلانند وز پیری سخن گفتم مرا پیری خراباتی جوابی داد مردانه
که نور عالم علوی فرا هر روزنی تابد تو اندر صومعش دیدی و ما در کنج میخانه
کسی کامد درین خلوت به یکرنگی هویدا شد چه پیری عابد زاهد چه رند مست دیوانه

عشقیہ غزلوں میں محبوب مجازی سے عشق کا اظہار تھا .عرفانی غزلوں میں خدا سے عشق و محبت کا اظہار ہے. اور عشق کا مرتبہ و مقام بتایا ہے ۔ اس پر عمل کرنے جو کامیابی حاصل ہوتی ہے ، اس کا بھی ذکر کیا ہے ۔ مثلاً :

درد عشق از تندرستی خوشترست ملك درویشی ز هستی خوشترست
خوشتر از دوران عشق ایام نیست بامداد عاشقان را شام نیست
مطربان رفتند و صوفی در سماع عشق را آغاز هست انجام نیست
هر کسی را نام معشوقی که هست می برد ، معشوق ما را نام نیست
مستی از من پرس و شور عاشقی و آن کجا داند که درد آشام نیست

سعدی نے اہل زمانہ کے اعمال و اطوار پر گفتگو کی ہے ۔ ریا کار صوفی و زاہد پر چوٹیں کی ہیں ۔ کم ظرف ، کم ہمت ، مغرور لیکن بلند مراتب کی خواہش رکھنے والوں کو نشانہ ، ملاحت بنایا ہے ۔ اور ساتھ ہی روحانی بلند مقامات حاصل کرنے کی علامات بھی بتائی ہیں ۔ ساری غزل بلند نگہی کی آئینہ دار ہے :

از چمن ، برون ، نیامده جانانت آرزوست زنار نابریده و ایمانت آرزوست
بر در گهی که نوبت ارنی همی زنند موری نه ای و ملك سلیمانت آرزوست
فرعون وار لاف انا الحق همی زنی وانگاه قرب موسی عمرانت آرزوست
چون کودکان که دامن خود اسب کرده اند دامن سوار کرده و میدانت آرزوست
هر روز از برای سگ نفس بو سعید یك کاسه شوربا و دو تا نانت آرزوست
سعدی درین جهان که توئی ذره وار باش گر دل بنزد حضرت سلطانت آرزوست

فخر الدّین عراقی

عراقی کا نام ابراهیم لقب فخر الدّین اور تخلص عراقی تھا ۔ کارنامۂ بزرگان ایران میں عارفان و صوفیان کے باب میں ، ایران کے مشہور محقّق دکتر حسین مینوچهر نے ان کا نام یوں لکھا ہے :"شیخ فخر الدّین ابراهیم بن بزرگمهر بن عبدالغفّار جوالقی همدانی (۱)۔" عراقی ۶۱۰ ھ میں همدان کے ایك نواحی گاؤں کُومجان میں پیدا ہوئے ، بڑے ذہین اور طبّاع تھے ۔ بچپن میں بہت جلد قرآن کریم پڑھ لیا ۔ سترہ برس کی عمر میں ، علوم مُروّجه کی تحصیل سے فارغ ہو کر درس و تدریس میں مشغول ہوگئے ۔ چونکه وہ سیماب فطرت نوجوان تھے اور ان کے مزاج میں شور و مستی کا غلبه تھا اس لیے ظاہری علوم کے پڑھنے پڑھانے سے ان کی طبیعت اُچاٹ ہوگئی ۔ چنانچه ۶۲۷ ھ میں تسکین باطن کی خاطر وہ جستجوئے مُرشد میں نکل کھڑے ہوئے ۔ اس دور کے عظیم درویشوں بابا کمال خجندی اور شمس الدّین تبریزی کی صحبت میں رہے اور خوب استفادہ کیا ۔ ان صوفیوں کے فیضان صحبت سے ان کے دل کی دنیا بدل گئی ۔ درد و سوز اور رقت و گداز ہر وقت ان پر غالب رہنے لگا ۔ اور وہ ایك نہایت وسیع المشرب صوفی کی حیثیت میں مشہور ہوگئے ۔

اسی عرصے میں عراقی نے قلندروں کی ایك جماعت میں ایك حسین و جمیل نوجوان دیکھا اور اس پر فدا ہوگئے ۔ قلندر جہاں گرد لوگ تھے ۔ جب انہوں نے سفر شروع کیا تو عراقی بھی ان کے ساتھ چل نکلے ۔ ۶۳۱ ھ میں قافله ملتان پہنچا ۔ ملتان میں عراقی کی ملاقات مشہور سہروردی بزرگ خواجه بہاء الدّین زکریّا سے ہوئی ۔ ان کے فیضان نظر سے عراقی کا عشق مجازی ، عشق حقیقی میں بدل گیا ۔ اور وہ حسن مجاز کے گرداب سے نکل کر جمال حقیقت کی بے کراں وسعتوں میں کھو گئے ۔ خواجه زکریّا کو بہت جلد اندازہ ہوگیا که عراقی بے پناہ باطنی استعداد کے مالك ہیں ۔ لهذا انہوں نے عراقی کو خرقۂ خلافت سے نوازا اور اپنی بیٹی بھی ان کے نکاح میں دے دی ۔ اس بیوی سے ان کے ایك صاحبزادے کبیرالدّین پیدا ہوئے ۔ وہ پورے پچیس سال خواجه بہاء الدّین زکریّا کی خدمت میں رہے ۔

۶۶۶ ھ میں ملتان چھوڑا ۔ عمان کے راستے حج کیا اور پھر روم گئے اور وہاں مولانا صدرالدّین قونوی سے محی الدّین ابن عربی کی شہرہ آفاق کتابوں «فتوحات مکیّه»

۱- دکتر حسین مینوچهر : کارنامۂ بزرگان ایران ، ص ۳۱۱.

اور «فصوص الحکم» کا درس لیا ۔ امیر روم معین الدّین پروانہ ان کا ہوگیا اور اس نے ان کیلئے خانقاہ تعمیر کرائی ۔ معین الدّین پروانہ کی وفات کے بعد ۶۷۵ یا ۶۷۶ ھ میں مصر گئے ۔ سلطان مصر ملك الظّاہر رکن الدّین بیبرس نے انہیں مصر کے « شیخ الشیوخ» کا منصب دیا ۔ ۶۷۶ ھ میں واپس ہوئے ۔ ۶۸۰ ھ میں دمشق گئے . اسی سال انکی ملاقات شمس الدّین صاحب دیوان سے ہوئی ۔ ۸ ذوالحجه ۶۸۸ ھ کو دمشق میں فوت ہوئے اور ابن عربی کے پہلو میں دفن ہوئے ۔ ۷۰۰ ھ میں ان کے فرزند کبیر الدّین بھی وہیں فوت ہوئے اور انہیں بھی وہیں دفن کیا گیا . ایك روایت میں ہے کہ عراقی کا سال وفات ۶۸۶ ھ ہے ۔ جدید تحقیقات کے مطابق یہ روایت قابلِ اعتبار نہیں ۔

حسن اتفاق دیکھیے کہ ، عراقی ، ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود اور ان کے مخصوص نظریۂ تصوّف کے پُرجوش حامی تھے اور انہیں ابن عربی سے خاص عقیدت تھی ۔ قدرت نے ان کی آخری آرامگاہ بھی ابن عربی کے پہلو میں بنائی ۔

تألیفات : فخرالدّین عراقی کے علمی و ادبی آثار کی تفصیل یہ ہے :

۱- **دیوان** : اس میں غزلیات کے علاوہ قصائد ، قطعات ، رباعیات ، ترکیب بند اور ترجیعات ہیں ۔

۲- **لمعات** : تصوّف کے موضوع پر یہ کتاب ابن عربی کے افکار سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی ۔ اس کی زبان بہت مشکل اور مضامین نہایت باریك ہیں ۔ اس کی کئی شرحیں لکھی گئی ۔ مشہور شاعر جامی نے بھی اس کی شرح لکھی ۔ فلسفۂ تصوّف پر یہ کتاب سند کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اور گروہِ صوفیا میں اسے ہر دور میں بہت پسند کیا جاتا رہا ہے ۔

۳- **عشّاق نامه** : یہ فارسی مثنوی ہے . اسے دَہ نامہ بھی کہتے ہیں .

۴- **منشآت و مکاتیب** : یہ کچھ نثر پاروں اور خطوط کا مجموعہ ہے ۔

۵- **رساله فی الحمد** : مقاماتِ سلوك کے متعلق ہے ۔

۶- **رساله لطیف فی الذّوقیات** : اس میں عارفانہ اسلوب میں تصوّف و عرفان کے مسائل بیان کیے گئے ہیں ۔

عراقی کی شاعری

مولانا فخر الدّین ابراهیم عراقی فارسی ادبیات کی ایك زندہ جاوید شخصیت ہیں ۔ اور اپنے دور کے بہترین شاعرتھے ۔ ان کی عارفانہ غزلیں اپنی سرمستی اور شور انگیزی کی وجہ سے زبان زد خلائق ہیں ۔ ان کے کلام میں ایك خاص قسم کی رندی و

سرمستی ، ذوق و شوق ، جذب و کیف ، وجد و حال اور زور و شور ہے ۔ وہ خود بڑے با ذوق ، جمال پرست ، لا ابالی مزاج اور آزاد منش آدمی تھے ۔ اور یہی مُنفرد خصوصیات ان کی شاعری میں بھی جلوہ گر نظر آتی ہیں ۔ ابلاغ معانی کیلئے وہ سادہ زبان سہل اسلوب اور چھوٹی اور روان بحروں کا استعمال کرتے ہیں اور یہی سادگی ، صفائی ، روانی اور بر جستگی ان کے کلام کی جان ہے ۔ وہ تصنّع اور تکلف کے عادی نہیں بلکه بات ہمیشه سیدھے سادے انداز میں کرتے ہیں اور دل موہ لیتے ہیں :

نخستین باده کاندر جام کردند ز چشم مستِ ساقی وام کردند
به عالم هر کجا درد و غمی بُود بهم کردند و عشقش نام کردند
چو خود کردند رازِ خویشتن فاش عراقی را چرا بدنام کردند ؟

عراقی نه صرف بہت بڑے شاعر تھے ۔ بلکه بہت بڑے صوفی اور عارف بھی تھے . انہوں نے اپنے صوفیانه افکار و خیالات کی تبلیغ و ترویج کیلئے نثر میں بھی بہت کچھ لکھا اور اپنے عارفانه عقاید و نظریّات کی توضیح و اشاعت کیلئے اپنی شاعرانه صلاحیّتوں سے بھی کام لیا ۔ تصوّف میں شیخ اکبر محی الدّین ابن عربی کے پیرو تھے اور ان کے پیش کرده نظریّهٔ وحدت الوجود یا همه اوست سے بے حد متاثّر تھے ۔ انہوں نے ساری زندگی اسی نظریّے کو فروغ دینے میں گزار دی ۔ وحدت الوجود کا فلسفیانه مسئله پیش کرنے کیلئے انہوں نے قصیدے بھی کہے ، غزلیں بھی لکھیں اور مثنوی بھی ۔ اس مسلك کے متعلق ان کا ایك قصیده بہت زوردار اور معرکة آرا ہے . اور فکر ، جذبے اور فن کی بہترین مثال ہے ۔ اس کا مطلع یه ہے :

شهبازم و شکار جهان نیست در خورم ناگه بود که از کف ایّام بر پَرم

دو اور شعر ملاحظه ہوں :

که بغیر از تو در جهان کس نیست جُز تو موجود جاودان کس نیست
که همه اوست هر چه هست یقین جان و مال و دلبر و دل و دین

عراقی ایك آزاد مشرب عارف کامل تھے ۔ و ہ نام نہاد عابدوں اور زاہدوں کی طرح متعصّب ، تنگ نظر ، کم ظرف ، منافق اور ریا کار نہیں تھے ۔ انہیں دکھاوے ، نمود و نمائش اور خودآرائی و خودستائی سے بے حد نفرت تھی . ان کا عقیده تھا که عشق کے بغیر علم و عمل کا کوئی فائده نہیں ۔ ان کے نزدیك زہد خشك سے خود بینی ، تکبّر اور احساس تفاخر پیدا ہوتا ہے ۔ اور وہ اسے سخت ناپسند کرتے ہیں . کہتے ہیں :

ما رَخْتْ ز مسجد به خرابات کشیدیم خط بر وَرَقِ زُہد و کرامات کشیدیم

ایك دوسری جگه تو ان کے ہاں ریاکار زاہدوں کے خلاف شدید ردّ عمل ، ایك

خوبصورت اور دلکش پیرایہ بیان میں ظاہر ہوا ہے ۔ معانی کی بلندی ، اسلوب کی ندرت اور مترنم بحر کی روانی نے طلسماتی کرشمہ سازی کر دی ہے :

به زمین چو سجده کردم ز زمین ندا بر آمد که مرا خراب کردی تو به سجدهٔ ریائی
چو به راهِ کعبه رفتم به حرم رہم ندادند تو برونِ در چه کردی که درونِ خانه آئی

عراقی گرفتارِ حُسن تھے اور کشتۂ جمال ۔ اُن کی حُسن پرستی کے عکس ان کی شاعری میں بھی نظر آتے ہیں :

چه خوش باشد که دلدارم تو باشی ندیم و مُونس و یارم تو باشی

اُن کی اکثر غزلوں میں مکالماتی انداز ہے ۔ جیسے وہ اپنے محبوب سے سرگوشیاں کر رہے ہوں :

جانا ! نظری به ما نکردی با خویشتن آشنا نکردی

هر چندنه ایم در خورِ تو لیکن چه کُنیم ، مُبتلائیم

صُوفیائے کرام نے شاعری کو مشغلے کے طور پر بہت کم اختیار کیا ہے ۔ مسلک تصوّف میں چونکہ چلّہ اور خلوت نشینی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے ۔ اس لیے صوفیا کو شدید ذہنی تمرکز اور باطنی یکجہتی حاصل ہوتی ہے ۔ اور وہ اپنے مراقبے اور استغراق کی گوناگون کیفیّات ، اپنے قلبی واردات ، لطیف روحانی تاثرات اور وجدانی احساسات و جذبات کو بڑی آسانی سے نرم و ملائم اور موزوں الفاظ میں سمو سکتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ عارفوں اور صوفیوں کا کلام اکثر سادہ ، آسان اور اثر انگیز ہوتا ہے ۔ عراقی بھی شاعروں کی اسی صف سے تعلّق رکھتے ہیں ۔ انہوں نے اپنی واردات قلبی کے علاوہ ضمناً تصوّف و سلوک کے مضامین پر بھی اسی سادگی سے اظہار خیال کیا ۔

دوسرے صوفی شاعر کی طرح عراقی کا نظریّہ عشق بھی ایک خاص اہمیت کا حامل ہے ۔ وہ عشق کو ایک عظیم اور جاودانی قوّت قرار دیتے ہیں ۔ ان کے نزدیک عشق تمام کائنات کا سلطان مطلق ہے ۔ اور ایک لازوال صداقت اور سماوی نُور ہے ۔ وہ درد و سوز اور جنون و سودا کو عشق کی عنایت سمجھتے ہیں :

عشق سُوزی در نهادِ ما نهاد جانِ ما در بُوتهٔ سودا نهاد

وہ کہتے ہیں کہ عشق وصال خداوندی کا قریب ترین راستہ ہے اور حصول عشق کیلئے میخانہ نشین ضروری ہے :

خواهی که درونِ حرمِ عشق خرامی در میکده بنشین که رهِ کعبه دراز است

مسلک سہروردیہ میں شرعی ظواہر کی پابندی لازم سمجھی جاتی ہے ۔ عراقی اگرچہ

بہاء الدّین زکریا سہروردی کے مرید تھے مگر ان کی حالت جداگانہ تھی ۔ وہ ولولہ عشق کے ہاتھوں مجبور تھے ۔ شور و مستی ، وجد و حال کا ان پر غلبہ تھا ۔ قونیہ میں وہ مولانا روم کی مجالس میں شریك ہوتے تو سماع میں مشعوف ہو کر رقص کرتے ۔ معین الدّین پروانہ نے ان کے سامنے زر پیش کیا ۔ عراقی نے کہا میرے لیے حسن قوال کو بھیجو ۔ چنانچہ اس کی قوالی سے متأثر ہوکر تین دن تك سماع میں غرق رہے اور انھی دنوں بہت عمدہ اشعار کہے ۔ مثلاً :

عشق سیمرغیست کورا دام نیست　　در دو عالم زو نشان و نام نیست

خود قوال کے متعلق کہا :

چه در سماع عراقی حدیث دوست شنید　　بجای خرقه به قوال جان توان انداخت

وجودی صوفیه کا یه نظریه ہے که خدا نے خود چاہا که وہ پہچانا جائے ۔ وہ خود حسن مطلق ہے ۔ اس نے عشق پیدا کیا جو اس کو چاہے اس کی صفات جمالی و جلالی کا چرچا ہو ۔ گویا وہ خود ہی معشوق تھا اور خود ہی عاشق بن بیٹھا ۔ عراقی بھی یہی نظریه رکھتے ہیں ۔ مثلاً وہ کہتے ہیں ۔

حسن را بر دیدۂ خود جلوه داد　　منتی بر عاشق شیدا نهاد

هم به چشم خود جمالِ خود بدید　　تهمتی بر چشم نابینا نهاد

عراقی حج کعبه سے سرفراز ہوئے ۔ مدینه میں روضۂ نبوی کے آستانے پر پہنچے تو وفور جذبۂ محبت و احترام سے پانچ نعتیه قصاید لکھے ۔ ان میں سے دو کے مطلع حسب ذیل ہیں :

عاشقان چون بر در دل حلقۂ سودا زنند　　آتش سودای جانان در دل شیدا زنند

راه باریکست و شب تاریك و مرکب لنگ و پیر　　ای سعادت رخ نمای و ای عنایت دست گیر

عراقی نے ایك ترکیب بند میں بھی نعت رسول لکھی ہے ۔ اس میں نبی اکرم کو نور قرار دیا ہے ۔ اور انھیں آئینه ذات حق تعالی کہا ہے :

نوری که جمال جمله هستی　　از تاب جمله اوست پیدا

در آئینه مصطفی چه بیند　　جز حسن و جمال ذات والا

ایك اور نعت میں رسول خدا کی زبان سے کہلوایا ہے که :

نورم که از نور من اشیا وجود یافت

وصاف لایزالی ز من آشکار شد　　حسن رخم به صورت آدم پدید شد

نثری ادب

تذکرة الاولیاء

اس کے مؤلف مشہور صوفی شاعر شیخ فرید الدّین عطار (م - ۶۱۸ ھ) ہیں ۔ اس کتاب میں ۹۶ اولیاء اور مشایخ کا ذکر ہے . سوانحی تفصیلات کے ساتھ ساتھ ان کے مقامات ، مکارم اخلاق ، نصایح اور حکیمانہ اقوال بھی درج کیے ہیں ۔ کتاب چھٹی صدی کے آخر یا ساتویں صدی ہجری کے شروع میں تألیف ہوئی آغاز کتاب میں مؤلف نے سبب تألیف بیان کیا ہے ۔ کہ مجھے بزرگوں کے احوال و کوائف کے مطالعہ کا شوق تھا ۔ اور اقوال صوفیہ کے متعلق برا خیال تھا کہ وہ باطنی اسرار و رموز کے آئینہ دار ہوتے ہیں ۔ اسلئے میں نے دوستوں کی خاطر عربی و فارسی کتابوں سے اختصار کے ساتھ یہ کتاب مرتب کی ۔

منابع و مأخذ کتاب :

۱- طبقات الصوفیه ، از ابو عبدالرحمن محمّد بن الحسین السلمی نیشابوری ۔
۲- حلیة الاولیاء ، از ابو نعیم احمد بن عبداللّٰہ الاصفهانی ۔
۳- مناقب الابرار و محاسن الاخیار ، از ابو عبداللّٰہ الحسین بن نصر الموصلی ۔
۴- صفوة الصفوه ، از ابو الفرج عبدالرحمن بن علی الجوزی ۔
۵- کشف المحجوب از علی بن عثمان الهجویری ۔
۶- ترجمۂ طبقات الصوفیه (مذکوره بالا) از ابو اسماعیل عبداللّٰہ بن محمّد انصاری.

تذکرة الاولیاء کی نثر آسان اور دلکش ہے ۔ معانی اور اسلوب کے لحاظ سے کشف المحجوب کیساتھ بڑی مشابہت پائی جاتی ہے ۔ تذکرة الاولیاء میں کشف المحجوب کی بعض عبارتیں ذرا سے تغیر کے ساتھ اپنا لی گئی ہیں ۔ عبارتیں عموماً تکلف سے عاری ہیں ۔ بزرگوں کی تعریف کے ابتدائی جملے مقفی و مسجع لائے گئے ہیں ۔

اس کتاب میں بعض اجنبی اور مخصوص قسم کے الفاظ و تراکیب کا استعمال دیکھنے میں آتا ہے ۔ بعض جگہ مطالب کے ضبط کرنے میں مسامحات ہوئے ہیں ۔ بعض روایات مشکوك اور ضعیف ہیں ۔ متعدد اخلاق، عادات و واقعات بھی درج ہیں ۔ لیکن اس قسم کی کتاب میں ایسی غلطیاں تعجب انگیز نہیں ۔ مؤلف مؤرخ نہیں جو واقعات کی تحقیق و جائزہ کے بعد ان کو ضبط کرے ۔ اس کا مقصد بزرگوں کی اعلی صفات ، کمال مراتب اور کردار و اقدار کو پیش کرنا مقصود ہوتا ہے ۔

تاریخ جہانگشای جوینی

کتاب کے مصنف علاء الدّین عطا ملك جوینی ہیں ۔ وہ سلطنت مغول کے اکابر امراء میں سے تھے۔وہ ۱۵ برس تك امیر ارغون اور ہلاکو کے دبیر خاص رہے ۔ بعد میں ہلاکو اور اسکے بیٹوں کی طرف سے ۲۴ سال تك بغداد اور عراق عرب کے حاکم رہے ۔ انھوں نے سالہا سال تك مغلیہ سلطنت کے مفتوحہ علاقوں میں سفر کیا ۔ اور واقعات کو بہ چشم خود دیکھا یا معتبر لوگوں سے بلا واسطہ سنا ۔ ان کے آباء و اجداد اور اقارب خوارزمشاھی اور مغلیہ سلطنت کے وابستگان میں سے تھے ۔ قلعہ الموت کا مشہور و معروف کتابخانہ ہلاکو کے حکم سے ان کے تصرف میں دے دیا گیا تھا ۔ چنانچہ تاریخ اسماعیلیہ اس کی مدد سے مکمل کی گئی ۔ یہ کتاب خوارزمشاھی ، مغل اور اسماعیلی تاریخ کی وجہ سے بہت اہم ہے اور معاصر اور متأخر مؤرخین نے اسی کتاب سے استفادہ کیا ہے ۔ مثلاً عبداللّٰہ بن فضل اللّٰہ نے تاریخ وصاف میں ، رشید الدّین فضل اللّٰہ نے جامع التواریخ میں، ابن عربی نے مختصر الاولٓ میں، ابن طقطقتی نے کتاب فخری میں ، شہاب الدّین احمد نے مسالك الابصار فی ممالك الابصار میں اس کتاب کو بالواسطہ اپنا مآخذ قرار دیا ہے ۔ تاریخ گزیدہ ، تاریخ بناکتی ، روضۃ الصفاء ، حبیب السیر اور بعد کی تاریخوں میں بے شمار فصلیں تاریخ جہانگشای سے نقل کی ہیں ۔

جہانگشا تین جلدوں پر مشتمل ہے :

جلد اول : ایك طویل دیباچہ اور ایك فصل پر مشتمل ہے جس میں مغول قدیم کے عادات و رسوم ، چنگیز خان کے وضع کردہ قوانین بیان کیے ہیں ۔ اور پھر چنگیز خان ، اس کے بیٹوں اور پوتوں کی زندگی کے بارے میں واقعات اور ان کی فتوحات کا ذکر ہے ۔

جلد دوم : میں خوارزمشاھی سلطنت کی تاریخ ، اور خاص طور پر آخری حکمرانوں کا مفصل ذکر کیا ہے ۔

جلد سوم : میں منگو قاآن بن تولی بن چنگیز خان ، ھلاکو کی ایرانی فتوحات اور اسماعیلیوں کی تباہی کا تفصیلی ذکر ہے ۔

مصنف ۲۷ برس تك حکومت سے وابستہ رہا اور ۶۸۱ ھ تك زندہ رہا ۔ فتح بغداد میں وہ خود شریك تھا ۔ ہلاکو ، اباقاخان اور تکودار کے عہد حکومت کے واقعات و حوادث میں موجود تھا لیکن وہ اس عرصہ کے احوال و کوائف اپنی کتاب میں شامل نہیں کر سکا ۔

کتاب ۶۵۰ - ۶۵۱ ھ سے شروع ہوئی اور ۶۵۸ ھ کو پایۂ تکمیل کو پہنچی ۔ کتاب کا اسلوب بیان آرایشات لفظی سے مزین ہے اور کثرت الفاظ عربی ، تلمیحات اور مرادفات

سے بھی کام لیا ہے ۔ لیکن کہیں عبارت سلیس اور سادہ بھی ہے ۔

تاریخ وصّاف

کتاب کا اصلی نام « تجزیة الامصار و تزجیة الاعصار » ہے ۔ اس کے مؤلف عبداللّٰہ بن فضل اللّٰہ شیرازی ہیں ۔ جو « وصاف » یا «وصاف حضرت» کے لقب سے معروف تھے .وہ رشید الدین فضل اللّٰہ طبیب خاص اور وزیر غازان خان اور الجایتو کا ہم عصر تھا۔ اور مستوفی کے عہدے پر فائز تھا ۔ اس نے تاریخ مغول کے بارے میں جن واقعات کا ذکر کیا ہے ان میں وہ شاہد تھا یا ان کو سلطنت کے اکابر و امرا سے براہ راست سنا تھا ۔ بنیادی طور پر تو یہ تاریخ مغول ہے ۔ لیکن ضمنی طور پر اس میں بعض ہم عصر یا قریب العصر دوسرے سلاطین کا بھی ذکر ملتاہے ۔

تاریخ وصاف ۶۵۶ ھ یعنی زوال بغداد سے لے کر ۷۲۸ ھ یعنی مغل سلطنت کے آخری حکمران ابو سعید کے عہد سلطنت کے وسط تك کے احوال و واقعات پر مشتمل ہے ۔ کتاب کی تاریخی اہمیت ہے اس میں کوئی شك و شبہ نہیں لیکن اسلوب بیان پر تکلف و تصنع ہے ۔ عربی الفاظ و اشعار کی کثرت ، تجانیس ، مراعات لفظی اور دوسری صنایع لفظی و معنوی کے استعمال سے عبارات اس قدر ثقیل ہوگئی ہیں کہ عام قاری اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا ۔

گلستان

اس کے مؤلف مشہور عالم ادیب و شاعر مصلح الدّین ابو محمّد عبداللّٰہ متخلص بہ سعدی (م -۶۹۱ ھ) ہیں .

گلستان سعدی ادبیات فارسی میں نثری شاہکار شمار ہوتی ہے ۔ ایرانی دانشوروں کے مطابق سعدی کی عظمت و مقبولیت گلستان کی وجہ سے ہے ۔ اگرچہ یہ چھوٹی سی کتاب ہے ۔ مگر مطالب و مفاہیم کے اعتبار سے گران بہا ہے ۔ سعدی نے حکایات کے ضمن میں زندگی کے ہر شعبے سے متعلق کوئی نہ کوئی کارآمد بات کی ہے ۔ شاہ سے گدا تك اس میں اپنی دلچسپی کا سامان پاتے ہیں ۔

سعدی نے یہ کتاب ۶۵۶ ھ میں تألیف کی ۔ وہ اپنی تیس سالہ سیاحت کے دوران زندگی کے تلخ حقائق سے روشناس ہوا ۔ مختلف طبقات سے اسے واسطہ پڑا ۔ اس سے گوناگون تجارب حاصل کیے ۔ بعد میں اس نے یہ کتاب تألیف کی ۔ اس کتاب کو اس نے مندرجہ ذیل آٹھ ابواب میں تقسیم کیا :

۱- در سیرتِ پادشاہان ۔ ۲- اخلاقِ درویشان ۔ ۳- فضیلت قناعت .
۴- فضیلت خاموشی ۔ ۵- عشق و جوانی ۔ ۶- ضعف و پیری .
۷- تاثیرِ تربیت ۔ ۸- آدابِ صحبت ۔

کتاب کے مضامین میں موزوں تناسب ہے ۔ اس لئے پڑھنے والے کی دلچسپی برقرار رہتی ہے ۔ عموماً ان مضامین سے بحث کی ہے جن سے عام طور پر زندگی میں واسطه پڑتا ہے ۔ اس لئے اس کی مقبولیت میں آج تك فرق نہیں آیا ۔ اور مطالعه کرتے ہوئے خستگی اور گرانی محسوس نہیں ہوتی .

« گلستان » کی ایك خوبی یه بھی ہے که اس کی حکایات میں نظم و نثر میں تناسب ہے .پہلی کتابوں میں بے جا اشعار کی بھرمار سے کتاب کی افادیت میں بڑا خلل پڑ جاتا تھا . سعدی نے فرد یا دو تین اشعار کے قطعات لکھے ہیں . اور قادر الکلام ہونے کی وجه سے ایسے موزوں اشعار داخل کئے ہیں جو کہانی سے نہایت مناسبت رکھتے ہیں. اور بذاتِ خود شعری حسن کے حامل ہیں اسلئے اکثر زبان زد خلائق ہیں .

ادبی اهمیت اور اسلوب بیان : گلستان کی زبان نہایت موزوں ہے . کلمات میں ایك آهنگ اور توافق صدا ہے ۔ اس میں سعدی کے اپنے فطری ذوق اور لطف سلیقه کو بڑا دخل ہے ۔ بعض جملوں کی ترکیب میں ایسی ہمواری اور روانی ہے که چند لفظوں اور فعلوں کو پس و پیش کرنے سے مصرعے نکالے جا سکتے ہیں ۔ مثلاً ان جملوں کو دیکھئے :

از بزرگان گفت ملاح هر یکی پنجاه دینارت دهم
بگیر این راهروان را شبی یاد دارم که یاری عزیز

فارسی نثر میں کوئی ایسی کتاب نہیں جس کے جملوں میں یه تناسب اور موزونیت ہو ، سعدی سے پہلے کی نثری کتابوں میں سخت و ثقیل الفاظ استعمال کرتے تھے اور مرکب جملے لا کر خواہ مخواہ کلام کو طویل کرتے تھے ۔ مگر سعدی نے ایجاز و اختصار سے کام لیا ہے . مترادفات کو کم کیا ہے ۔ اس کی نثر ہی سے اگر کوئی لفظ کم کردیا جائے تو عبارت کا توازن بگڑ جائے اور معانی میں بھی خلل پڑے .

فن نثر میں تین قسم کے اسالیب مشہور ہیں :

مقفی : وہ نثر ہے ۔ جس میں وزن نه ہو . مگر آخری الفاظ میں قافیه ہو .

مسجع : وہ نثر ہے جس کے دو فقروں کے درمیان تمام الفاظ ایك دوسرے کے هم وزن ہوں اور حرفِ آخر بھی موافق ہوں .

مرجز : وہ نثر ہے . جس میں وزن ہو مگر قافیه نه ہو .

گلستان میں جہاں جہاں مقفی و مسجع عبارتیں آئی ہیں ۔ وہ قدرتی معلوم ہوتی ہیں ۔ ان میں تکلف اور تصنع نہیں پایا جاتا ۔ سلاست و روانی میں بھی فرق نہیں آیا ۔ یہی اس کی نثر نگاری کا کمال ہے ۔ مثلاً یہ جملے دیکھئے ۔ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں ۔

ای مردان بکوشید تا جامۂ زنان نپوشید.
هنوز چشمش نگرانست که ملکش با دیگرانست.
اگر رفتی کردی و اگر خفتی مردی.
تو نگری به علم است نه بمال بزرگی به عقل است نه بسال

سعدی عربی نثر نگاروں میں حافظ کے شیوۂ بلاغت کی پیروی کرتا ہے ۔ فارسی نثر۔ نویسوں میں سے ابو المعالی اور عبداللّٰہ انصاری کو باہم ملا کر اس نے گویا اپنا اسلوب نکالا ہے۔ اور کہیں کہیں مثلاً « جدال سعدی با مدعی » اور جامع کاشغر والی کہانیوں میں حریری اور حمیدی کے مقامات کا اندازِ بیان بھی ان کے پیش نظر رہا ہوگا ۔

اور ادباء نے سعدی کے تتبع میں نثر کو لکھنے کی کوشش کی ہے . لیکن کوئی بھی اس پایہ کو نہیں پہنچا ۔ عبدالرحمن جامی اور قاآنی جیسے قادر الکلام شعراء نے « گلستان » کے مقابلے میں «بہارستان» اور « پریشان » لکھیں ۔ لیکن ان میں اور گلستان میں وہی فرق ہے جو اصل نگینوں اور کانچ کے ٹکڑوں میں ہوتا ہے ۔

گلستان کی اخلاقی اہیمت

سعدی نے گلستان میں زندگی میں کام آنے والے نہایت مفید مشورے دیئے ہیں ۔ اس کے حکیمانہ اقوال کا بڑا چرچا ہے .وہ بادشاہوں کے سامنے حق بات کہنے سے نہیں چوکتا ۔ ان کو عدل و انصاف کی تلقین کرتا ہے ۔ لیکن وہ مطلق العنان ، تنک مزاج اور خوشآمد طلب بادشاہ کے سامنے حکمتِ عملی کے طور پر مشورہ دیتا ہے ۔ کہ :

اگر شب روز را گوید شب است این بباید گفت نیك ماه و پروین

وگرنہ انہوں نے خود اعتمادی اور عزت نفس کی پاسداری کیلئے جو باتیں کی ہیں ۔ وہ ان کی بلند نگہی اور عالی همتی کی دلیل ہیں ۔ مثلاً : گردنِ بی طمع بلند بود ۔

هر که نان از عمل خویش خورد منــــت حاتم طائی نبـــرد
حقّا که با عقوبت دوزخ برابر است رفتن به پائمردی همسایه در بهشت
نان جو خوردن و بر زمین نشستن به از کمر زرین بستن و به خدمت ایستادن

« گلستان » میں سعدی نے کہانیوں کی وساطت سے خود مختار بادشاہوں ، مصـــاحبوں اور ندیموں کو اتنے مفید مشورے دیئے ہیں کہ ان کی بناء پر

State Ethics پر ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے ۔ سعدی زندگی کے جہاد میں صبر کی تلقین کرتے ہیں ۔ حسد اور رقابت سے منع کرتے ہیں ۔ دوسروں سے نیکی کرنے اور گناہوں کو معاف کرنے کی نصیحت کرتے ہیں ۔ دنیاوی لہو و لعب اور ہوس سے روکتے ہیں ۔ اور قناعت اور شکرگزاری کی تعلیم دیتے ہیں ۔ دنیاوی مال و متاع اور زندگی کی نا پائیداری کا افسوسناك تصور دلا کر کہتے ہیں کہ نیکی کرو اور نیك نامی حاصل کرو. کہ نوشیروان نمرد کہ نام نیکو گذاشت عالمگیر انسانی برادری کی یاد دلا کر ایك دوسرے سے ہمدردی کا سبق دیتے ہیں ۔ ذاتی اوصاف میں خاموشی اور وقار کو بہتر سمجھتے ہیں . ان کا قول ہے کہ : بیہودہ گفتن می برد قدر خویش ۔ تکبر سے باز رہنے اور غصے کو ضبط کرنے کی تلقین کرتے ہیں ۔ سعدی نے بعض ایسے اقوال پیش کئے ہیں ۔ جن پر اعتراض کئے جاسکتے ہیں ۔ اور ان کے خلاف دلائل بھی دئیے جا سکتے ہیں ۔ لیکن ان کی صداقت سے یکسر انکار نہیں کیا جاسکتا ہے ۔ مثلاً :

« دروغ مصلحت آمیز به از راستی فتنه انگیز »

گرگ زاده گرگ شود گرچه با آدمی بزرگ شود
نیکوئی با بدان کردن خیانت کسی بر کردن بجائی نیك مردان
راہِ راست برو گرچه دور است زن بیوه مکن اگرچه حوراست

تاریخی و جغرافیائی اہمیت : سعدی نے « گلستان » میں ان مقامات کا ذکر کیا ہے جہاں جہاں وہ گئے اور ٹھہرے ہیں .مثلاً بامیان ، جامع کاشغر ، جامع بعلبك ، جامع دمشق اور سرائے اغلمش اور دوسرے شہروں کا ذکر کیا ہے ۔ اسی طرح بعض معروف شخصیات سے اپنی ملاقات کا بھی حال بتایا ہے ۔ مثلاً ابوالفرج جوزی اور شہاب الدّین سہروردی .اسی کتاب کی مدد سے ان کے سفرنامہ کی شاہراہ بھی معین کی جا سکتی ہے .

مطلع السعدین

مطلع السعدین کے مصنف کمال الدّین عبدالرزاق بن اسحاق سمرقندی ۸۱۶ میں پیدا ہوئے ان کے والد مولانا جلال الدّین سمرقندی ، مرزا شاہرخ بن تیمور کی فوج میں قاضی اور امام تھے ۔ ۲۵ سال کی عمر میں عبدالرزاق نے قواعد پر ایك کتاب لکھی اور مرزا شاہرخ کے نام منسوب کی ۔ ۸۴۵ ھ میں ان کو ھندوستان میں حاکم بیجانگر کے پاس سفیر کے طور پر بھیجا گیا . ۸۵۰ ھ میں وہ گیلان میں سفیر بن کر رہے ۔ ۸۶۰ ھ میں مرزا شاہرخ کی وفات کے بعد وہ عبداللطیف ، عبداللہ ، ابوالقاسم بابر اور آخر میں

ابو سعید کے دربار میں ملازم رہے ۸۶۱ ھ میں ترک دنیا کرکے خانقاہ میں بیٹھ گئے ۔ ۸۸۷ ھ من فوت ہوئے ۔

مطلع السعدین دو جلدوں پر مشتمل ہے ۔ ان میں ۱۷۰ سال کے واقعات بیان کیے گئے ہیں ۔ سلطان ابو سعید کی پیدائش سے لے کر (۷۰۴ ھ) تیمور کے پوتے ابو سعید کی وفات تک کے واقعات قلمبند کیے گئے ہیں ۔ ان دونوں ابو سعید کے ناموں کی مناسبت سے کتاب کا نام سعدین رکھا گیا ۔ کتاب ۸۷۲ ھ میں تألیف ہوئی ۔

سب واقعات سن وار لکھے گئے ہیں اسلئے وہ جھگڑے اور لڑائیاں جو دو تین تین سال تک پھیلے ہوئے ہیں ان کے بیان میں تسلسل نہیں رہا ۔ اس کتاب کا اکثر حصہ زبدۃ التواریخ مؤلفہ حافظ ابرو سے مآخوذ ہے ۔ لیکن بیان کرتے وقت جزئیات تک کو مدّنظر رکھا ہے ۔ ان مراسلات کی بڑی تاریخی اہمیت ہے جو مرزا شاھرخ نے شاھزادوں ، چین اور مغل بادشاہوں کو لکھے تھے۔ اس کتاب میں وہ لفظ بہ لفظ محفوظ ہوگئے ہیں ۔

اسلوب بیان

جہاں جہاں عام واقعات کا تذکرہ ہے وہاں زبان سادہ ہے مگر کہیں کہیں ترک اور مغولی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ۔ جہاں کہیں جشن ، ضیافت ، لشکر آرائی ، اور بادشاہوں اور شاہزادوں کی مدح و ستایش کی ہے ۔ وہاں مسجع و مقفی علامات لکھنے کا اہتمام کیا ہے ۔ مترادفات کا استعمال عام ہے ۔ اور عربی الفاظ کی بھی کثرت ہے ۔

بخش ششم :

تیموری دور میں فارسی ادب کا جائزہ

ایران میں تیموری دور حکومت ۷۸۶ سے ۹۰۵ ھ تك شمار ہوتا ہے ۔ شاہان تیموری میں تیمور ، شاھرخ ، الغ بیگ ، بایسنغر اور حسین بایقرا نامور ہیں ۔ ان میں اکثر صاحب ذوق تھے ۔ علم و ہنر سے رغبت رکھتے تھے اور خود بھی شعر کہتے تھے ۔ ہرات مرکز تھا ۔ ان کے عہد میں تعمیر ، نقاشی ، خطاطی اور دوسرے فنون لطیفه کو ترقی ہوئی ۔ شعراء فارسی کے ساتھ ساتھ ترکی میں بھی شعر کہتے تھے ۔

شاعری

اس دور میں دو بڑے شاعر ہوئے :

حافظ شیرازی اور عبدالرحمن جامی ۔

حافظ نے مجازی و حقیقی مضامین کو ایسی فنی مہارت سے بیان کیا که غزل اپنے کمال عروج پر پہنچ گئی ۔ جامی جامع الصفات تھے ۔ صوفی ، شاعر ، عالم ۔ انہوں نے مختلف علوم عقلی و نقلی پر کتابیں لکھیں ۔ قصیده ، مثنوی اور غزل میں مہارت دکھائی ۔ خمسه نظامی کے جواب میں دو مثنویوں یوسف و زلیخا اور سبحة الابرار کا اضافه کیا ۔ غزل میں نعت کو مقبول بنایا ۔ زبان پر قدرت تھی ۔

اس دور میں دربار سے زیاده قدردانی نہیں ہوئی اور شاعری نجی مشغله بن گیا ۔ تقریباً ۴۱ شاعروں کےنام ملتے ہیں ۔ ان میں کوئی نامی گرامی نہیں ہوا ۔ متوسط درجے کے شاعر تھے ۔ انہوں نے سب اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے ۔ چند معروف شعراء کا ذکر ذیل میں کیا جاتاہے ۔

علی شیرنوائی / خانی . وزیر سلطان حسین بایقرا . چار دیوان مرتب کیے . خمسهٔ نظامی کا جواب لکھا ۔ فارسی میں «خانی» تخلص کرتے تھے ۔ مضمون آفرینی اور ایجاز کی کوشش کی گئی .

کمال خجندی (م - ۸۰۸ ھ) اس نے غزل میں دقیق معانی اور نادر مضامین بیان کیے .

محمّد شیرین مغربی تبریزی (م - ۸۹۰ ھ) صوفی تھا ۔ غزل اور ترجیع بند میں وحدت الوجود اور دوسرے عرفانی حقایق بیان کیے ہیں .

ابو اسحاق اطعمه شیرازی (م - ۵۸۳ ھ) معـروف به بسحق اطعمه -

ساری شاعری غذاؤں اور کھانوں کی تعریف پر مشتمل ہے ۔

نظام الدّین محمود قاری یزدی ۔ اس کی شاعری کا محور مختلف قسم کے ملبوسات ہیں ۔ دیوان النسبه چھپ چکا ہے ۔

نعمت اللّٰہ کرمانی (م - ۸۳۳ ھ)۔ اس نے غزل ، قصیدہ اور مثنوی میں تصوّف و عرفان کے مسائل بیان کیے ہیں ۔

سید علی قاسم الانوار (م - ۸۳۷ ھ) فارسی کے علاوہ ترکی اور گیلانی زبان میں بھی غزلیں لکھی ہیں ۔

محمّد بن عبداللّٰہ کاتبی شیرازی (م - ۸۳۹ ھ) اس نے خمسہ نظامی کے جواب میں حسن و عشق ، ناظر و منظور،بہرام و گل اندام مثنویاں لکھیں ۔

امیر شاہی سبزواری(م- ۸۵۸ ھ)اس کی نفیس اور لطیف غزلیں قابل توجه ہیں ۔

آذری اسفراینی (م - ۸۶۶ ھ) . اس نے غزلیں اور قصیدے کہے ہیں . بہمنی سلاطین کیلئے مثنوی « بہمن نامه » لکھی ۔

محمّد بن حسام الدّین (م - ۸۷۵ ھ) ، حضرت علی ، ان کے مناقب اور جنگی کارناموں پر مشتمل مثنوی « خاور نامه » یادگار ہے ۔

نثر

اس دور کی نثر سادہ اور رواں بھی ہے اور پر تکلف و مصنوع بھی ، ترکی کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں سلاطین و امراء کی تعریف یا موضوع کی تمہید میں مقفی و مسجع عبارات لاتے ہیں ۔ فارسی نثر میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے ۔ تاریخ ، علوم عقلی و نقلی ، حکایات ، قصے ، ترجمے ، تفسیر ، تصوّف و اخلاق پر متعدد کتابیں لکھی گئیں ۔

تاریخ

ظفر نامه از نظام شامی ۔ ظفر نامه تیموری از شرف الدّین علی یزدی (م - ۸۵۸ ھ) زبدة التواریخ از حافظ ابرو (م - ۸۳۳ ھ) ، مجمل التواریخ ، احمد فصیحی خوافی ، روضة الصفا از محمّد بن خاوند شاہ (۷ جلد)۔ ساتویں جلد خواند میر نے مکمل کی ۔ روضات الجنات فی تاریخ مدینه هرات از معین الدّین محمّد اسفراینی ۔

تذکرے

تذکرۃ الشعرا از دولتشاہ سمرقندی ۔ نفحات الانس (تذکرۂ اولیا و شعراء) از عبدالرحمن جامی ۔

مجالس النفایس اثر علی شیر نوائی ۔ ہفت اقلیم تألیف امین احمد رازی ۔

اخلاق

رشحات عین الحیات مؤلفہ علی بن حسین واعظ ۔ اخلاق جلالی از جلال الدّین دوانی ۔

اخلاق محسنی از حسین واعظ کاشفی ۔ انوار سہیلی مؤلفہ حسین واعظ کاشفی۔

تصوف

لوایح ، عبدالرحمن جامی از اشعة اللمعات عبدالرحمن جامی ۔ مجالس العشاق از حسین بایقرا ۔

حکمت و طبیعیات

دانشنامہ جہان از غیاث الدّین علی حسینی اصفہانی ۔

نجوم

اختیارات ، سبعہ کاشفیہ از حسین واعظ کاشفی ۔

تفسیر

مواہب علیّہ ، جواہر الاسرار یا جواہر التفسیر ، حسین واعظ کاشفی۔

مذہب و تاریخ

روضۃ الشہدا از حسین واعظ کاشفی ۔ جاویدان نامہ (فرقہ حروفیہ) تألیف فضل اللہ استر آبادی ۔

ادب

بہارستان از جامی ۔ لطایف الطوائف از علی بن حسین ۔

حافظ شیرازی

محمّد نام ، شمس الدّین لقب ، حافظ تخلص تھا ، حافظ کا سال ولادت ۷۲۶ ھ ہے ۔ اس کے معاصر محمّد گل اندام مرتب دیوان نےسال وفات ۷۹۲ ھ لکھا ہے ۔ تذکروں میں باپ کا لقب بہاء الدّین / کمال الدّین لکھا ہے ۔ وہ اصفہان کے رہنے والے تھے ۔ وطن چھوڑ کر شیراز آگئے اور تجارت سے زندگی بسر کرنے لگے ۔ حافظ کی والدہ کازرونی تھی اور

شیراز کے دروازہ کازرون میں رہتی تھیں ، والد کی وفات کے بعد حافظ، دو بھائی اور والدہ باقی رہ گئے ۔ ایک بھائی خواجہ خلیل عادل ۷۷۵ ھ میں فوت ہوگئے ۔ دوسرے بھائی الگ ہوگئے ، حافظ اور والدہ اکیلے رہ گئے ۔ حافظ خمیرگری سے نان و نفقہ مہیا کرتے ۔ فارغ اوقات میں تعلیم حاصل کرتے ۔ قرآن مجید حفظ کیا . اساتذہ سے متداولہ علوم حاصل کیے ۔ تفسیر، فقہ ، حکمت و الٰہیات کا مطالعہ کیا ۔ علم ہیأت ، ہندسہ ، موسیقی اور شطرنج نرد وغیرہ کھیلوں کی اصطلاحات سے بھی آگاہی حاصل کی ۔ گل اندام نے انہیں « مولانا الاعظم ، مفخر العلماء ، استاد تحاریر الادباء »، لکھا ہے . تصوّف و عرفان کے رموز و اسرار سے آگاہ تھے . ممکن ہے انہوں نے سلوک و طریقت کے مراحل بھی طے کیے ہوں . حافظ شیراز سے باہر نہیں گئے ۔ محمود شاہ دکنی (۷۸۰- ۷۸۹ ھ) نے زاد راہ بھی بھیجا تھا اور انہوں نے ہرمز تک سفر بھی کیا ۔ لیکن سفر کی صعوبتوں سے گھبرا کر واپس آگئے .اسی طرح سلطان غیاث الدّین حاکم بنگال نے بھی بلایا تھا ۔ لیکن نہیں گئے ۔ جواباً غزل لکھ بھیجی ۔ حافظ کی زندگی میں شیراز پر آل مظفر کے مندرجہ ذیل حکمران تھے ۔ حافظ ان کے درباروں سے وابستہ تو نہیں ہوئے لیکن بعض سلاطین کے وزراء نے ان کے ساتھ مربیانہ سلوک کیا ۔ حافظ نے ان بادشاہوں کے متعلق اپنے اشعار میں اشارے کیے ہیں :

ابو اسحاق اینجو (۷۴۳- ۷۵۴ ھ)۔ میر مبارزالدّین (۷۵۴ - ۷۶۵ ھ)۔ شاہ شجاع (۷۶۵ - ۷۸۶ ھ) ۔ زین العابدین (۷۸۶-۷۸۹ ھ)۔ شاہ یحیی (۷۸۹ ھ) ۔ شاہ منصور(۷۹۰- ۷۹۵ ھ)۔

وزاراء و امراء میں یہ اشخاص شامل ہیں :

خواجہ عماد الدّین محمود ، حاجی قوام الدّین حسن (م -۷۵۴ ھ) ، برہان الدّین (م- ۷۸۰ ھ)، قوام الدّین محمّد صاحب عیار (مقتول ۷۶۴ ھ)، خواجہ جلال الدّین تورانشاہ ، (م ۷۸۶ ھ) ۔

حافظ کا زمانہ اگرچہ پرآشوب و جنگ و جدل کا زمانہ تھا . پانچ چھ بادشاہ الٹ پلٹ ہوگئے . تیموری حملوں نے بھی بستیوں کو تہس نہس کر دیا ۔ اس کے باوجود امن کی حالت میں یا گوشہ انزوا میں علماء ، عرفاء ، شعراء زندہ تھے اور علمی و عرفانی مجالس قائم ہوتی تھیں ۔ حافظ نے خود اپنے معاصر علماء ، عرفاء کا ذکر کیا جن سے انہوں نے استفادہ کیا ۔ مثلاً :

شیخ مجد الدّین (م - ۷۵۶ ھ) قاضی شیراز ، قاضی عبدالرحمن عضد الدّین (م - ۷۶۵ ھ)،متکلم اور کتاب مواقف کے مصنف شیخ بہاء الدّین (م - ۷۸۶ ھ)

شمس الدّین عبداللّٰہ شیرازی ، استاد حکمت و الہیات ، سیّد شریف جرجانی (م-۸۴۶ ھ) شرح مطالع اور شرح مواقف کے مؤلف ۔ محمّد گل اندام (م- ۷۹۲ ھ) مرتب دیوان حافظ. شیخ امین الدّین (م - ۷۴۵ ھ) صوفی ۔ خواجہ کمال الدّین سید ابو الوفا شیرازی . شیخ الاسلام زین الدّین تائباری (م - ۷۹۱ ھ) ۔ نعمت اللّٰہ ولی (م - ۸۲۷ ھ) عارف بزرگ ۔

حافظ کے معاصر شعراء یہ تھے :

خواجو کرمانی(م - ۷۶۳ ھ)۔ عبید زاکانی (م - ۷۷۱ ھ)۔
عماد فقیہ (م - ۷۷۳ ھ)۔ سلمان ساوجی (م - ۷۷۸ ھ)۔
کمال خجندی (م - ۷۹۳ ھ)۔ بو اسحاق اطعمہ (م - ۸۴۰ ھ)۔

اخلاقی و معاشرتی پس منظر

حساس شاعر اپنے زمان و مکان سے بیگانہ نہیں رہ سکتا ۔ ممکن ہے ۔ قصیدہ گو شعرا کے بارے میں کہا جا سکے کہ ان کی شعری وسعت ایك محدود دائرے میں رہتی تھی ۔ ان کی ساری زندگی مدح و ستائش میں صرف ہوتی تھی ۔ لیکن جب کبھی انہیں اس مخصوص روش سے ہٹ کر بات کہنے کا موقع ملا تو ان کے قلم سے داخلی و خارجی زندگی کی جھلکیاں نمودار ہوییں ۔ غزل گو شعرا کی بھی بعض زمانوں میں یہ روش رہی ہے کہ وہ غزل کے محدود موضوعات میں گھرے رہے ہیں اور اپنے اس خول سے باہر نہیں نکل سکے ۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے ۔ کہ حاکمانہ جبر کے تحت شاعر اپنی اور معاشرتی جبر کی بات نہیں کہہ سکتا ۔ حافظ ایك حساس شاعر تھے اور وہ اپنے ماحول سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے ۔ اگرچہ انہوں نے اپنے عہد کے سلاطین و وزراء کی مدح میں کہیں نہ کہیں شعر لکھے ہیں ۔ لیکن وہ اپنے زمانے سے ما قبل اور خود اپنے زمانے کے امرا و وزرا کی ہوس کاریوں،خود غرضیوں اور اخلاقی برائیوں سے واقف تھے . وہ جانتے تھے کہ سلطان ابو سعید نے شیخ حسن کی بیوی کو زبردستی طلاق دلوا کر خود شادی کرلی ۔ شاہ شجاع اور شاہ محمود نے اپنے باپ کو اندھا کروا دیا ۔ اور قید میں ڈلوا دیا . شاہ محمود اپنے بھائی کے خلاف اور شاہ یحیی اپنے چچا کے خلاف جنگ و قتال میں مصروف رہے ۔ شاہ شجاع نے اپنے بیٹے شبلی کو اندھا کروا دیا ۔ شیخ حسن کی بیوی نے اپنے شوہر کو قتل کر دیا ۔ بغداد خاتون نے اپنے شوہر ابو سعید کو زہر کھلوادیا ، دمشق ، خواجہ وزیر نے اپنے بادشاہ کی بیگم سے خیانت کی ۔ خودمختار بادشاہوں کے درباروں میں سازشیں ہوتی ہیں . رقابتیں بھی چلتی ہیں اور نااہل بے قدروں کی قدردانیاں بھی ہوتی ہیں ۔ حافظ نے اپنی ایك غزل میں اسی قسم کے شرو فساد کا نقشہ

کھینچا ہے :

این چه شوریست که در دورِ قمر می بینم همه آفاق پر از فتنه و شر می بینم
هیچ رحمی نه برادر به برادر دارد هیچ شفقت نه پدر را به پسر می بینم
ابلهان را همه شربت ز گلاب و قند است قوت دانا همه از خون جگر می بینم
هر کسی روز بهی می طلبد از ایام علت آنست که هر روز بتر می بینم

سلاطین و امرا کے علاوہ علماء فقہا و قضاۃ و شیوخ اور محتسب تك ریاکار تھے . یا بے عمل ، ہوا و ہوس کی خاطر ہر غیر شرعی چیز کو جائز قرار دیتے تھے ۔ بظاہر علم اور زہد و تقوی کا اظہار کرتے لیکن باطن میں بدنیت اور بدکردار تھے ۔ حافظ نے اپنے کلام میں ان کا راز افشا کیا ہے :

واعظان کین جلوه بر محراب و منبر می کنند چون به خلوت می روند آن کار دیگر می کنند

فقیهه مدرسه دی مست بود و فتوی داد که مے حرام ولی به ز مال اوقاف است

حافظ کو اس امر کی بھی شکایت ہے کہ اس کے معاشرے میں اہل علم و فضل کی قدر نہیں ہوتی ۔ درباروں میں قصیدہ گو شعراء کی کچھ قدر و منزلت ہے ۔ ندما و ظرفا چٹکلوں اور لطیفوں سے امراء کا دل بہلاتے ہیں ۔ حافظ کے معاصر عبید زاکانی نے اس ناقدری کے متعلق بھرپور طنز کیا ہے ۔ حافظ نے بھی کہا ہے :

کسی که فاضل است امروز در دهر نمی بیند ز غم یك دم رسائی
برند از فاقه پیش هر خسیسی کنون اهل هنر دست گدائی

حافظ نے اپنی ناقدر شناسی کی طرف اشارہ کیا ہے :

تو اهل دانش و فضلی همین گناهت بس

سخن سرائی و خوش خوانی نمی ورزند در شیراز بیا حافظ که تا خود را به ملكِ دیگر اندازیم

حافظ صلح کے داعی ہیں ۔ وہ نصیحت کرتے ہیں کہ دشمنی کو ترك کرو ۔ دوستی کا درخت لگاؤ . صلح و آشتی سے رہو ۔ جنگ و خون ریزی سے بچو :

آسائشِ دو گیتی تفسیرِ این دو حرف است با دوستان مروت با دشمنان مدارا

آفاقیت

کلام حافظ کی ایك خصوصیت عالمگیر انسانی احساسات و جذبات کی عکاسی ہے ۔ انسان کے بعض اساسی جذبات ہیں اور بعض اساسی فکری رجحانات ۔ انسان ہر زمان و مکان میں ہر جغرافیائی اور معاشرتی ماحول میں غم و الم اور نفرت و محبت کے متعلق سوچتا ہے اور متأثر ہوتا ہے ۔ انسان اپنی انفعالی حالت و کیفیت میں اپنے فطری تقاضا

کی بنا پر کسی ہمدرد و غمگسار کی ضرورت محسوس کرتا ہے ۔ حافظ نے اپنے زمانے کے سیاسی انتشار ، اخلاقی برہمی اور معاشرتی ناہمواری سے متاثر ہوکر انسان کے دل و دماغ کی تسلی و تسکین کے لیے جن افکار و جذبات کا اظہار کیا ہے ۔ اس سے دکھیا انسانوں کی ڈھارس بندھتی ہے ۔ ان کی زبان سمجھنے والا مغرب میں بھی ویسے ہی متاثر ہوتا ہے جیسے گوئٹے ہوا تھا اور مشرق میں تو ان کی زبان سمجھنے والے بے شمار ہیں ، اس لئے ان کا متاثر ہونا تو طبعی ہے ۔ دیوان حافظ سے فال نکالنا اور اپنی مشکلات کے وقت اس سے رہنمائی ڈہونڈنا اسی سبب سے ہے کہ اس سے انسانی نفسیات کے ہر گوشے کے لیے کسی نہ کسی طرح سے تسکین کا پہلو نکلتا ہے ۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھیے :

یوسفِ گم گشته باز آید به کنعان غم مخور کلبهٔ احزان شود روزی گلستان غم مخور

ز رنج و راحتِ گیتی مرنجان دل بشو خنداں که آئین جهاں گاهی چنان گاہی چنین باشد

دو یار زیرك و از بادهٔ کهن دومنی فراغتی و کتابی و گوشهٔ چمنی

ساقیا برخیز درده جام را خاك بر سر کن غمِ ایام را

تصوّف و سلوك

حافظ تصوف کے ہر رمز سے آشنا تھے ۔ ان کے کلام میں سلوك و طریقت کے لیے اوّل قدم یعنی کشش و کوشش سے لے کر فنا فی اللّٰہ اور بقا باللّٰہ کے تمام مراحل و مقامات کا ذکر ملتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے ۔ کہ وہ خود ان مراحل سے گزرے ہیں ۔ عبادت و ریاضت کی؛ مرشد کے زیر تربیت رہے ۔ انہیں اپنے صبر و استقامت کا صلہ بھی ملا ۔ اور وہ مکاشفہ اور تجلی الٰہی سے نوازے بھی گئے :

دوش وقت سحر از غصه نجاتم دادند وندران ظلمتِ شب آب حیاتم دادند

سلوك کا دوسرا نام عشقِ خداوندی کی راہ پر چلنا اور اس کا قرب و وصال حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرنا ہے ۔ حافظ نے عشق کا بلند و پاك تصور پیش کیا ۔ عشق ازلی و ابدی ہے ۔ عشق ناپیدا کنارا ہے ۔ لافانی ہے اور عاشق کو بھی جاوداں بناتا ہے :

ہرگز نمیرد آنکه دلش زنده شد به عشق ثبت است بر جریدهٔ عالم دوامِ ما

حافظ نے تصوف و عشق کے اسرار و رموز اور معاملات و واردات کو تین طرح بیان کیا ہے ۔

۱- تصوف کی اصطلاحات کے ذریعے ۔

۲- محبوب مجازی اور اس کے لوازم ، شراب و میخانہ اور اس کے لوازم کی علامات کے ذریعے ۔

۳- محبوب مجازی اور شراب و میخانہ کی تشبیہات کے ذریعے مثلاً میخانۂ عشق ، مطرب عشق ، مستی عشق وغیرہ ۔ دوسری قسم کا طرز اظہار سراپا استعارہ و کنایہ ہے ۔ خاص طور پر شراب اور پھر عشق کا بیان شراب دو آتشہ ہوگئی ہے ۔ حافظ نے مصطلحات کو مدّنظر رکھ کر معارف کو بیان کیا ہے جو شخص ان رموز و علامات سے آشنا نہیں ۔ اس کے لیے مطالب کا استخراج و مفہوم دشوار ہے ۔ وہ اس کے ظاہری معنوں پر ہی اکتفا کرتا ہے ۔

چونکہ حافظ کی زندگی میں ایسا دور آیا ہے کہ شراب سے ان کا شغف رہا ہے ۔ اور انہوں نے شراب کو اس کے اصلی مادی معنوں میں استعمال کیا ہے ۔ اس لیے وہ لوگ جو حافظ کو ولی اللّٰہ اور عارف باللّٰہ جانتے ہیں ، انہوں نے شراب اور اس کے لوازم کی علامات کو ہر جگہ حقیقی معنی پہنانے کی کوشش کی ہے ۔ لیکن اس میں تکلف کی ضرورت نہیں ۔ بیان اس قدر واضح اور صریح ہے کہ مادّی شراب کے علاوہ اور معنی پہنانا خواہ مخواہ کی زیادتی ہے ۔ مثلاً مبارزالدّین شاہ نے مے خانے بند کروا دیے اور علانیہ شراب پینا ممنوع قرار دے دیا تو حافظ نے اس پر تبصرہ کیے بغیر نہ رہ سکے ۔ انہوں نے کہا :

اگرچہ بادہ فرح بخش و بادگلبیز است به بانگ چنگ مخورمے که محتسب تیز است

پھر جب شاہ شجاع کے دور حکومت میں قانونی پابندی اٹھالی گئی تو حافظ نے بھی خوشی کا اظہار کیا :

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بہ گوش کہ دورِ شاہ شجاع است می دلیر بنوش

سلوك و تصوّف میں عجز و اخلاص ، قناعت و استغنا شرط ہے ۔ لیکن حافظ کے زمانے میں بعض صوفی و درویش ، ریاکار اور خود پرست خرقہ پوش تھے حافظ نے ان پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور طنز و تعریض سے کام لیا ہے ۔ مثلاً :

صوفی نهاد دام و سر حقه باز کرد بنیاد مکر با فلك حقه باز کرد

راہِ سلوک میں مقام عالی طے کرنے کے بعد صوفی میں ایك اعتماد عزم پیدا ہوتا ہے ۔ وہ تسخیر کائنات کا دم بھرتا ہے ۔ عشق و سرمستی کے عروج میں کہی ہوئی باتیں محض مجذوب کی بڑ یا قلندروں کی خرافات نہیں ہوتیں بلکہ توفیق الٰہی اور پختہ ایمان کی بدولت ان میں جو قوت پیدا ہوتی ہے ، وہ اس کا اظہار کرتا ہے ۔ زمین و آسمان اس کے زیرِ فرمان نظر آتے ہیں ۔ حافظ نے بھی بعض جگہ اس مقام کی کیفیت کو بیان کیا

ہے :

گدائے میکدہ ام لیك وقتِ مستی بین که ناز بر فلك و حکم بر ستارہ کنم

بیا تا گل بر افشانیم و مے در ساغر اندازیم فلك را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم

چرخ برهم زنم ار غیر مرا رم گردد من نه آنم که زبونی کشم از چرخ فلك

عقاید و افکار

شعرائے متصوفین اور خاص طور پر حافظ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے ۔ کہ ان کے اشعار میں جبریہ عقائد کی تبلیغ ملتی ہے ۔ انسان اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے ۔ اپنی نیکی و بدی کو خدا کی طرف سے مقرر خیال کرتا ہے ۔ جو کچھ دنیا میں اس پر گزر رہا ہے وہ سمجھتا ہے کہ صحیح ہے ۔ اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی جاسکتی . اس قسم کے خیالات و افکار نے قارئین میں تقدیر پرستی کے رجحان کو راسخ کیا اور قنوطیت کو رواج دیا ۔ اس قسم کے اعتقادات پر حافظ کے اشعار ملاحظہ کیجیے :

رضا به داده بده و ز جبین گره بگشای که بر من و تو درِ اختیار نگشاد است

بدرد صاف ترا حکم نیست دم درکش که هر چه ساقی ما ریخت عین الطافست

بر عمل تکیه مکن خواجه که در روزِ ازل تو چه دانی قلمِ صنع به نامت چه نوشت

جبر و اختیار کے یہ مسائل انسانی زندگی کے ساتھ ہمیشہ سے وابستہ چلے آتے ہیں . انسان خدا کو فعال لمایرید جانتا ہے ۔ وہ علام الغیوب ہے ۔ وہ ہماری قسمتوں کا مالك ہے . اس کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں ہوتا ۔ جب انسان غیبی طاقتوں اور حوادث روزگار کے سامنے بے بس ہوجاتاہے تو وہ اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتا ہے جب اس کے منصوبے خاك میں مل جاتے ہیں تو اپنی تدبیر کے سامنے تقدیر کو قاہر سمجھتا ہے ۔ اس قسم کے عقائد حافظ سے مخصوص نہیں .وہ تو مصائب کے مقابلے میں استقامت و جدوجہد کی تلقین بھی کرتا ہے ۔ اور غم و الم میں بھی خوش بینی و امیدواری کا سبق دیتا ہے ۔ اس کے کلام کی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ وہ زندگی کے غم میں آپ کو آزردہ نہیں کرتا :

رسید مژدہ که ایامِ غم نخواهد ماند چنان نماند و چنین نیز هم نخواهد ماند

بوی بهبود ز اوضاع جهان می شنوم شادی آورد گل و باد صبا شاد آمد

مژده ای دل که دگر بادِ صبا باز آمد ہدہد خوش خبر از شہرِ سبا باز آمد

اے دل صبور باش و مخور غم که عاقبت این شام صبح گردد و این شب سحر شود

حافظ کے متعلق یہ کہنا غلط ہے کہ اس کے کلام میں قاری زبونی کا تأثر قبول کرتا ہے ۔ اور اس کے ذہن پر بے عملی و کاہلی غالب آتی ہے ۔ وہ مقصود کے حصول کے لیے جدوجہد کو لازم جانتے ہیں ۔ اور عافیت کوشی کی مذمت کرتے ہیں ۔ مثلاً :

در منزل رہ لیلی کہ خطرہاست در آن شرطِ اول قدم آنست کہ مجنون باشی

نصیحتم چه کنی ناصحا چه می دانی که من نه معتقد مردِ عافیت جویم

در طریقِ عشق بازی امن و آسائش خطاست ریش باد آن دل که با درد جوید مرہمی

اہل کام و ناز را در کوئی رندی راہ نیست رہروی باید جہان سوزی نه خالی بے غمی

عشقِ مجازی

جس طَرح حافظ نے شراب مجازی کے رنگ میں شراب حقیقی یعنی عشق و معرفت کے مضامین بیان کیے ہیں اور ان کے بعض بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شرابِ مادّی کے بھی رسیا رہے ہوں گے ۔ اسی طرح انہوں نے محبوب مجازی کے روپ میں محبوب حقیقی کے مضامین بیان کیے ہیں ۔ لیکن ان کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں انہیں کسی گوشت و پوست رکھنے والے محبوب سے بھی واسطہ پڑا ۔

حافظ کا واقعاً ایك محبوب بھی تھا جو سفر میں چلا گیا اور حافظ نے اس کے فراق میں غزلیں لکھی ہیں ۔ غزل میں ہی خط لکھتے ہیں اور اس کی واپسی کیلئے دعائیں مانگتے ہیں ۔

آن سفر کرده که صد قافله دل ہمراه اوست ہر کجا ہست خدایا به سلامت داراد

بعض فسانہ پرستوں نے حافظ کے بعض اشعار میں فرخ اور شاخ نبات جیسے نام آنے سے یہ سمجھا ہے کہ یہ حافظ کے محبوبوں کےنام تھے ۔ لیکن ان کی کوئی اصلیت نہیں ۔ شاخ نبات سے مراد قلم ہے ۔ دوسرے جن اشعار میں یہ نام استعمال ہوئے ان سے بھی اس امر کی تصدیق نہیں ہوتی :

ای من که در هـــوای روی فرخ بوده آشفته همــچو مــوی فرخ

جان به شکرانه کنم صرف گر آن دانهٔ در صرف دیدهٔ حافظ بود آرامگہش

این همه شہدو شکر کز سخنم می ریزد اجرِ صبریست کز آن شاخ نباتم دادند

یہ بات یقینی ہے کہ حافظ کا محبوب بازاری نہیں ہو سکتا ہے کہ اس کی محبوبہ اس کی بیوی ہو جو نجیب و شریف ہے وہ اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ۔

کرا رسد که کند عیب دامن پاکت که همچو قطره که بر برگِ گل چکد پاکی

خیام و حافظ - فلسفۂ لذّت اندوزی

رباعیاتِ خیام کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خیام متشکک ہے ۔ اس کا خیال ہے کہ :

۱- زندگی ایک معمہ ہے جس کا آغاز و انجام معلوم نہیں ۔

۲- دنیا ناپائیدار ہے ۔ مال و دولت فانی ہے ۔ اور زندگی عارضی ہے ۔

۳- زندگی کے مختصر وقفے کو غنیمت جاننا چاہیے ۔ اور ناؤ نوش سے فائدہ اٹھانا چاہیے ۔ حافظ کے کلام میں بھی یہی فکری رجحانات ملتے ہیں ۔ حافظ کے مندرجہ ذیل اشعار انہی متذکرہ صدر تین نظریات کے آئینہ دار ہیں :

وجود ما عملی ایست ای حافظ که تحقیقش فسون است و افسانه

عیان نه شود ز کجا آمدم کجا بُودم دریغ و درد که غافل ز کارِ خویشتنم

بنشین بر لب جوی و گزرِ عمر ببین کایں اشارت ز جہاں گزراں مارا بس

زان پیشتر که عالمِ فانی شـود خراب ما را بجام بادۂ گلگون خراب کن

حافظ کی غزلیات میں بے شمار ایسے شعر ہیں ۔ جن میں بادہ نوشی ، عیش کوشی اور لذت اندوزی کی تلقین ہے ۔ حافظ کی اس تشویق و تبلیغ سے یہ مفہوم لیا گیا ہے کہ وہ زمانے کے ہنگامہ زاروں سے گریز کا سبق دیتے ہیں ۔ اور عزلت و شراب میں پناہ لیتے ہیں ۔ حافظ کے نزدیک شراب اندوہ ربائی کا وسیلہ اور دنیا کے شر و فساد سے آرام پانے کا ذریعہ ہے :

شراب تلخ ده ساقی که مرد افگن بود زورش که تا یکدم بیاسایم ز دنیا و شر و شورش

علاّمه اقبال جنھوں نے مسلمانوں کے زوال و انحطاط پر گہری نظر ڈال کر اسباب زوال کا تجزیہ کیا ہے ۔ انہوں نے حافظ کے اس قسم کے اشعار کو سکر و مستی و افیون کہا ہے ۔ جو قوم کی عسکری توانائی کو اور بھی ماؤف کرتی ہے ۔ انہوں نے خبردار کیا ہے :

ہوشیار از حافظ صہبا گسار جامش از زہر اجل سرمایہ دار

آن فقیہ ملت مے خوارگان آن امامِ ملّت بے چارگان
بی نیاز از محفلِ حافظ گذر الحذر از گوسفندان الحذر

محاسنِ شعری

۱- حافظ لفظوں کی شعبدہ گری سے واقف ہیں ۔ وہ ایك مرصّع کار کی مانند لفظوں کو اشعار میں نگینوں کی طرح جڑتے ہیں ۔ وہ عموماً مراعاۃ النظیر ، تجنیسات اور ایہام کی رعایت کو مدّنظر رکھتے ہیں ۔ ایك تو تنگنائے غزل ، اس پر قافیہ ، ردیف کی قید اور پھر صنائع لفظی کے اہتمام کیساتھ ایك شعر میں جہان معنی سمونا ایك قادر الکلام ہی سے ممکن ہے ۔ حافظ کی یہ قادر الکلامی مندرجہ ذیل غزل میں قابل داد ہے ۔

گردست دھد خاكِ کف پائی نگارم بر لوح بصر خطِ غباری بنگارم

اس شعر میں دست ، زلف ، پا ، بصر اور خط کی رعایت لفظی ، لوح اور خط کی اور خاك و غبار کی رعایت ، نگار اور نگار کی تجنیس کو ملحوظ رکھا گیا ہے ۔

بر بوی کنار تو شدم غرق و امید است از موج سر شکم که رساند به کنارھم

اس شعر میں کنار اور کنار کی تجنیس ، غرق اور موج کی مراعات لفظی مدّنظر ہے غزل کے باقی اشعار بھی الفاظ کی شعبدہ گری کا مرقع ہیں ۔

۲- ہر شاعر آواز کے زیرویم اور لفظوں کے آہنگ سے ضرور واقف ہوتا ہے ۔ ورنہ غزل اپنے اصلی روپ میں نہیں آتی ۔ کیونکہ لطافت و نغمگی تو غزل کی جان ہے ۔ حافظ یقیناً خوش آواز بھی تھے اور رموز موسیقی سے بھی آگاہ تھے ۔ وہ کہتے ہیں :

این مطرب از کجاست که ساز عراق ساخت و آھنگ بازگشت به راہِ حجاز کرد

اپنے متعلق کہا ہے : غلام حافظ خوش لہجه و خوش آوازم .

حافظ غزل کا مزاج سمجھتے ہیں ۔ انہوں نے اس کی بحروں میں نغمگی کا خیال رکھا ہے ۔ الفاظ کے در و بست میں بھی ذوقِ نغمه کو دخل ہے ۔ حافظ نے کمال کاوش اور احتیاط سے لفظوں کا انتخاب کیا ہے ۔ حافظ کی غزلیں سماع کی محفلوں میں گا کر پڑھی جاتی ہیں ، جو مطالب کے علاوہ اپنے آہنگ سے بھی سامعین کو متأثر کرتی ہیں .
ذیل کی غزلیں اپنے آھنگ کیوجه سے مشہور ہیں :

هنگام تنگدستی در عیش کوش و مستی کین کیمیای ہستی قارون کند گدارا

رسید مژده که ایامِ غم نخواهدماند چنان نماند و چنین نیز هم نخواهدماند

چرا نه در پی عزم دیار خود باشم چرا نه خاك سر کوئی یارِ خود باشم

۳- روایت کے طور پر ایك شاعر اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں اساتذہ سخن کے کلام کو پیش نظر رکھتا ہے اور اس کے اسلوب و روشِ نگارش کی پیروی کرتا ہے ۔ یا وہ اپنے کلام کی پختگی کے دور میں اساتذہ کے مقابل انہی کی روش میں شعر کہتا ہے اور اپنی برتری یا ان کی برابری کا دعوی کرتا ہے ۔ حافظ نے اپنے متقدمین و معاصرین میں سے سعدی ، سلمان ساوجی اور خاص طور پر خواجو کرمانی کے کلام کو پیش نظر رکھا ہے ۔ بعض غزلوں کے برابر ایك ایك شعر کی پیروی کی ہے ۔ اور اسی قافیے میں نئے نئے مطالب نکالنے کی کوشش کی ہے ۔ لیکن وہ اپنے آپ کو روش خواجو کا پیرو کہتے ہیں :

استادِ سخن سعدی است پیش همه کس اما دارد سخنِ حافظ طرز و روش خواجو

لیکن آج خواجو کو بہت کم لوگ جانتے ہیں اور حافظ ہر پڑھے لکھے فارسی جاننے والے کی زبان پر ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ لفظی پیروی سے ایك شخص کا کلام زندہ و پایندہ نہیں ہوتا ۔ شاعر کی اپنی شخصیت اس کے کلام میں داخل ہوجاتی ہے جو اس کو دوسرے کے مقابل انفرادیت بخشتی ہے ۔ حافظ کا اپنا علم فن ، دل کا گداز ، جذبات کا ولولہ ، احساسات کا اخلاص ، وہ عناصر ہیں جو ان کے کلام کا جزو ہو کر منفرد بناتے ہیں ۔ حافظ کو اپنے کلام پر ناز بھی ہے :

ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ به قرآنی که اندر سینه داری

۴- غزل حافظ کی ایك فنی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ایجاز کے پیش نظر مصطلحات کو استعمال کرکے ایمائیت کا خیال رکھا گیا ہے ۔ قاری یا سامع ان علامات پر غور کرنے کے لیے ٹھہرتا ہے ۔ فکر و تامل کے بعد شعر کے کئی کئی معنی نکلتے ہیں ۔ اور شاعر کی تہ در تہ فکر کا احساس ہوتا ہے ۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ کیجیے :

به مژگان سیه کردی هزاران رخنه در دینم بیا کز چشم بیمارت هزاران درد برچینم

صباح الخیر زد بلبل کجای ساقیا برخیز که غوغا می کند در سر خیالِ خواب دوشینم

بعد میں آنے والے شعراء نے حافظ کو استاد غزل مانا ہے اور اس کی تقلید میں شعر کہنے کو اپنے لیے باعث افتخار جانا ہے اور اس کی غزل کا جواب لکھنے کو اپنی

گستاخی پر محمول کیا ہے ۔ نظیری نیشاپوری جو خود استاد غزل مانا جاتا ہے ۔ کہتا ہے :

تا اقتدا به حافظ شیراز کرده ایم گردید مقتدای دو عالم کلام ما

صائب نے کہا :

رواست صائب اگر نیست از رهِ دعوی تتبع غزل خواجه گرچه بی ادبیست

محمّد حسین شہریار :

تا جهان باقی و آئین محبت باقی است شعرحافظ همه را ورد زبان خواهد بود

علامه اقبال نے ایك خاص نقطه نظر سے شعر حافظ پر سخت تنقید کی تھی مگر خود حافظ کے فنی کمال اور طبع سرشار کی وجه سے اس قدر متأثر تھے که انہوں نے لکھا :

« جب میں حافظ کے رنگ میں ہوتا ہوں تو اس کی روح میرے اندر حلول کر جاتی ہے اور میری شخصیت اس کے اندر جذب ہوجاتی ہے اور میں خود حافظ بن جاتا ہوں » ۔ (۱)

جامی (۲)

عبدالرّحمن نام ، نور الدّین لقب ، جامی تخلص ، باپ کا نام نظام الدّین احمد تھا ۔ جامی ۸۱۷ ھ جام میں پیدا ہوئے ۔

ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی ۔ پھر باپ کے ہمراہ هرات میں آ کر مدرسه نظامیه میں قیام کیا ۔ مولانا جنید اصولی ، خواجه علی سمرقندی ، مولانا شهاب الدّین جاجرمی سے شرح مفتاح ، مطوی اور تلویح میں سبق لیے ۔ سمرقند میں قاضی زاده روم سے علم هیأت کی تحصیل کی اور شرح ملخص چغمینی کے مباحث میں شریك ہوئے ۔ جامی تیز فہم اور دراك ذہن رکھتے تھے ۔ واپس هرات میں علاء الدّین علی قوشچی سے تلمذ اختیار کیا اور یہیں مولانا سعد الدّین کاشغری سے بیعت کی ۔ ایك مرتبه هرات سے مرو گئے ۔ خواجه عبیدالله احرار سے کسب فیض کرکے نقشبندیه سلسلے میں داخل ہوئے اور ظاهر و باطن کی تہذیب و تکمیل کی ۔ زندگی میں ایك مرتبه اپنے پیر و مرشد خواجه احرار سے ملاقات کی خاطر ۸۸۴ ھ میں سمرقند گئے ۔ ۸۷۷ ھ میں حج کیا . همدان ، کردستان ، بغداد ، کربلا ، نجف ، مدینه ، مکّه ، دمشق ، حلب ، تبریز کو بھی دیکھا ۔ رشحات عین الحیات میں اسی سفر کی تفاصیل مرقوم ہیں ۔ شہروں میں

---

1. Iqbal , Atiyya Bagam ,1947. p.15.

۲- تفصیل کے لئے دیکھئے : دیوان کامل جامی ، مرتبه هاشم رضی ، تهران ، دیباچه : جامی ، علی اصغر حکمت ، ترجمه عارف نوشاهی، اسلام آباد ، ۱۹۸۱.

ان کا قیام اور حکام و امراء و علماء سے ملاقات کا ذکرکیا ہے ۔

مولانا جامی ۱۸ محرم الحرام ۸۹۸ ھ میں فوت ہوئے ۔

جامی نے ۸۹۳ ھ میں ایک قصیدہ بعنوان رشح بای بہ شرح حال لکھا جو ۸۳ ابیات پر مشتمل ہے ۔ اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ انہوں نے نحو ، صرف ، منطق ، حکمت ، مشائی ، حکمت اشراقی ، حکمت طبیعی ، ریاضی ، علم فقہ و اصول ، علم قرأت و تفسیر قرآنی جیسے علوم پر مہارت حاصل کی ۔

مولانا شرعی احکام و سنن اور رسوم و آداب طریقت پر عمل پیرا تھے ۔ عبدالغفور لاری نے اپنی کتاب تکلم میں جامی کے مفصل حالات بیان کیے ہیں ۔ ان کا سونا ، اٹھنا ، عبادت ، کھانا پینا اور پہننا اور روزمرہ زندگی کے دیگر مشاغل کا تذکرہ کیا ہے ۔

جامی اپنی تمام علمیت ، درویشی ، عبادت گزاری کے باوجود زاہد خشک نہیں تھے ۔ بڑی لطیف و بذلہ گو طبیعت پائی تھی ۔ فخرالدّین علی صفی نے اپنی کتاب لطایف الطوایف میں ان کے شگفتہ لطایف درج کیے ہیں ۔

مولانا جامی کی شادی مولانا سعد الدّین کاشغری کی پوتی یعنی خواجہ کلان کی بیٹی سے ہوئی ان کے چار بیٹے ہوئے ۔

۱- ایک بیٹا ایک دن زندہ رہا اور اس کا نام بھی نہ رکھا گیا ۔

۲- خواجہ صفی الدّین محمّد ایک سال کی عمر میں فوت ہوئے ۔

۳- خواجہ ضیاء الدّین یوسف ۸۸۳ ھ میں پیدا ہوئے ۔

۴- ظہیر الدّین عیسا ۸۹۱ ھ میں پیدا ہوئے اور چالیس روز کے بعد فوت ہوئے ان کے دوسرے اقارب میں ایک بھائی تھے مولانا محمّد نام تھا ۔ ایک بھانجے تھے عبداللّٰہ ھاتفی اور ایک ھم زلف فخر الدّین علی صفی ۔

تصانیف

نثر

۱- بہارستان ۔ ۲- منشآت جامی ۔

نظم

۳- دیوان کامل جامی : فاتحۂ الشباب ، واسطۃ العقد و خاتمۃ الحیات ۔

۴- سلسلۃ الذھب(مثنوی)۔ ۵- سلامان و ابسال (مثنوی)۔ ۶- تحفۃ الاحرار (مثنوی)۔

۷- سبحۃ الابرار (مثنوی)۔ ۸- یوسف و زلیخا ۹- لیلی و مجنون ۔

۱۰- خردنامۂ سکندری ۔

علوم نقلی

۱۱- تفسیر سورۂ اخلاص ۔ ۱۲- تفسیر سورہ فاتحہ ۔ ۱۳- تفسیر قرآن مجید (عربی) سورۂ بقرہ کی آیت ۴۰ تک ۔ ۱۴- چهل حدیث (اربعین) فارسی نظم .
۱۵- شرح حدیث عمائیہ ۔ ۱۶- شواهد النبوۃ تقویت یقین اهل الفتوۃ ۔ ۱۷- مناقب شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ۔ ۱۸- نفحات الانس من حضرات القدس ۔

فقه

۱۹- رسالۂ مناسک حج (صغیر) ۔ ۲۰- رساله مناسک حج (کبیر) ۔ ۲۱- شرح النقابه مختصر الوقایه .

تصوف

۲۲- اشعة اللمعات شرح لمعاتِ عراقی ۔ ۲۳- تهلیلیه ، شرح لا اله الا الله ۔ ۲۴- تهلیلیه یا کلمة فی التوحید۔ ۲۵- الدرة الفاخره یا رساله در تحقیق مذهب صوفی و متکلم و حکیم (عربی نثر)۔ ۲۶- سخنان خواجه پارسا یا الحاشیة القدسیه (فارسی و عربی نثر) .
۲۷- سر رشتۂ طریقۂ خواجگان ۔ ۲۸- سؤال و جواب هندوستان .
۲۹- شرح بیت خسرو دهلوی (۱) . ۳۰- شرح بیت خسرو دهلوی (۲) . ۳۱-شرح رباعیات .
۳۲- شرح فصوص الحکم (عربی نثر)۔ ۳۳- شرح قصیدۂ تائیه فارضیه یا شرح نظم الورد ۔ ۳۴- شرح قصیدۂ عطار ۔ ۳۵- شرح مفتاح الغیب ۔۳۶- رسالۂ طریقۂ خواجگان .
۳۷- لوامع انوار الکشف و الشهود علی قلوب ارباب الذوق و الجود یا شرح خمریه ۔
۳۸- لوایح . ۳۹- نائیه یا نی نامه ۔ ۴۰- نقد النصوص فی شرح نقش الفصوص ۔
۴۱- وجود یا وجودیه یا رسالۂ وجیزه در تحقیق و اثبات واجب الوجود (عربی نثر).

علوم زبان

۴۲- شرح العوامل المائة (فارسی منظوم)، نحو ۔ ۴۳- فوائد الضیائیه (عربی نثر).

فنون شاعری

۴۴- رساله عروض یا مجمع الاوزان ۔۴۵- رسالة الوافیه فی علم القافیه یا مختصر وافی در علم قوافی ۔ ۴۶- حلیۂ حلل = رساله معما (کبیر)۔ ۴۷- رساله معما (صغیر).
۴۸- دستور معما ۔ ۴۹- دستور معما (منظوم)۔ ۵۰- شرح معمیات میر حسین معمائی

علوم عقلی

۵۱- رسالۂ موسیقی ۔

مندرجه بالا کتابوں کے علاوہ ۴۶ اور کتب و رسائل کا سراغ ملا ہے ۔ جو مختلف

کتابخانوں میں موجود ہیں ۔ اور جامی سے منسوب ہیں ۔ بعض کا صراحت کے ساتھ ذکر ہے اور بعض قیاساً جامی سے منسوب ہیں ۔(۱)

سات مثنویاں

جامی کی سات مثنویوں کا یہاں تفصیل سے ذکر کیا جاتا ہے ۔

۱- سلسلة الذهب

بحر خفیف ، فاعلاتن مفاعلن فعلن ، میں لکھی گئی ۔ اس کے تین دفتر ہیں ، پہلا دفتر ۸۷۳ سے ۸۷۷ میں مکمل ہوا اور سلطان حسین بایقرا سے منسوب ہوا ۔ دوسرا دفتر ۸۹۰ ھ میں مکمل ہوا اور وہ بھی سلطان حسین بایقرا سے معنون ہوا ۔ تیسرا دفتر جو مختصر تھا اور پانچ سو اشعار پر مشتمل ہے ۔ سلطان با یزید دوم پادشاہ عثمانی سے منسوب ہوا ۔ کل دو ہزار و دو سو اشعار ہیں ۔

۲- **سلامان و ابسال** ۔ (بحر رمل) ۸۸۵ ھ میں لکھی گئی اور سلطان یعقوب ترکمن آق قوینلو کے نام منسوب ہوئی ۔

۳- **تحفة الاحرار** بحر سریع مطوی مکشوف (مفتعلن ، مفتعلن ، فاعلن) میں منظوم ہوئی ۔ ۸۸۶ ھ میں خواجه عبیداللّٰه احرار سے منسوب ہوئی ۔

۴- **سبحة الابرار** بحر رمل مسدس مخبون مقصور(فاعلاتن، فعلاتن، فعلات) ، سلطان حسین بایقرا سے منسوب ہوئی.

۵- **یوسف و زلیخا** بحر ہزج مسدس (مفاعیلن ، مفاعیلن ، فعولن) . یہ مثنوی ویس و رامین ، فخر الدّین گرگانی ، خسرو شیرین نظامی ، شیریں خسرو امیر خسرو اور گل و نوروز خواجوی کرمانی کے وزن و اسلوب میں لکھی گئی ۔ کل چار ہزار بیت ہیں ۔ ۸۸۸ ھ میں پایۂ تکمیل تك پہنچی ۔ اس میں سلطان حسین بایقرا کی مدح کی ہے ۔

۶- **لیلی و مجنون** اس کی بحر مفعول مفاعلن فعولن ہے ۔ ۸۸۹ ھ میں لکھی گئی اور خواجه عبید اللّٰه احرار سے منسوب ہوئی ۔

۷- **خردنامۂ اسکندری** بحر متقارب مثمن (فعولن فعولن فعولن فعول) میں لکھی گئی . سال تألیف ۸۹۵ ھ ہے ۔

جامی جامع الصفات شخص تھے ۔ علم و فضل میں وسیع الابعاد تھے ۔ ان کی

۱- علی اصغر حکمت : جامی ، ترجمه اردو از سیّد عارف نوشاهی ،صص ۴۰۶ -۴۲۹.

تصانیف فقہ ، تفسیر ، حدیث ، تاریخ ، عروض ، زبان و بیان ، موسیقی جیسے موضوعات پر مشتمل ہیں انہوں نے امیر خسرو کی طرح غزل ، قصیدہ ، مثنوی ، لغز و معما جیسے اصناف سخن میں فنی مہارت سے طبع آزمائی کی ۔ اگرچہ وہ ان تین اصناف سخن میں متقدم اساتذۂ سخن مثلاً : فردوسی، نظامی، انوری ، سعدی ، حافظ ، رومی ، خاقانی کے برابر نہیں آتے لیکن ایران کے بڑے سات آٹھ شعرا میں شمار ہوسکتا ہے . شاعر کے علاوہ وہ دوسری حیثیت یعنی فقیہ ، مفسر ، صوفی ، استاد ، عروض و دستوردان ہونے میں بھی اعلی مقام و مرتبہ رکھتے ہیں ۔

انہوں نے خود اپنے کلام کی خصوصیات سے متعلق مندرجہ ذیل اشعار میں تعارف کرایا ہے :

نظم کلامش نه بغایت بلند تا نشود هر کس از و بهره مند
سه معانیش نه زانسان دقیق کش بتوان یافت به فکر عمیق
لفظ خوش و معنی ظاهر درو آب زلال است و جواهر درو

قصیدہ نگاری

قصاید جامی مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ہیں :

۱- مسجدوں ، خانقاہوں ، باغوں اور مدرسوں پر توصیفی نظمیں ۔
۲- مدح سلاطین تیموری ، عرفا ، بزرگان دین اور ائمہ مذاہب ۔
۳- پند و حکمت ، عزلت ، شکایت روزگار ، شرح احوال خود ۔
۴- توحید ، مناجات ، نعت رسول .

جامی کہتے ہیں کہ وہ قصیدہ سراؤں کی طرح فضول مدح سرائی نہیں کرتے ۔ نہ کسی طمع کیلئے قصیدہ لکھتے ہیں اور نہ کبھی صلہ نہ ملنے پر تقاضا کرتے ہیں . ادنی و کمینہ اشخاص کی مدحت و مذمت کرنا ان کا شیوہ ہے ۔

من آن نیم که زبان را به هرزه آلایم به مدح و ذم خسان نوك خامه فرسایم

بعض لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ جامی ایك صوفی عارف پاکباز ، عالم دین ، عزلت پسند ہوتے ہوئے سلاطین وقت کی قصیدہ سرائی پر کیوں مجبور ہوئے ۔ جامی کا زمانہ ایسا تھا کہ ھرات میں رہ کر سلطان حسین بایقرا جیسے ادب پرور اور عربی علماء و شعراء سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے تھے ۔ رواج کے مطابق انہیں سلاطین وقت کی تعریف کرنا پڑی . ویسے جامی نے ہر کس و ناکس کی مدح نہیں کی ۔ اس نے خود کہا ہے :

جامی به شعر مدحت شیران ملك کن نه مدحت فرعون که به سیرت سگ است و گرگ

جامی نے انوری ، خاقانیؔ ، خسرو ، ظہیر فاریابی جیسے بلند پایہ قصیدہ سرایان فارسی کے تتبع میں قصاید لکھے ہیں ۔ یعنی ان کی بحور اور ان کے اسلوب و روش میں اشعار نکالے ہیں ۔ کچھ مضامین کو اپنایا ہے اور بعض کی تضمین کی ہے مثلا :

سلطان سنجر کی مدح میں انوری کا مشہور قصیدہ ہے :

گر دل و دست بحر و کان باشد دل و دست خدایگان باشد

جامی نے سلطان با یزید کی مدح میں لکھا :

هر کرا در دهان زبان باشد در ثنای شه جهان باشد

خاقانی کا مشہور قصیدہ ہے :

دل من پیر تعلیم است و من طفل زباندانش دمِ تسلیم عشر و سیر زانو دبستانش

امیر خسرو نے اسی روش پر لکھا :

دلم طفل است و پیر عشق استاد زباندانش سواد لوحه سبق و مسکنت کنج دبستانش

جامی نے جلاء الروح کے عنوان سے جوابی قصیدہ لکھا :

معلوم کیست عشق و کنج خاموشی دبستانش سبق نادانی و دانا دلم طفل سبق خوانش

جامی نے اس قصیدے میں کچھ اپنی برتری کا اظہار کیا ہے ۔ یہ تحفہ خراسان شروان و ہند میں پہنچا تو تحسین و آفرین کی نگاہوں سے دیکھا گیا ۔

خسرو کا ایك قصیدہ مواعظ و حکم سے لبریز «بحر الابرار» یا «دریای ابرار» کے عنوان سے معروف ہے ۔

جامی نے اس کی تقلید میں لجۃ الاسرار کے نام سے قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے ۔

کنگر ایوان شه کز کاخ کیوان برترست رخنه ها دان کش به دیوار حصار دین درست

توحید ، مناجات ، نعت رسول ، حضرت علی اور حضرت حسین کے متعلق قصاید میں شاعر کا اخلاص اور جذب و شور شامل ہے ۔

قصاید میں تینوں قسم کے اسلوب دیکھے جا سکتے ہیں ۔ سبك خراسانی کا سادہ و سہل و رواں اسلوب ، سبك عراقی کا پرشکوہ اورعلم و فضل و تلمیحات سے آراستہ اسلوب اور مضمون آفرینی اور تازہ گوئی کے اہتمام کا اسلوب ، تینوں کی مثالیں حسب ذیل ہیں :

این خانه چه خانه است ، پری خانهٔ چین است پر خور یکی غرفه و فردوس برین است

سحر چو بر دل من تافت نور صبور نشور صدای صیحهٔ قوموا شنیدم از دمِ صور

منم که تاج سر چرخ خاك پای منست چو ذره رقص کنان مهر در هوای منست

جامی کو عربی پر کمال تسلط حاصل تھا ۔ وہ فارسی لکھتے لکھتے عربی میں اشعار کا پیوند لگا دیتے تھے ۔ تلمیحات کی تو کئی مثالیں ملتی ہیں ۔

غزل گوئی

جامی نے اپنے شعر کے بارے میں کہا ہے :

کلام تو وحی است جامی بلند   که نازل شده ز آسمانِ دل است
جامی اشعار دلآویز تو جنسی است نفیس   پود آن حسن ادا ، لطفِ معانی تارش
جامی احسنت که این طرز غزل نتوان یافت به دیوان کسی ۔

غزلیں بھی ہیں :

سعدی نهاد کاخِ سخن را ولی   جامی به لیمن همت عالی تمام کرد

جامی کے پسندیدہ غزل گو شعراء حافظ، سعدی ، کمال خجندی ، جلال الدین محمّد بلخی اور امیر خسرو ہیں ۔ انہوں نے خاص طور پر حافظ و سعدی و مولوی کے وزن اور قافیہ و ردیف کی پیروی میں غزلیں لکھی ہیں ۔ ان کے مصرعوں پر تضمین کی ہے ۔ حافظ کی تراکیب اور بعض جگہ پورے مصرعے کے مصرعے اپنا لیے ہیں ۔

جامی کی غزل میں پانچ موضوع بہت نمایاں ہیں .غزل کا بڑا موضوع تو عشقیہ ہے ۔ جس میں محبوب کی شکل و صورت ، اعضا ، ناز و کرشمہ وغیرہ کا بیان ہے ۔ پھر اس کی بے رخی ، بے وفائی، ستم گری کا ذکر ہے ۔ اس کے ساتھ عاشق کی تب و تاب ہے ۔ بحر و فراق میں بے تابی و بے قراری ، بوس و کنار کی تمنا ، حظ و لذت کا حصول ہے ۔

غزل کا دوسرا موضوع عیش و نشاط کا حصول ہے ۔ باغ و باد بہاراں سے لطف اٹھانے کا جذبہ ہے اور ساتھ ہی بادہ مینا سے لطف و مستی حاصل کرنے کا شوق ہے ۔

تیسرا موضوع صاف و واضح الفاظ میں الہیاتی مسائل ، تصوّف و معرفت کے اسماء و رموز اور اسالیب طریقت کا بیان ہے ۔

چوتھا مطلب سخن تصوف و عرفان کے مضامین ہیں جو علامات و تمثیلات کے ذریعے بیان کئے گئے ہیں کہ شراب دو آتشہ ہوجاتی ہے ۔ بعض ایسی غزلیں ہیں کہ ان کے مجازی و حقیقی دونوں معانی اخذ کیے جا سکتے ہیں ۔

پانچواں مضمون بنی اکرم (ص) سے ان کی والہانہ محبت ہے کہ غزل میں ان کے اوصاف بیان کرنا اپنے لیے وجہ سعادت سمجھتے ہیں ۔ خصوصاً مکہ و مدینہ میں حج کے موقع پر جو نعتیہ غزلیں لکھی ہیں وہ اپنے سوز کی وجہ سے مقبول و عزیز ہیں ۔ تصوف و عرفان کے مضامین ادا کرنے کے لیے شراب ، جام ، میکدہ ، ساقی و پیر مغاں جیسی اصطلاحات عام استعمال ہوتی تھیں ۔ لیکن جامی نے بعض جگہ ان کلمات کو لغوی اور

حقیقی معنوں میں استعمال کیا ہے ۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ جامی کے لب شراب ناب سے آلودہ تھے لیکن جس طرح انہوں نے ان کو استعمال کیا ہے ان کو ان کے اصلی معنوں میں ہی سمجھا جا سکتا ہے ۔ لیکن غزل کا یہ مزاج تھا کہ ان علامات ، عیش و مستی کو تجریدی معنی میں استعمال کرتے تھے ۔ چند اشعار دیکھیے جن میں اعلانیہ ناؤ نوش کیلئے دعوت عام دی ہے :

هلال عید جستن کار عام است　　هلال عید خاصان دور جام است
بیا ساقی که امشب توبهٔ ما　　زمی چون روزهٔ فردا حرام است
بر افروز آتش دیگر ز باده　　که دیگ ماه روزه نیم خام است

باغ و بہار سے لطف اٹھانے اور حظ شراب کا بیان :

طرف باغ و لب جوی و لب جامست اینجا　　ساقیا خیز که پرهیز حرام است اینجا
لب نهادی به لب جام و ندانم من مست　　که لب لعل تو یا باده کدام است اینجا

تا ازین ، لُجه رسد زورق امید به لب　　لب جوی و لب جام و لب یاری گیرند

تصوف کے نقطہ نظر سے خدا ، تخلیق کائنات ، تلاش حقیقت اور دیگر مطالب کا واضح بیان ان اشعار سے ہوتا ہے :

ای در هوای مهر تو ذرات کائنات　　واقف نه از کماهی ذات تو هیچ ذات
شد چشم عقل خیره چو در مبدأ ازل　　حسنت نمود جلوه در آیینهٔ صفات
هر خشتی از کنشت شود کعبهٔ دگر　　گر پرتو جمال تو افتد به سومنات
هر جا که تافت پرتو انوار عزتت　　عزی ندید غزا و قدری نیافت لات
در بحر کبریای تو آنکس که شد فنا　　چون خضر راه برد به سر چشمهٔ حیات
هر کس به کعبهٔ طلبت رونهد نخست　　از کل کاینات کند قطع التفات

فلسفهٔ اشراق میں آئینهٔ دل کی صفائی بنیادی رکن ہے . تا کہ وہ صفات جلالی و جمالی کا عکس دیکھ سکے ۔ جامی نے ذیل کی غزل میں اس مطلب کو عیاں کیا ہے :

آیینه باش و عکس رخش بین در آیینه　　مشنو خبر که نیست خبر چون معاینه
گفتم توان جمال تو دیدن به عشوهٔ گفت　　گر صاف دل چو آیینه باشی هر آیینه
ذرات کون آیینه جای جمال اوست　　نقشی دیگر نموده رخش در هر آینه
صوفی تو خرقه پوش و ما رند و جرعه نوش　　ما بیننا و بینك الا مباینه
جامی چو در تلاطم بحر قدم فتاد　　فارغ شو از تموّج احداث کاینه

عارف و عرفان تك پہنچنے کا حال :

عارف که سخن براه گوید　　الله و لا سواء گوید

اثبات وجود خلق با حق — در طور یقین گناه گوید
هر کس که شود مرید عشقت — اول که قال و جاه گوید
با خرقه و طیلسان بسازد — ترک گمره و کلاه گوید
بر بادِ تو زار زار گرید — و ز شوق تو آه آه گوید
کاری که نه غایتش تو باشی — آن را عقل تباه گوید

مضامین تصوف بتوسط علامات :

ساقی بیا که قصر بقا در تزلزل است — در ده شراب لعل چه جای تعلل است
در دور جام می به تسلسل کشد رواست — بر رغم آنکه منکر دور و تسلسل است
داری هوای میکده ترک سبب بگوی — زادِ طریق اهل ارادت توکل است
صوفی که ذوق عشق تو می آردش به رقص — مستت کز سرایت می در تمایل است
جامی کند تحمل هر رنج و غم ولی — در صحنهٔ فراق تو بس بی تحمل است

محبوب اور اس کے لوازم کی وساطت سے عشق خداوندی کی باتیں :

خوشا بادی که ره سوی تو گیرد — چو بر تو بگذرد بوی تو گیرد
چو باروی تو گل گردد معارض — بنفشه جانب روی تو گیرد
فتد صد رخنه ام در قبلهٔ جان — به هر چینی که بر موی تو گیرد
دلم سر حلقهٔ عشاق گردد — چو جا در حلقهٔ موی تو گیرد
کمانت را نیارد کس کشیدن — مگر قوت ز بازوی تو گیرد
امید از خان و مان برداشت جامی — که خانه بر سر کوی تو گیرد

جامی زاہد خشك نہیں.صوفی عارف ، استاد ، عالم ، با وقار ہوتے ہوئے بھی خشکی ، تنگ نظری اور درون خزینی نہیں رکھتے ۔ باغ و بہار سے لطف اندوز ہونا جانتے ہیں ان کا ذوق جمالیات باغ کی ایك ایك چیز شعریت ، محبوبیت اور رومانویت تلاش کر لیتا ہے ۔ جا بجا ان کی غزلوں میں اس قسم کے اشعار ملتے ہیں ۔ یہ ایك پوری غزل اس حسن و جمال کا نمونہ ہے :

بیا که شاهد بستان ز رخ نقاب انداخت — نسیم در سر زلف بنفشه تاب انداخت
صبا شمیم گل و بوی یار گلرخ داد — مرا و مرغ چمن را در اضطراب انداخت
پی نثار قدوم گل از شکوفه نسیم — به صحن باغ درمهای سیم ناب انداخت
ز شبنم سحری غنچه بامداد پگاه — گشاد پیرهن از هم بر آفتاب انداخت
توان بر ابر خروشنده طعنه زد به جنون — ز سنگ ژاله که هر شیشهٔ حباب انداخت
درون ساغر لاله چراست مشك آلود — اگر نه مشك پی طیب در شراب انداخت
چکیدنم ز هوا باز نظم تر جامی — به گوش شاهد گل لؤلوی خوشاب انداخت

نبی اکرم (ص) کے لیے جامی کی شیفتگی ان غزلوں سے عیاں ہے جن میں مدینہ جانے اور روضہ منورہ پر حاضر ہونے کی آرزو ظاہر ہوئی ہے ۔ نمونے کے لیے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

کی بود یارب که رو در یثرب و بطحا کنم گه به مکّه منزل و گه در مدینه جاکنم
یا رسول الله به سوی خود مرا راهی نمای تا ز فرق سر قدم سازم ز دیده پاکنم
خواهم از سودای پا پوست نهم سر در جهان یا به پایت سر نهم یا سر درین سودا کنم

جامی کی غزل میں تغزلی خصوصیات بھی موجود ہیں . خصوصاً چھوٹی بحروں میں بیان کی صراحت ہے . سادہ و سہل الفاظ ہیں ۔ بحر بھی خوش آیند ہے ۔ ہلکا ہلکا دھیما دھیما گداز بھی ہے ۔ شعریت بھی ہے اور تمثیلوں سے بیان کو بھی شگفتہ کیا گیا ہے ۔ ذیل کی غزل میں محبوب خدا ہے لیکن تخاطب میں قرب ظاہر ہے :

تعالی الله زهی شاه یگانه زهی حسن و جمال جاودانه
درین بتخانه هر نقشی که بینم تویی مقصود ، دیگر بهانه
نبیند چشم عارف عارض و خال نجوید مرغ قدسی آب و دانه
مجو اسرار عشق از شیخ خلوت چه داند نطق توتی مرغ خانه
میانت را چنان خواهم در آغوش که مویی هم نگنجد درمیانه
گذر کن بر سر جامی که دارد
سر خدمت به خاکِ آستانه

سماع

جامی نے قصیدہ ، غزل، قطعہ میں آواز ، موسیقی اور اس کی تاثیر کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ۔ اور سماع کی طرف بڑی رغبت رکھتے رہے ہیں ۔ عبدالغفور نے لکھا ہے ۔ کہ یوسف و زلیخا لکھتے وقت ان کے دل میں ایك عجب قسم کا جذبہ و شوریدگی پیدا ہوئی کہ وہ ایك مدت تك سماع کرتے رہے ۔ اور مفتی و سازندہ بے حال ہو رہے تھے ۔ اور وہ رقص سے رکتے نہیں تھے .

قناعت و استغنا

پی لقمه و خرقه هر لحظه یی نشاید کشیدن ز خلقی گزند
به روزی بود خشك نانی کفاف به عمری بود کهنه دلقی پسند
برای نعمت دنیا که خاك برسر آن منه ز منت هر سفله بار بر گردن
به یك دو روزه رود نعمتش ز دست بماندت ابد الدهر عار بر گردن

تصوف

جامی شیخ محی الدّین بن العربی کے پیرو تھے ۔ چنانچه انهوں نے ابن عربی کی کتاب فصوص الحکم کی شرح «نقد النصوص فی شرح فصوص» لکھی اور اسی طرح عراقی پیرو ابن عربی کی کتاب لمعات کی شرح اشعة اللمعات لکھی ۔ ان کتابوں سے جامی کے نظریۂ تصوف پر واضح روشنی پڑتی ہے ۔ وہ اعتقاد رکھتے تھے که کوئی شخص فلسفه و کلام سے حقیقت تك نہیں پہنچ سکتا ۔ تصوّف کی بنیاد کشف و شهود پر ہے ۔ فلسفه و حکمت کی پیروی کی بجائے شرع پیغمبر اور قرآنی تعلیم سے رہبری حاصل کرنی چائیے ۔ انهوں نے جا بجا اپنے کلام میں ان مضامین کی طرف اشارات کیے ہیں ۔ مثلاً :

نیست جز بوی نبی سوی خدا رهبر ترا   از علی جو بو که بوی بو علی مستقدر است
صاحب علم لدنی را چه حاجت خط و لفظ   صفحهٔ دل مصحف است آن را که قرآن از برست

علم به عالم اطلاق زن ز بادهٔ لعل   مشو چو فلسفیان قید علت و معلول
فقیه و زاهد و عابد نه مرد این کاراند   به بند برخ اینان در خروج و دخول

جبر و اختیار

جامی اس بات کے قائل ہیں که ازل سے جو کسی کی قسمت میں ہے وہ اس کو ضرور ملے گا ۔ اسے کوئی تبدیل نہیں کرسکتا ۔ اسلئے اسے ہنسی خوشی سے قبول کرنا چاہیے . انهوں نے اکثر اپنے کلام میں اس قسم کے عقاید کا اظہار کیا ہے ۔ مثلاً :

جامی مکن اندیشه که تغییر نیابد   در حکم ازل هر چه مقدر شده باشد
جامی به عیش کوش که کس را ز جام دور   کم ز آن چه قسمت است نیاید، ز باده هم

جامی نقشبندیه سلسله تصوف سے وابسته تھے ۔ اور اس طرز و روش طریقت پر گہرا اعتقاد رکھتے تھے ۔ آخر عمر میں لوگوں نے انہیں بھی مرشد و قطب بنایا ۔ لیکن وہ تلقین و ارشاد کرنے پر رضامند نہیں تھے ۔ وہ کہا کرتے تھے لوگ طالبان خدا نہیں بلکه طالبان خود ہیں وہ خود نمائی سے پرہیز کرتے تھے اپنے عجز و انکسار کی وجه سے کوئی مرتبه و مقام حاصل نہیں کرنا چاہتے تھے ۔ انهوں نے واعظوں ، شیخوں اور خود نما صوفیوں کے خلاف اعتراض کیا ہے ۔

حذر از صوفیان شهر و دیار   همه نا مردند و مردم خوار
واعظ خر است و انجمن وعظ خر گله   گر خر رود به خر گله نتوان ز خر گله
شیخان نارسیده چه دانند قدر عشق   کم جوی طعم پختگی ز میوه های خام

عشق

مذهب عشق خود پسندی نیست   جز فقیری و دردمندی نیست

عشق جادوست نیک شیوهٔ او چشم بخشی و چشم بندی نیست

مثنوی سرائی

جامی نے سات مثنویاں لکھیں اور مثنوی ہفت اورنگ کے نام سے شایع ہوئی ہیں ۔ ایک طالب علم کیلے مختصر تدریسی دور میں تمام مثنویوں کا تجزیاتی مطالعہ ممکن نہیں ۔ اسلئے ان کے مطالب و موضوعات سے آگاھی کیلئے مثنویوں کے عناوین درج کر دیے ہیں. اور عشقیہ مثنویوں کی کہانیوں کا خلاصہ بھی لکھ دیا ہے تا کہ مضمون ذہن نشین رہے ۔ سلسلة الذهب ، تحفة الاحرار ، سبحة الابرار اور خرد نامه سکندری تصوف ، اخلاق ، پند و نصایح اور احکام دینی جیسے مضامین پر مشتمل ہیں ۔ سلامان و ابسال ، لیلی و مجنون اور یوسف و زلیخا ، عشقیہ یا رومانوی کہانیاں ہیں ۔

۱- سلسلة الذهب

اس کے مطالب کی تفصیل اسی طرح ہے :

۱- **دفتر اول** : حمد و ثنا ، تقدیس و تنزیهه حق تعالی ، حقیقت وجود مطلق ، مناجات ، نعت سید المرسلین ، مدح سلطان حسین ، عدل و انصاف و رعایا پروری کی تاکید ، ذکر کلمه طیبه ، فقیه ان کی مذمت جو ذکر فقی و جلی کو وسیلهٔ لذات جسمانی و شهوانی بناتے ہیں ۔ تحقیق معنی اختیار و جبر الوقت سیف قاطع ، شعر و سخنوری ، سبب آفرینش آدم ، تفسیر آیات قرآنی و احادیث نبوی و اقول عرفا و علماء ۔ تصوف ، مذمت صوفی نما ، مقامات صوفی ، ارکان ولایت ابدال . عزلت ، دوام عصمت ، جوع ، سهر و بیخوابی ، کثرت و وحدت ، اعتقاد نامه دهخدا ، رسول ، ملائکه ، انبیاء و رسل ، عذاب قبر و منکر و نکیر ، میزان ، صراط .

۲- **دفتر دوم** : مطالب کی تفصیل یہ ہے .محبت ذاتی و صفاتی، عارف و اہل فکر ، قربات اربعه یعنی مراتب ولایات ، قرب نوافل ، قرب فرایض ، مقام حج اکبر (مرتبه قاب قوسین) مقام جمع احدیث (مرتبه اوادنی که خاصهٔ پیغمبر است ۔قصه عینه و ریا ، قصه تحفه مغنیه ، موت و احوال آن .

۳- **دفتر سوم** : مضامین کی تفصیل اس طرح ہے ۔

یہ مختصر مثنوی ہے اور اسے معدلت نامه کہا گیا ہے ۔ یہ بادشاہوں ملکی رہنمائی کیلئے مخصوص ہے . تا کہ وہ سر انجام امور مملکت میں ان سے کام لیں ۔ بادشاہ کی شخصیت اور حیثیت ، عادل، ظلم و عدل ، سیاست(سرکار تو الم ہے و یاس رہ جاتا ہے) شهوت و عفت ، جود و کرم ، بخل ، ارکان دربار ، عالم ، وزیر ، طبیب ، شاعر ۔

۲- تحفة الاحرار

مضامین کی تفصیل اس طرح ہے :

تسمیہ و تحمید ، مناجات اوّل ، دوم ، سوم و چہارم ،نعت اول ، دوم ، سوم ، چہارم و پنجم منقبت خواجہ بہاء الدّین محمّد بخاری نقشبند، داد خواہی از خواجہ عبیداللہ احرار ، فضیلت سخن و کلام موزون ، تنبیہ سخنوران ، حقیقت دل ، صحبت اول با پیر روشن ضمیر ، صحبت دوم با پیر صاحب تسکین ، صحبت سوم با پیر حقیقت بین ، ان تمہیدی مباحث کے بعد مثنوی بیس مقامات پر محیط ہوجاتی ہے ۔۱- آفرینش ۔ ۲- آفرینش آدم ، ۳- سعادت دین اسلام ۔ ۴- نماز ۔ ۵- رمضان ، ۶- زکوۃ ، ۷- زیارت بیت الحرام ، ۸- عزلت ، ۹- سکوت ، ۱۰- سپہر دوار و گردش لیل و نہار، ۱۱-اوصاف صوفیہ . ۱۲- علما و دانشمند ، ۱۳- بادشاہ مملکت داری اور رعایا پروری ۔ ۱۴- وزیر و دبیر ، ۱۵- پیری اور اسکا انجام . ۱۶- جوانی اور اسکا انجام ۔ ۱۷- حسن اور اسکا انجام . ۱۸- عشق و عاشقی ، ۱۹- شعرای نادان ۔ ۲۰- پند بہ پسر خود ضیاء الدّین یوسف.

۳- سجة الابرار

تمہیدی عنوانات یہ ہیں . تسمیہ و تحمید ، مناجات ، درود و نعت حضور ، مدح بادشاہ زمان ، سبب نظم کتاب ، اس کے بعد مثنوی کو چالیس عقد پر تقسیم کیا ہے ۔ جس کی تفصیل اس طرح ہے .

۱- کشف حقیقت دل ۔ ۲- شرح سخن و سخنوری ۔ ۳- گفتار موزوں ۔۴- وجود و اثر آن ۔
۵- یکتائی خوار ، ۶- ذات حق ، ۷-تصوّف و اغراض آن ۔ ۸- ارادہ و خواہش ۔
۹- توبہ ، ۱۰- پرہیزگاری ، ۱۱- زھد ، ۱۲- فقر ۔ ۱۳- صبر ، ۱۴- شکر ۔
۱۵- خوف ۔ ۱۶- امید ، ۱۷- توکل ، ۱۸-رضا ، ۱۹- محبت ، ۲۰- شوق ،
۲۱- غیرت و رشك ، ۲۲- قرب حق ، ۲۳- شرم وحیا ۔ ۲۴- حریت ، ۲۵- جوانمردی .
۲۶- صدق ۔ ۲۷- اخلاص ۔ ۲۸- بخشش ، ۲۹- قناعت . ۳۰- تواضع ،
۳۱- بردباری ، ۳۲- مزاج و انبساط ، ۳۳- دوستی ، ۳۴- سماع ، ۳۵- دعا و ثنا ،
۳۶- خیر اندیشی حکام دولت ، ۳۷- رہنمائی ، سپاسگزاری فرمانروایان ۔ ۳۸- پند بہ فرزند ضیاء الدّین یوسف . ۳۹- نصیحت بخود ۔ ۴۰- التماس دعا از خوانندگان ۔

۴- خردنامۂ اسکندری

ابتدائیہ عنوانات میں حمد و ثنا ، مناجات ، نعت رسول ، منقبت خواجہ عبیداللہ احرار ، مدح بادشاہ وقت سلطان حسین ، پند بہ دلبند ، نصیحت بہ نفس مفلس ، فضایل سخن و سخنوری،فیلفوس کے بعد سکندر تخت نشین ہوا ۔ تواضع سکندر ، خردنامہ ارسطو ،

افلاطون ، سقراط ، بقراط ، فیثاغرس ، اسقلینوس ، ہرمس ، فتوحات اسکندر ، تعمیر شہر اور اختراعات ، خردنامۂ اسکندر ، خاقان چین نے اسکندر کو حقیر تحفه بھیجا اور اس کی حکمت خردنامه مادر به اسکندر ، اسکندر نے ارسطو سے وصیت کی درخواست کی ۔ ہندوستان میں اسکندر کی آمد اور وہاں کے حکما سے ملاقات ۔ اسکندر ایسے شہر میں پہنچا جہاں که سب لوگ پاکیزہ کردار تھے ۔ بحری سفر کے بعد کوہ قاف میں آمد اور اس کے فرشتہ سے نصیحت کی فرمایش ، سکندر کی وصیت کی که مرنے کے بعد اس کے ہاتھ تابوت سے باہر رکھے جائیں ۔ نه به حکیم اول تا دهم ۔ تعزیت حکیم اولؔ تا پنجم ، مادر اسکندر نے حکما سے معذرت کی ۔ بیوفائی جهان و عمر گذران و ختم کتاب .

مندرجه بالا عنوانات کی تفصیل سے ظاہر ہے که ان چاروں مثنویوں کے موضوعات عموماً تصوف ، اخلاق ، احکام شرع اسلامی بادشاہ اور ملکداری اور پند و نصایح پر مشتمل ہیں . یه مثنویاں ایك عالم ، صوفی اور شاعر کی تخلیق ہیں ۔ یعنی جامی نے ان مباحث و موضوعات پر اپنے علم و فضل کا بھرپور اظہارکیا ہے ۔ منظوم ہونے کی وجه سے یه مثنویاں تأثر و تاثیر کی حامل ہیں ۔ جامی کا بیان واضح و صریح ہے . تخیل میں الجھاؤ نہیں ۔ بیان میں پیچیدگی اور ابہام نہیں ۔ یه سب کچھ خلوص دل سے لکھا ہے . زبان مشکل اور دقیق نہیں ۔ نه فنی اصطلاحات کی بھرمار ہے جس سے مطلب سمجھنے میں پریشانی ہو ۔

یه مثنویاں سالکان طریقت کیلئے مرشد و رہنما ۔ بادشاہوں اور اراکین سلطنت کیلئے رہنما اصول ، نوجوانوں کیلئے اخلاق و معارف کا خزینه ، ایك مسلمان کیلئے جسمانی و روحانی تربیت کا گنجینه ہیں ۔

جامی نے تحفة الاحرار لکھتے وقت مخزن الاسرار نظامی اور مطلع الانوار خسرو کو سامنے رکھا ہے . تحفة الاحرار کی تمہید میں انہوں نے دونوں مثنویوں کی خوبیوں کی داد دی ہے اور انکی عظمت کا اعتراف کیا ہے . اور اپنے ہنر کی خامی کا بھی ذکر کیا ہے . تینوں مثنویوں کے تقابلی مطالعه کیلئے وقت اور دقت نظر کی ضرورت ہوتی ہے اورکسی نتیجے پر پہنچنا بڑا دشوار ہوتا ہے ۔ جامی کے اپنے زمانے میں خسرو اور جامی کے جواب خمسۂ نظامی پر متضاد آراء کا اظہار ہوتا رہا ہے ۔ ابھی تك ناقدین نقش اولؔ کو ہی شاهکار مانتے آئے ہیں ۔ جامی نے مخزن الاسرار کا نمونه سامنے رکھا ہے لیکن مقالات کے عنوانات یکساں نہیں ۔ نظامی نے ایك مناجات لکھی ہے . تو جامی نے چار ۔ نظامی نے ۴ نعتیں لکھی ہیں تو جامی نے پانچ جامی نے نظامی کی طرح بزرگواری آدمی ، حقیقت آدمی و تفصیل او شناخت مرتبۂ خویش جیسے اهم موضوعات پر گفتگو نہیں کی ۔

جامی کا خرد نامۂ اسکندری بھی سکندر نامۂ نظامی سے مختلف ہے ۔ جامی نے کہیں کہیں سکندر نامہ کی کہانی کا تتبع کیا ہے ۔ اور جس طرح نظامی نے سکندر نامہ کو رزمیہ مثنوی بنانے کی کوشش کی ہے اور اکثر جنگوں کے مناظر بھی پیش کیے ہیں ۔ جامی کی مثنوی میں ایسی کوشش نہیں کی گئی ۔ اس کا اصل مقصد خردنامہ یا اخلاق نامہ لکھنا تھا ۔

سلسلة الذهب اور سجة الابرار گویا تحفة الاحرار کا تتمہ ہیں ۔ ان مثنویوں میں مندرجہ ذیل مماثل عقاید و افکار کچھ تو وہی ہیں جن کو جامی نے اپنے قصاید و غزلیات میں بیان کیا ہے ، وہ ہم درج کر آئے ہیں ۔ تصوف ، اخلاق اور ملکداری پر جامی کے عقاید و آراء سے متعلق الگ الگ کتاب لکھی جاسکتی ہے ۔ یہ عقاید ایسے ہیں جو جامی کے زمانے میں ایك صوفی و عالم و درویش کے ہو سکتے ہیں ۔

عشقیہ /رومانوی مثنویاں

۱- سلامان و ابسال

یہ مثنوی بحر رمل مسدس محذوف میں ہے ۔ اور امیر یعقوب ترکمان آق قوینلو کے نام منسوب ہے ۔ سال تألیف ۸۸۵ ھ ہے ۔ اس کی کہانی کا خلاصہ یہ ہے ۔

سلامان بادشاہ روم ارمانوس کا بیٹا تھا ۔ ابسال اٹھارہ سالہ دایہ تھی جو سلامان کو دودھ پلاتی تھی ۔ سلامان بلوغ کو پہنچا تو دایہ پر فریفتہ ہوگیا ۔ باپ نے لاکھ نصیحت کی مگر وہ اپنے عشق سے باز نہ آیا ۔ آخر وہ دونوں بھاگ گئے اور ایك جزیرے میں پہنچے ۔ بادشاہ نے آئینۂ جہاں نما سے ان کا حال معلوم کیا۔ سلامان کو لانے کیلئے گئے اور اس پر ملامت کی ۔ سلامان ، ابسال کو ساتھ لے کر صحرا کی طرف نکل گیا اور دونوں نے آگ میں کود کر اپنے آپ کو ہلاك کرنا چاہا ۔ ابسال جل گئی لیکن سلامان بچ گیا ۔ آخر حکیم کی نصیحتوں سے سلامان کا غم دور ہوا. بادشاہ نے تاج و تخت اس کو سونپ دیا ۔ اصل میں یہ یونانی داستان ہے ۔ حنین بن اسحاق نے عربی میں اس کا ترجمہ کیا۔ خواجہ نصیر طوسی نے شرح اشارات میں اس کہانی کو بیان کیا ہے ۔ اصل کہانی یہ ہے کہ حکیم فیلفوس نے سلامان کا علاج کیا۔ اسے زہرہ ستارہ کے عشق میں مبتلا کیا ۔ سلامان آہستہ آہستہ اپنا غم بھول گیا ۔

مثنوی کی ابتدا میں حمد و ثنا ، نعت رسول ، مدح شاہ ، ضعف و پیری اور منفعت گیری پر اظہار خیال کرکے کہانی شروع کردی ہے ۔ آخر میں کہانی کا مقصد بتایا ہے ۔ سلامان پاك دامنی کی علامت ہے ۔ ابسال شہوت پرستی کی علامت ۔ دریا / جزیرہ دریائے شہوتہائے حیوانی ، سلامان کی واپسی گویا عقل کی طرف واپسی ہے جس

کو حاصل کرکے آدمی مملکت انسانی کا بادشاہ بن جاتا ہے ۔

توصیف شعر – جامی نے سخن اور سخنوری کے متعلق جا بجا اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اس سے شعر و شاعر کی وقعت و اهمیت کا اندازہ ہوتا ہے مثلاً :

شعر هر چه بود نوای مرغ خرد شعر چه بود مثال ملك ابد
مستمع را ز فتحیاب فتوح می دهد کام جان و راحت روح
گر بود لفظ و معنیش باهم این دقیق و لطیف آن محکم
صیتِ او راهِ آسمان گیرد نام شاعر همه جهان گیرد
ور بود از طبیعت تاریك معنی او کثیف و لفظ رکیك
نرود از بروت او بالا پیش ریشش بماند آن کای
شعر باید چو چشمه سار زلال از عقود لآلا مالا مال
لفظ او تیره معنیش تاریك ره به معنی ز لفظ او باریك

جامی شعر کی الهامی حیثیت کے قایل ہیں ، اس لیے اس کو پر جبریل اور دم اسرافیل کہتے ہیں ۔ اقبال بھی جامی کے ہم نوا ہیں ، شاید اسی لیے انہوں نے اپنے کلام کا نام بال جبریل رکھا اور ایك مشہور شاعر نے مجموعۂ کلام کو « صور اسرافیل » کا نام دیا ۔ جامی شعر کی ایك اور بنیادی خصوصیت کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ شعر روح کے اندر سے پیدا ہوتا ہے ۔ یعنی شعر میں سوز و اخلاص ہونا چاہیے تیسری خصوصیت یہ بتائی ہے کہ شعر تغیّر احوال بھی کرتا ہے اور زندگی کو بناتا سنوارتا ہے ۔ جامی کے اپنے الفاظ یہ ہیں :

سخن آواز پر جبریلست روح بخش از دم اسرافیلست
به سخن زنده شود نام همه به سخن پخته شود خام همه
طبع ما خرم از اندیشۂ اوست خرم آنکس که سخن پیشۂ اوست
سخن از چشمۂ جان گیرد آب زر رخشان ز شرر یابد تاب

۲– یوسف و زلیخا

اصل قصّه کی ابتدا میں حمد و ثنا ، مناجات ، دلایل هستی واجب تعالی، نعت ، معراج ، مدح سلطان حسین ، حسن و عشق ، فضیلت ، عشق و سبب نظم کتاب پر اظہار خیال کیا ہے ۔ اس کے بعد داستان شروع ہوتی ہے ۔ جس کا خلاصه یوں ہے ۔

ولادت یوسف ، صفت و نسب زلیخا ۔ زلیخا نے یوسف کو خواب میں دیکھا اور فریفته ہوگئی ۔ دو مرتبه اور خواب میں دیکھا ۔ انہوں نے اپنا نام اور مقام بھی بتا دیا ۔ آخر زلیخا نے ہوش سنبھالا ۔ اور عزیز مصر سے شادی کرلی ۔ لیکن وہ اس کے خوابوں کا

شاہزادہ نہیں تھا ۔ زلیخا فراق یوسف میں غمناك رہنے لگی ۔
یوسف کے بھائیوں نے حسد کرکے یوسف کو کنعان سے باہر نکالا ، باپ سے اجازت لے کر نکلا ۔ راستے میں یوسف کو کنوئیں میں پھینك دیا ۔ قافلہ یوسف کو کنوئیں سے نکال کر مصر لے گیا ۔ زلیخا نے اسے دیکھ کر پہچان لیا اور بھاری قیمت دے کر خریدلیا۔ زلیخا نے خدمتگاری کیلئے ان کی تربیت کی یوسف نے گڈریا بننے کی خواہش کی ۔ زلیخا نے یوسف کے تمنائے وصال کی ۔ محل بنایا ۔ اس میں شہوت انگیز تصاویر لگائیں ۔ دروازے بند کیے لیکن یوسف بھاگ گئے ۔ مصری خواتین نے زلیخا کو طعنہ دیا اور خود غیرت سے اپنے ہاتھ اور زبان کاٹ لیں ۔ یوسف کو زلیخا کی اطاعت پر مجبور کیا ۔ یوسف پر الزام لگا اور قید خانے بجھوا دیئے گئے ۔ یوسف نے قیدیوں کے خوابوں کی تعبیریں بتائیں اور کہا ۔ رہائی کے بعد بادشاہ کے پاس اس کا ذکر کریں ۔ بادشاہ نے خواب دیکھا کر سات موٹی گائیں سات دبلی گائیوں کو کھا گئی ۔ بادشاہ نے یوسف کو تعبیر بتانے کیلئے جیل سے بلوایا لیکن وہ نہ آئے جب تك کہ جیل بھجوانے کا سبب اور اس کی بریّت ثابت نہ ہو ۔ زلیخا کا جرم ثابت ہوا ۔ یوسف نے تعبیر بتائی اور وزیر بنائے گئے ۔ عزیز کی وفات پر زلیخا نے یوسف کے ہاتھ احیائے محبت کی ۔ سر راہ کٹیا ڈالی تا کہ یوسف کو دیکھ سکے ۔ یوسف نے توجہ کی ۔ وہ خدا پرایمان لے آئی ۔ یوسف کی دعا سے اس نے جوانی و بینائی حاصل کی ۔ شادی ہوئی ۔ یوسف نے ماں باپ کو خواب میں دیکھا اور موت کی آرزو کی ۔ یوسف فوت ہوئے اور زلیخا بھی جدائی میں وفات پا گئی ۔
داستان کے آخر میں شکایت فلك ۔ پند بہ فرزند اور تخاطب بہ نفس پر اظہار خیال کیا ہے ۔

۳- لیلی و مجنون

داستان شروع کرنے سے پہلے مناجات ،تخلیق کائنات و توحید، نعت رسول ، معراج ، معنی عشق ، سبب نظم کتاب ۔ علم و عادل ، عشق و عقل پر اظہار خیال کیا ہے ۔ داستان کا خلاصہ یوں ہے ۔ لیلی کی شہرت سن کر مجنوں فریفتہ ہوا اور اس کے قبیلے میں پہنچا لیکن ہجوم کی وجہ سے گفتگو نہ ہوسکی ۔ دوسری مرتبہ حی کے مقام پر پہنچا لیلی کے دیدار کیلئے انتظار کرتا وہ جذبہ محبت سے سرشار ہو کر بے ہوش ہوجاتا ۔ جب اسے ہوش آتا تو اونٹنی واپس موڑ دیتا ۔ لیلی نے مجنوں کو تمام آزمایشوں میں مستحکم پایا ۔ دوستی کو پکا کیا ۔ مجنوں کی حالت متغیر تھی ۔ مجنوں کے اہل قبیلہ عامریوں نے مجنوں کے باپ کو عشق لیلی سے باخبر کیا اور قبیلہ کی کسی حسینہ سے شادی کرنے کا مشورہ دیا ۔ لیلی سے کہا گیا کہ مجنوں نے قبیلے کی لڑکی سے شادی

کر لی ہے ۔ مجنوں لیلی کے ہاس گیا ۔ لیلی کے اہل قبیلہ نے لیلی کو مجنوں سے ملاقات کرنے پر روکا ۔ مجنوں نے باپ سے درخواست کی کہ وہ لیلی کے باپ سے سگائی کا پیغام لے جائے ۔ لیلی کے باپ نے رشتہ سے انکار کر دیا ۔ مجنوں کو لیلی کے حج پر جانے کی خبر ملی تو مجنوں اس کے قافلے کے ہمراہ روانہ ہوا ۔ کعبہ میں مناسك حج ادا کرنے کے موقع پر لیلی سے محبت کی باتیں کیں ۔ قبیلہ نقسف کا ایك جوان لیلی پر عاشق ہوا تو اس سے لیلی کی شادی کر دی گئی ۔ مجنوں یہ خبر سن کر پریشان ہوا ۔ وہ انسانوں سے دور ہو کر حیوانوں کے قریب چلا گیا ۔ لیلی نے مجنوں کو خط لکھا کہ ماں باپ کے جبر کی وجہ سے نکاح ہوا ۔ مجنوں نے جواب لکھا ۔ اتفاق سے لیلی کا شوہر بیمار ہوکر مرگیا. مجنوں دیار لیلی کے قریب گیا اور وہاں کے کتے سے ملاقات و گفتگو کی ۔ فقیر بن کر لیلی کے پاس پہنچا ۔ لیلی نے پیالہ توڑ دیا ۔ مجنوں رقص کرنے لگا۔ وہ ملاقات کے بعد راستے میں اس کا منتظر رہا ۔ یہاں تك کہ پرندوں نے اس کے سر پر گھونسلہ بنا لیا ۔ اعرابی اس کے پاس گیا دیکھا تو مجنوں ہرن کو آغوش میں لیے ہوئے جان بحق ہو چکا تھا ۔ اعرابی مجنوں کی خبر مرگ لے کر لیلی کے پاس گیا ۔ لیلی بیمار ہوگئی ۔ اس نے وصیت کی کہ اسے مجنوں کے پہلو میں دفن کیا جائے ۔ کہانی کے بعد جامی نے بیوفائی « جہان» ناپائیداری حیات کے بارے میں بیٹے کو نصیحت کی ۔

داستانوں کا تنقیدی جائزہ لینے کے لیے مندرجہ ذیل امور کو زیر نظر رکھا جاتا ہے ۔

۱- کیا کہانی کا تسلسل درست ہے ۔ اس میں جھول تو نہیں ۔ اگر پلاٹ ہے تو اس کی سب کڑیاں اپنی جگہ ٹھیك ہیں ۔ کوئی کڑی گم تو نہیں ۔

۲- کیا کردار قصّہ مشخص ہیں ۔ یعنی ان کی شخصیتں واضح ہیں ۔ کیا وہ اپنی لیاقت اور اپنی عمر اور تجربے کے لحاظ سے گفتگو کرتے ہیں ۔ کیا ایسا تو نہیں ایك بچہ پیر دانا کی طرح بول رہا ہے ۔

۳- کیا جذبات کی صحیح عکاسی کی گئی ہے ۔ وہ نفسیات کے عین مطابق ہے ۔

۴- کیا واقعات نگاری میں واقعیت ہے یا محض تخیل کی کارفرمائی ہے ۔

۵- پس منظر کے طورپر جہاں منظر کشی کی گئی ہے کیا وہ حسب حال ہے ۔ اس میں شاعر کے مشاہدے کی کیا نوعیت ہے ۔

ان امور کے پیش نظر جامی کی رومانوی مثنویوں میں سے ایك ایك کو زیر بحث لانا مجوزہ کتاب کے احاطے سے باہر ہے ۔ مجموعی طور پر ان کی خوبیوں کا تذکرہ کریں گے ۔ سلامان و ابسال یونان کی اور لیلی و مجنوں عرب کی کہانی ہے ۔ یقین نہیں کہ دونوں واقعاتی کہانیاں ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کہانیوں کے ساتھ جامی

کا قلبی لگاؤ نہیں ۔ لیلی و مجنون کے ساتھ نظامی کا بھی قلبی شغف نہیں تھا . شیریں و خسرو کے ساتھ اس کا جذباتی لگاؤ تھا ۔ اس لئے عشقیہ مثنویوں میں یہ اس کا شاہکار شمار ہوتی ہے ۔ اس لیے جامی کی مثنویوں میں سے یوسف و زلیخا اس کی دلپسند مثنوی ہے ۔ چونکہ قرآن نے اسے خود «احسن القصص» کہا ہے اسلئے اس کے ساتھ جامی کا جذباتی اور قلبی لگاؤ ہے ۔ اور یہ اس کا شاہکار ہے ۔ جامی کی کہانیوں میں تسلسل تو ہے لیکن کہیں کہیں حکایات و تمثیلات لانے سے کہانی کے بہاؤ میں رکاوٹ آتی ہے . سب کہانیوں میں دو دو کردار نمایاں ہیں ۔ یہ بھی پہلے سے متعین ہیں ۔ شاعر کو پہلے سے قصے کی جزئیات معلوم ہیں اور کردار کی شخصتیں بھی پہلے سے واضح ہیں ، شاعر کا کمال یہ ہے کہ ان کو کس نہج سے اور کن الفاظ میں پیش کرتا ہے ۔ جامی نے اپنی طرف سے کرداروں کو مشخص کرنے میں اپنی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے ۔ شاعر کا اصل کمال جذبات و کیفیات کی ترجمانی ہوتی ہے ۔ جامی اس شعبے میں کامیاب نظر آتے ہیں ۔ یوسف و زلیخا سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں ۔ جن سے ہمارے بیان کی تصدیق ہوتی ہے .

جمال یوسف کو دیکھ کر زنان مصر کی کیفیت :

گروهی زان زنان کف بریدند ز عقل و صبر و هوش و دل رمیدند
ز تیغ عشق یوسف جان نبردند ازان مجلس نرفته جان سپردند
گروهی از خرد بیگانه گشتند ز عشق آن پری دیوانه گشتند
برهنه پای و سر بیرون دویدند دگر روی خردمندان ندیدند
گروهی آمدند آخر بخود باز ولی با سوز و درد و عشق دمساز
زلیخا وار مست از جام یوسف فتاده مرغ دل در دام یوسف

زلیخا و یوسف میں خلوت ۔ زلیخا کا اظہار عشق و طلب وصال :

در و جز عاشق و معشوق کس نی گزند شحنه و آسیب عسس نی
رخ معشوق در پیرایهٔ ناز دل عاشق سرود عشق پرداز
هوس را عرصهٔ میدان کشاده طمع را آتش اندر جان فتاده
زلیخا دیده و دل مست جانان نهاده دست خود در دست جانان
به شیرین نکته های دلپذیرش خرامان برد تا پای سریرش
به بالای سریر افگنده خود را به آب دیده گفت آن سر و قد را
که ای گلرخ بروی من نظر کن به چشم لطف سوی من نظر کن
مرا تا کی درین محنت پسندی که چشم رحمت از رویم ببندی

به آه و ناله و زاری درآمد ز چشم و دل به خونباری درآمد
که ای خود کام ، کامِ من روا کن به وصل خویش دردم را دوا کن
منم تشنه تو آب زندگانی منم کشته تو جان جاودانی
زمانی مرهم داغ دلم شو به بوی رونق باغ دلم شو

نثری ادب

اخلاق الاشراف

مؤلف کا نام عبید اللّه ، لقب نظام الدّین اور تخلص عبید ہے ۔ زاکانی ایك قبیلۂ عرب زائیکان سے نسبت ہے ۔ جو بنی خفاجه کی ایك شاخ تھی ۔ اس قبیلے کے بعض افراد قزوین میں آباد ہوگئے ۔ عبید کی زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات ہم تك پہنچی ہیں ۔ حمد اللّه مستوفی مؤلف تاریخ گزیده نے عبید کو ارباب صدور میں لکھا ہے ۔ اور بتایا ہے۔ که «ازیشان صاحب معظم نظام الدّین عبیداللّه زاکانی اشعار خوب دارد و رسائل بی نظیر۔» تاریخ گزیده ۷۳۰ ھ میں مرتب ہوئی . اس سے ظاہر ہے که اس سال تك عبید کی شاعری اور رسائل کی شہرت ہوچکی تھی ۔ لیکن اس کی صدور ہونے کی کوئی اطلاع ہم تك نہیں پہنچی ۔ انہوں نے اپنی ایك عربی کتاب « نوادر الامثال» خواجه علاؤالدّین محمّد کے نام سے منسوب ہے ۔ جو ۷۲۷ ھ میں سلطان ابو سعید کے حکم سے وزیر بنائے گئے ہیں ۔ اور چھ ماہ منصبِ وزارت پر رہے ۔ خیال ھے که اسی عرصه میں یه کتاب ان کے نام سے منسوب کی گئی ۔

عبید زاکانی ۷۴۶ ھ سے شیراز میں موجود تھے . کیونکه انہوں نے شاہ ابو اسحاق اینجو (۷۴۲ -۷۵۸ ھ) کے ایك وزیر رکن الدّین عمید الملك کی مدح میں لکھا تھا .

کنون دوازده سالست تا ز ملكِ عراق کشیده اختر سعدم بدرگاهِ تو زمام

یه وزیر ۷۴۶ ھ میں متعین ہوئے تھے. حافظ کے ھمعصر ہونے کی وجه سے آپ نے بھی شاہ ابو اسحاق کی مدح لکھی ہے ۔ اپنی نظم « عشاق نامه » بھی اسی بادشاہ کے نام منسوب کی ہے ۔ جب شاہ شجاع نے ۷۶۱ ھ میں اصفہان فتح کیا تو عبید نے موقع کی مناسبت سے قصیده لکھا ۔ اس سے ظاہر ہے که وہ اصفہان بھی گئے ۔ عبید ۷۷۱ ھ یا ۷۷۲ ھ میں وفات پا گئے ۔

تألیفات

کلیاتِ عبید زاکانی ، عباس اقبال مرحوم کی تصحیح و اہتمام سے ایران میں شائع ہوچکی ہے ۔

نظم

۱- سنجیدہ کلام ، جس میں تمام اصناف سخن موجود ہیں ۔
۲- اشعار ہزلیہ اور تغمینات ۔
۳- مثنوی عشاق نامہ ۔
۴- قصیدہ موش و گربہ ۔
۵- فالنامہ وحوش و طیور ۔

نثر

۱- ریش نامہ : ریش کی مذمت میں ایك مختصر رسالہ ہے ۔
۲- صد پند میں لطائف اور طنز آمیز حکیمانہ سو نعمتیں ۔
۳- رسالہ تعریفات : ہزل آمیز طنزیہ رسالہ ہے ۔
۴- رسالۂ دلگشا : چھوٹی چھوٹی حکایات و واقعات و لطائف ہیں ۔
۵- دو نامہ قلندران : قلندروں کے دو خط ہیں ۔ اپنی زبان و محاورہ میں مقصود ان کے طرز انشاء کی تنقید و تمسخر ہے ۔
۶- فالنامہ بروج : بروج کے ذریعے فال نکالنا اور قسمت کا ستارہ متعین کرنے کے متعلق لکھا گیا ہے ۔ فال کے آخر میں ایك رباعی ہے ۔
۷- مقامات :مقاماتِ حمیدی کی طرح یہ مقامات فارسی میں ہیں نسخہ نہیں مل سکا ۔
۸- اخلاق الاشراف : مصنف نے اس رسالے میں علمائے اخلاق اور بزرگان ملت کے اعمال کی رو سے حکمت ، عفت ، شجاعت ، عدالت وغیرہ کی خصوصیات بیان کی ہیں . اور ان کو مذہب منسوخ کا نام دیا ہے ۔ اس کے مندرجہ ذیل ابواب ہیں :

بابِ اول در حکمت . باب دوم در شجاعت ۔ باب سوّم در عفت ، باب چہارم در عدالت ، باب پنجم در سخاوت . باب ششم در حلم و وفا .باب هفتم درحیاء و وفا و صدق و رحمت و شفقت .

ان کے علاوہ مندرجہ بالا نثری تألیفات « مجموعہ لطائف » کے نام سے فالنامہ بروج چھپ چکی ہے ۔ اپنے معاصرین سلمان ساوجی اور حافظ شیرازی کے مقابل میں شاعر ہونے کی حیثیت سے عبید کو شہرت نہ مل سکی. ان کا دیوان بھی مختصر ہے ۔ لیکن

علم و فضل کے ساتھ ساتھ بڑے زیرک طباع تھے . انہوں نے اپنی عصری اخلاقی اقدار پر مطایبات کے رنگ میں بڑی با مزہ طنز و تنقید کی ہے ۔ جو فارسی ادب میں اپنی مثال آپ ہے. ہجو و ہزل و مطایبہ کا رواج پہلے سے تھا ۔ لیکن عبید نے ایك انوکھے انداز میں ہجو و ہزل کہا ہے. سلطان ابو سعید (۷۱۶- ۷۳۶ ھ) مغلوں کے آخری بادشاہ کے عہد میں ہی اخلاقی انحطاط شروع ہو چکا تھا ۔ اس کے بعد ایران میں طوایف الملوکی رائج ہوئی.باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو قتل کر رہا تھا ۔ امراء عیش و عشرت میں غرق تھے . صوفی و قاضی و ملاّ ریاکار تھے ۔ اس کا ذکر حافظ نے بھی جا بجا کیا ہے ۔ عبید کے نثری رسائل میں تعریفات،اخلاق الاشراف، دلگشا اور صد پند ، طنز تعریفی ادب میں نئی چیزہیں . آٹھویں صدی کا ادب نہیں بلکہ تیرہویں صدی کا ادب معلوم ہوتی ہے . اخلاق الاشراف پڑھ کر میکاولی سیاست کا نقشہ سامنے آتا ہے ۔ تعریفات پڑھ کر فرانس کے والیٹر اور انگلینڈ کے سوفٹ یاد آتے ہیں ۔ مثال کے طور پر چند تعریفات سنیے :

ماہ رمضان = ھادم الذات ۔ امام = نماز فروش ۔ حلال = آنچہ نخورند .
شب عید = لیلة القدر ۔

اخلاق جلالی

کتاب کے مؤلف مولانا جلال الدّین محمّد ، مولانا سعد الدّین اسعد کے بیٹے تھے . جو علم و فضل اور علوّ نسب میں مشہور تھے ۔ جلال الدّین محمّد ۸۳۰ ھ کو کازرون کے قصبہ دوان میں پیدا ہوئے ۔ والد ماجد سے ابتدائی کتابیں پڑھیں . پھر شیراز میں وقت کے جید علما سے تعلیم مکمل کی ـجوانی میں ہی ان کے علم و فضل کی شہرت ہوگئی . وہ درس و تدریس میں مشغول ہوئے ۔ وہ فارس کے صاحب اختیار قاضی رہے ۔ درس و تدریس سے فارغ ہو کر متنازعہ امور پر فیصلے دیتے رہے.دوانی علوم معقول و منقول میں ماہر تھے ۔ مباحث اصول و فروع میں معاصرین پر فوقیت رکھتے تھے ۔ وہ ۹۰۸ ھ میں فوت ہوئے .

تألیفات

دوانی کی ۹۶ تألیفات کا سراغ ملا ہے.جن میں چھوٹے بڑے رسائل و کتب شامل ہیں . ان میں صرف بارہ کتابیں فارسی میں اور باقی عربی میں ہیں :

۱- اخلاق جلالی ۔ ۲- رسالہ تہلیلیہ ۔ ۳- رسالہ در عرض لشکر .۴- رسالہ عدالت .
۵- رسالہ در معنی جبر و اختیار ۔ ۶- رسالہ در خواص حروف ۷- رسالہ در شرح

غزل حافظ ۔ ۸- رساله در شرح بیتی از حافظ.۹- رساله در شرح بیتی از شیخ شبستری ۔ ۱۰- شرح رباعیّات خود ۔ ۱۱- رساله در دیوان مظالم ۔ ۱۲- رساله صیحه و صدا ۔

علامه دوانی نے اخلاقِ جلالی کی وجه تألیف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے که سلطان حسن بیگ بہادر کو مطالعۂ کتب کا شوق تھا ۔ اس کے پاس ایك کتاب تھی ۔ جس میں سلاطین ، حکماء و ائمۂ دین کے حکیمانه اقوال مندرجه تھے ۔ سلطان کے اسلاف نے کتاب کی اہمیت کے پیش نظر اس کو بیش بہاء جواہر کے ساتھ خزانۂ عامرہ میں رکھا تھا ۔ اس کتاب میں غیر معروف کلمات اور غریب اشعار تھے ۔ سلطان نے مجھ سے کہا که اس کی ترمیم و تتمیم کروں ۔ میں نے جب اس کو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا که اجزائے کتاب کی ترتیب منتشر ہے ۔ اور اصول علم اخلاق و سیاست کے مطابق نہیں ۔ اس لیے میں نے خیال کیا که ایسی کتاب مرتب کیجائے ، جو حکمتِ عملی کے اصولوں پر مبنی ہو ۔ اور جس میں آیات و احادیث ، مشایخ و ائمه اور حکمائے الهین کے اقوال ، شواهد دلائل کے طور پر لائے جائیں ۔ اور امکان بھر اس مذکورہ کتاب کے مقاصد کی تکمیل بھی مدّنظر رہے ۔ چنانچه یه کتاب مرتب ہوئی ۔

اس کتاب کا نام «لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق » ہے ۔ اس کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے :

۱- ذاتی اخلاق ۔ ۲- خاندان کے اخلاق ۔ ۳- معاشرے کے اخلاق ۔

مصنف نے علی الترتیب ان کو ۱- تہذیب االاخلاق ۔ ۲- تدبیر منزل ۔ ۳ ۔ سیاست مدن کا نام دیا ہے ۔ ان تین ابواب کو لامع اوّل ، دوم اور سوم کہا جاتا ہے ۔ ہر لامع میں فصول ہیں .جن کو لمعات کا عنوان دیا ہے ۔ پہلے لامع میں دس لمعات ہیں ۔ اور کتاب کا طویل ترین حصّه یہی ہے ۔ دوسرے لامع میں دس لمعات ہیں ۔ تیسرے لامع میں سات لمعات ہیں ۔ آخر میں وصایای افلاطون اور وصایای ارسطاطالیس شامل کتاب ہیں ۔

لامع اوّل : یعنی تہذیب الاخلاق میں مکارم الاخلاق کا فلسفیانه جواز، اخلاق کی بنیادی صفات ، یعنی حکمت ، عدالت ، عفت اور شجاعت ، ہر صفت کی اقسام ، فضایل کے مقابل میں رذایل ، اکتساب فضایل کے طریق ، حفظِ صحت نفس ، امراض نفسانی کے معالجات ، خصوصاً حیرت ، جهل ، خوف ، شہوت اور حزن و حسد کاعلاج بیان کیا گیا ہے ۔

لامع دوم : یعنی تدبیر منزل میں گھر اور کنبے کی ضرورت ، مال و متاع و اغذیه کی احتیاج ، اهل و اولاد و خدام کی تربیت اور طریق معاشرت اور حقوق پدر و مادر کا بیان ہے ۔

لامع سوم میں تمدن کی ضرورت ، شہر اور اس کی تنظیم ، شہریت کی اہمیت ، حکومت کی تنظیم ، بادشاہ اور اس کے فرائض و حقوق اور صداقت و محبت کی اہمیت بیان کی گئی ہے ۔

اس کتاب کے مندرجہ ذیل مأخذ ہیں :

۱- کتاب طہارۃ الاعراق فی تہذیب الاخلاق از ابو علی احمد بن مسکویہ(۴۲۱ ھ). اس کتاب میں افلاطون اور ارسطو کے فلسفہ کو مدنّظر رکھا گیا ہے ۔ افلاطون نے اُمّہات فضایل ، یعنی حکمت ، عفّت ، شجاعت اور عدالت پیش کیے ہیں ۔ ارسطو نے فضیلت کی تعریف کرکے افراط و تفریط سے بچنے اور اوسط خیر اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے . مصنف نے ان نظریات کا دقیق تجزیہ کر کے ان کی علمی تشکیل پر بھی بحث کی ہے .

۲- تدبیرِ منزل کا حصّہ ابو علی سینا نے اضافہ کیا ہے ۔

۳- سیاست مُدن کا باب ابو نصر فارابی نے بڑھایا ۔

۴- نصیر الدّین طوسی نے ۶۳۳ ھ میں ان تینوں مدارك کو سامنے رکھ کر اخلاق ناصری لکھی ۔ تقریباً سو سال بعد علاّمہ دوانی نے اپنی علمی فضیلت ، ذہانت اور تجربے کی روشنی میں ان تمام اجزاء کو کامل گرفت اور قدرتِ کلام کے بل پر دوبارہ لکھا . انہوں نے اخلاق ناصری کی طرح اپنی کتاب کو تین مقالات میں تقسیم کیا ہے . اور تقریباً انہیں مسائل پر بحث کی ہے ۔ جو اخلاقِ ناصری میں موجود ہیں ۔ انہوں نے صرف پہلے مقالے میں علم موسیقی پر ایك فصل کا اضافہ کیا ہے ۔

اخلاق جلالی کے بعد اب تك مشرقی انداز پر فلسفۂ اخلاق کی کوئی کتاب اس جامعیت سے نہیں لکھی گئی ۔ ارسطو نے فضایل و رذایل کی بنیاد نظریۂ افراط و تفریط پر رکھی تھی ۔ دوانی نے قانونی نتائج کو بھی پیش کیا ہے ۔ طوسی نے اپنے متقدّمین کے معتقدات کو ہو بہو نقل کر دیا تھا . ان پر تنقید و اعتراضات نہیں کیے تھے ۔ دوانی نے انہیں موضوعات کو زبان و بیان کے پورے زور اور جوش سے ، اعتماد اور یقین کی پختگی سے اور دلایل و براہین کے استدلال سے لکھا. اس لئے ان کی کتاب سب کی نظروں میں مقبول اور پسندیدہ ہوئی اور اپنے عہد کے اخلاقی اقدار کی نمایندہ شمار ہونے لگی .

یہ کتاب مدتوں اسلامی مدارس کے نصاب میں شامل رہی ہے ۔ انسانی سیرت کی تشکیل کیلئے جتنی بلند پایہ صفات ہو سکتی ہیں ، اس کتاب میں ان کو منطقی اور جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے ۔ فلسفۂ اخلاق کو محض فلسفے کی حیثیت سے ہی زیر بحث نہیں لایا گیا ۔ بلکہ ان کی تصدیق و توثیق کے لیے قرآنی آیات ، احادیث اور بزرگان ملّت کے اقوال پیش کیے گئے ہیں ۔ اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ

نویں صدی ہجری میں اسلامی معاشرے میں کس قسم کے اخلاقی اقدار مروّج تھے ۔ اور ایک مہذب و متمدّن مسلمان کس قدر بلند سیرت کا آئینہ دار ہو سکتا تھا ۔

اسلوبِ بیان

کتابَ کا اسلوب بیان ادیبانہ اور فاضلانہ ہے ۔ مصنف بے تکان عربی الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں ۔ کہیں کہیں نامانوس اور مشکل الفاظ بھی آگئے ہیں ۔ عربی عبارات کے آجانے سے کتاب کا علمی معیار بلند ہوگیا ہے ۔ اس لیے ایک فاضل شخص ہی اس کے مطالب سے استفادہ کر سکتا ہے ۔ صرف فلسفیانہ مباحث کے موقع پرعبارت پیچیدہ اور دشوار ہو گئی ہے ۔ لامع دوم اور سوم ، یعنی تدبیر منزل اور سیاست مُدن کی نثر مقابلتاً آسان ہے ۔ اگرچہ کہیں کہیں مسجع و موازنہ کو استعمال کیا گیا ہے ۔ لیکن حشو و زواید اور مترادفات بہت کم ہیں ۔ جملے بھی طویل نہیں ۔ تاریخ جہانگشای جوینی یا تاریخ وصّاف کی طرح اس کی نثر متکلفانہ اور مصنوع نہیں ۔ یقیناً فصیح نثر کے نمونے موجود ہیں . بادشاہ کی مدح و ستایش میں دیباچے کی عبارات البتہ آرایشات لفظی اور تکلفات شعری سے پُر ہیں ۔

تذکرة الشعراء

دولتشاہ اسفرائن کارہنے والا تھا ۔ اس کا باپ علاء الدولہ بختی شاھرخ میرزا کے درباری تھے ۔ دولتشاہ درباری زندگی سے الگ رہا . معمولی زمینداری پر قناعت کرکے علوم متداولہ حاصل کیے . تیموری شاہزادہ سلطان حسین بایقرا کی عنایت و نوازش حاصل تھی ۔ اس لیے اپنی تألیف تذکرة الشعراء کو اسی کے نام معنون کیا ۔ دولتشاہ ۹۰۲ میں فوت ہوا ۔

یہ تذکرہ ۸۹۲ ھ میں مکمل ہوا ۔ اس نے اپنے مآخذ میں ۳۷ کتابوں کا ذکر کیا ہے . جن میں سے بعض مشہورکتابیں یہ ہیں :

احیاء العلوم ، اخبار الطوال دینوری ، تاریخ بیہقی ، جامع التواریخ رشید الدّین فضل اللہ ، تاریخ طبری ، مطلع السعدین عبدالرزاق سمرقندی ، تاریخ گزیدہ ، جہانگشای جوینی ، چہار مقالہ ، سیاست نامہ ، طبقات ناصری ، قابوس نامہ ، مناقب الشعراء ابو طاہر خاتونی اور نفحات الانس ، معلوم ہوتا ہے ۔ اس نے لباب الالباب نہیں دیکھی ۔

یہ کتاب مقدمہ، سات طبقات اور ایک تتمہ پرمشتمل ہے ۔ مقدمہ میں فارسی شاعری

کی مختصر تاریخ ہے ۔ ہر طبقه میں تقریباً بیس بیس شعراء اور ان کے مربی بادشاہوں کے علامت درج کیے ہیں ۔ تتمه میں سلطان حسین غازی اور اس کے چھ همعصر شعراء کا ذکر کیا ہے ۔

تذکرة الشعراء میں تقریباً ۱۵۰ شعرائے متقدمین کے کلام کا انتخاب آگیا ہے ۔ اس نے بڑی قابلیت سے اشعار کا انتخاب کیا ہے ۔ بعض نایاب اشعار محفوظ ہوگئے ہیں . اس میں بہت سی پُر لطف حکایات درج کی ہیں ۔ مجموعی طور پر کتاب دلچسپ اور مفید ہے .

ساتواں طبقه اور تتمه معاصر شعرا سے متعلق ہونے کی وجه سے مستند ہے .اس نے اکثر جگه واقعات کی تحقیق میں احتیاط نہیں کی ۔ ضعیف اور غیر معتبر روایات بھی شامل کر لی ہیں ۔ سنین کی بھی کافی غلطیاں ہیں ۔ اس لیے ناقدین اس کے بیان کردہ واقعات اور حکایات کو احتیاط سے قبول کرتے ہیں ۔

رَوْضَۃُ الصَّفَا

محمّد بن سیّد برهان الدّین ، خاوند شاه المعروف به میرخواند ، ۸۳۸ ھ میں پیدا ہوئے . عقلی و نقلی علوم میں مہارت کی وجه سے اپنے بھائیوں میں سب سے زیادہ شہرت رکھتے تھے ۔ تاریخ نویسی اور انشاپردازی میں بھی ان کا مقام بہت بلند تھا . ۹۰۱ ھ میں گوشه نشین ہوگئے اور بیماری میں مُبتلا ہو کر هرات میں ۹۰۳ ھ میں فوت ہوئے . ان کے ممدوحین میں میرزا الغ بیگ ، مرزا عبداللطیف ، ابوالقاسم بابر بن بایسنغر ، بو سعید ، سلطان حسین بایقرا اور امیر علی شیرنوائی نامور ہیں ۔

روضة الصّفا سات جلدوں پر مشتمل ہے . چھ جلدیں میر خواند نے لکھیں ۔ ساتویں جلد حبیبُ السّیر کے مؤلّف خواند میر نے مکمل کی ۔

جلد اوّل : تاریخ انبیاء و سلاطین قدیم ایران ۔

جلد دوم : تاریخ رسول اکرم و شرح احوال خلفای راشدین ۔

جلد سوم : تاریخ ائمّه و شرحِ احوال اُمویان و عبّاسیان ۔

جلد چهارم : تاریخ طاهریان، صفّاریان، سامانیان، غزنویان ، دیلمیان ، سلجوقیان ، خوارزمشاهیان، اتابکان،ملوکِ خلج ، ملوک نیمروز،ملوک کرت وغیره .

جلد پنجم : تاریخ ترکستان، مغول، احوالِ چنگیز و اولاد ، امرای مغوَل، چوپانیان ، ایلخانیان، سربداران وغیره ۔

جلد ششم : تیمور و اولاد او، شاهرخ ،ابوالقاسم بابر، ابو سعید، میرزا ابراهیم ۔ میر خواند ۸۹۹ ھ تک تاریخ کی تکمیل میں مصروف رہے ۔

جلد هفتم : احوال و وقایع سلطان حسین بایقرا ، بدیع الزّمان میرزا، محمّد خان و ذکر اقالیم سبغه وغیرہ ۔

رضا قلی ہدایت نے روضۃ الصفای ناصری کے نام سے تین جلدوں کا اضافہ کیا ۔ ان کی تفصیل یہ ہے ۔

جلد هشتم : تاریخ صفویه و احوال علماء و رجال آن دورّ ۔

جلد نهم : تاریخ زندیه و علمای آن عهد، شرح احوال شاهان قاجار؛ آقا محمّد خان ، فتح علیشاه ، محمّد علی میرزا ۔

جلد دهم : احوال سلطنت محمّد شاه قاجار و ده سال اوّل سلطنت ناصر الدّین شاه تا سال ۱۲۷۴ ھ ۔

میر خواند نے اپنی تألیف میں ان مآخذ کا ذکر کیا ہے :

الکامل ، تاریخ طبری،ظفر نامۂ شرف الدّین علی یزدی ، قریب العصر اور معاصر حالات اس نے خود جمع کرکے لکھے ہیں ۔

اسلوب نگارش

ایلخانی اور تیموری دور کے مؤلّفین کی طرح ، روضۃ الصّفا کی نثر بھی مسجع اور مترسلانہ ہے اور اس میں تمام صنایع بدیعی مثلاً تشبیہ، استعارہ ، مراعات النظّیر اور تجنیس سے کام لیا ہے ۔ تعقیدات و تطویلات کافی ہیں ۔ اس زمانے میں یہی اسلوب پسندیدہ تھا ۔

بخش هفتم :

صفوی دور میں فارسی ادب کا جائزہ

صفوی دور حکومت ۹۰۵ سے ۱۱۳۵ ھ تک قائم رہا ۔ اس عہد کے نامور بادشاہ ، شاہ اسماعیل ، شاہ طہماسپ ، عباس اعظم ، شاہ صفی ، شاہ سلیمان ، شاہ حسین ، اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ ایران میں سیاسی استحکام پیدا ہوا اور «تشیع» سرکاری مذہب قرار دیا گیا ۔ اس کے ردّ عمل کے طور پر دربار سے شعراء کی سرپرستی ختم ہوگئی ۔ مدحیہ قصیدہ سرائی کی بجائے مدح اہل بیت اور مرثیہ گوئی کی ترغیب دلائی گئی ۔ شاعری کی بجائے فن تعمیر ، نقاشی ، مصوری اورخطاطی کو زیادہ رواج ہوا . شعراء ، فضلاء، اطباء برصغیر میں سلاطین کی بخشش و سرپرستی علم و ادب کا حال سن کر ادھر چلے گئے ۔

شاعری

ایران میں قصیدہ گوئی کی اہمیت کم ہوئی اور مرثیہ سرائی کا رواج ہوا ۔ محتشم کاشانی اور حکیم شفائی کے مراثی مقبول ہوئے اور ہفت بند کاشی متأخرین کے لیے وجہ تقلید بنارہا۔ غزل میں نیا رجحان پروان چڑھا ، تازہ گوئی ، خیال بندی اور غزلیہ محاکات کو فروغ ہوا. جو بعد میں برصغیر جا کر ایرانی اور غیر ایرانی شعراء کی وجہ سے سبک ہندی معروف ہوا۔ ایران میں اس اسلوب میں لکھنے والوں میں فغانی کا نام سر فہرست ہے ۔ چونکہ شاعری ایک نجی مشغلہ بن گیا تھا ۔ اس لیے اکثر شعراء نے غزل اور داستان سرائی (مثنوی) پر اپنی توجہ کو مرکوز کیا ۔

ھاتفی : لیلی و مجنوں ، شیریں خسرو ، ہفت منظر ، تیمور نامہ اور شاھنامہ حضرت شاہ اسماعیل اس کی مشہور تصانیف ہیں ۔

میرزا قاسم گنابادی نظامی کا مقلد ہے . لیلی و مجنوں ، چوگان نامہ ، شاہ رخ نامہ ، شاھنامۂ ماضی (شاہ اسماعیل) شاھنامۂ نواب عالی (شاہ طمہاسپ صفوی) اس کی یادگار مثنویاں ہیں ۔

اھلی شیرازی (م - ۹۴۲ ھ): مثنوی سحر حلال اور شمع و پروانہ اس کی تصنیفات ہیں ۔

ھلالی چغتائی (م - ۹۳۵ ھ): غزلگوئی کے علاوہ اس کی مثنویاں لیلی مجنوں ، شاہ و درویش اور صفات العاشقین یادگار ہیں .

وحشی بافقی (م - ۹۹۱ ھ): اس نے قصاید بھی لکھے ۔ وہ اپنی غزل اور عاشقانہ

ترکیب بند کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے ۔

قدری اپنے دو رزمناموں یعنی جرون نامہ (۱۰۳۱) اور جنگنامہ کشم (۱۰۳۴) کی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے ۔

بہشتی نے شاہنامۂ بہشتی میں سلطان مراد سوم اور خدا بندہ صفوی کی جنگوں کا حال لکھا ہے ۔

زلالی خوانساری مندرجہ ذیل سبعہ سیارہ یعنی سات مثنویوں کی وجہ سے معروف ہے :

محمود و ایاز ، شعلۂ دیدار ، آذر و سمندر ، حسن گلو سوز ، ذرہ و خورشید ، میخانہ ، سلیمان نانہ ، یہ مثنویاں اپنے دقیق اسلوب اور عمیق معانی کی وجہ سے شہرت رکھتی ہیں ۔

نثر

صفوی دور حکومت میں نثر کا اسلوب سادہ بھی ہے لیکن اس میں‌عامیانہ تراکیب بھی شامل ہوگئی ہیں ۔ پر تکلف و تصنع نثر عام ہے ۔ سرکاری مکاتبات ، انشاء اور تاریخ نویسی میں اسی کا عام رواج رہا ہے ۔ بعض مصنفین نے میانہ روی بھی اختیار کی ہے یعنی ملا جلا اسلوب اختیار کیا ہے ۔ اس دور میں مختلف موضوعات پر تألیفات مرتب ہوئیں خاص طور پر مذہبی کتابوں کی فوقیت اور کثرت نظر آتی ہے ۔ تصانیف کی تفصیل حسب ذیل ہے :

داستانیں

داستان اسکندر ، قصہ هزار گیسو ، قصہ اشرف و وزیر زادہ ، شیرین نامہ ، نوش آفرین نامہ ، قصہ مریم دخت شاہ پرتگال ۔

منشآت : میرزا طاهر وحید (م - ۱۱۲۰ ھ)

تواریخ

حبیب السیر ، غیاث الدّین خواندمیر (م - ۹۴۱ ھ)

تذکرۂ شاہ طہماسپ از شاہ طہماسپ اوّل (۹۳۰- ۹۸۴ ھ)

احسن التواریخ از حسن بیگ روملو ، لب التواریخ یا تاریخ ایلچی نظام از شاہ یحیی بن عبداللطیف ، عالم آرای عباسی از اسکندر بیگ منشی ، صفوة الصفاء از ابن بزاز۔

زبدة التواریخ از محمّد محسن ۔

شعرا کے تذکرے

تحفۂ سامی از سام میرزا ، خلاصۃ الاشعار و زبدۃ الافکار از تقی الدّین کاشی ، آتشکدہ آذر تصنیف لطف علی بیگ آذر ، لطایف نامہ ترجمہ فارسی مجالس النفایس از فخری امیری ۔

تفسیر

ترجمۃ الخواص یا تفسیر زواری از علی بن حسین زواری ۔

منہج الصادقین فی الزام المخالفین از فتح اللّٰہ کاشانی (م - ۹۸۸ ھ).

مذہب

جامع عباسی ، از بہا الدّین عاملی و نظام الدّین محمّد قرشی ۔

بحار الانوار ، جلاء العیون ، زاد المعاد ، عین الحیاۃ از ملا محمّد باقر مجلسی ۔

کلام و عقاید

کلمات مکنونہ از محسن فیض کاشانی .

گوہر مراد از عبدالرزاق لاہیجی ۔

اسرار الحکم ازملا ہادی سبزواری ۔

فغانی

فغانی شیراز میں ۸۵۰ ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے . شروع میں وہ چھریاں چاقو بنانے کا کام کرتے تھے ۔ اور اس لئے شروع میں سکاکی تخلص اختیار کیا۔ بعد میں فغانی تخلص رکھ لیا۔ اس نے جوانی کےدن عیش و نشاط اور میخانوں کو آباد کرنے میں گزارے ۔ رمضان میں بھی دوستوں کے ساتھ چھپ کر گوشت کھاتے اور شراب پیتے ۔ تقریباً تیس سال کی عمر میں شیراز سے سیر و سیاحت کیلئے نکلے ۔ ھرات پہنچے جو سلطان حسین بایقرا اور میر علی شیر نوائی کے علم دوست وزیر کی وجہ سے مرکز علم و فن تھا ۔ لیکن وہاں ان کے کلام کو پسند نہ کیا گیا ۔ اس لیے وہ ھرات سے تبریز چلے گئے ۔ وہاں سلطان یعقوب بیگ آق قوینلو جیسا مربی علم و فن حکمران تھا ۔ فغانی درباری شعراء میں شامل ہوا اور اس کیلئے عیش و طرب کے سامان پیدا ہوئے ۔ ۸۹۶ ھ میں سلطان یعقوب کی وفات کے بعد تخت و تاج کیلئے معرکہ آرائی ہوتی رہی اور امن و امان ختم ہوگیا ۔ فغانی تقریباً ۱۷ سال تبریز میں گزارنے کے بعد شیراز واپس چلے گئے۔ بعد میں ابیورد گئے ، جہاں ان کی شراب کا انتظام ہوگیا ۔ لیکن اب ساتھیوں کی بے ہودگیوں اور

اپنے ہوا و ہوس کے ہاتھوں تنگ آگئے تھے ۔ زندگی سے بیزار رہنے لگے تھے ۔ اپنی لاقیدی اور لاابالی حالت سے ملول و مغموم ہونے لگے تھے ۔ آخر مشہد گئے اور امام ثامن کی منقبت میں ایسا قصیدہ لکھا کہ سب کے ہاں مقبول ہوا ۔ وہیں عزلت و قناعت ، ندامت اور توبہ کی زندگی گزار کر ۹۲۵ ھ میں فوت ہوئے ۔

فغانی نے اپنا جو دیوان مرتب کیا تھا ۔ وہ تبریز میں کسی جنگ کی غارتگری میں ضایع ہوگیا ۔ فغانی نے اپنے بھائی کو شیراز میں مسودات سے یا دوسرے ذرایع سے اشعار جمع کرنے کو کہا ۔ شیراز میں واپس جانے اور بعد میں ابیورد اور مشہد میں قیام کے دوران میں کلام جمع ہوا اور مرتب ہوا ۔

دیوان اشعار بابا افغانی کو احمد سہیلی خوانساری نے مرتب کرکے شایع کیا ۔ اس میں قصاید ، ترکیب بند ، ترجیع بند ، غزلیات، قطعات اور رباعیات شامل ہیں ۔

قصاید میں سلطان یعقوب بیگ اور رستم بیگ کی مدح و رثا کے علاوہ باقی قصاید و ترکیب بند و ترجیع بند حضرت علی بن ابیطالب اور علی بن موسی رضا کی منقبت میں ہیں ۔

فغانی کے متعلق جو تذکروں میں مذکور ہے وہ خوش آیند نہیں ۔ اس کی تعلیم و تربیت کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ یہ بتایا گیا ہے کہ وہ میخانوں کی رونق تھا ۔ رمضان میں بھی نہیں رکتا تھا ۔ دوستوں کے ساتھ چھپ چھپ کر پیتا تھا ۔ یہاں تک کہ عید آ جاتی ۔ ابیورد میں گیا ہے تو اس کے حاکم نے اس کی شراب کیلئے خاص اہتمام کیا ۔ ان بیانات سے اس کی شخصیت ابھرتی نظر نہیں آتی ۔ اس کی شاعری میں کوئی خاص لاقیدی و لا ابالی کی باتیں نظر نہیں آتیں جس سے ظاہر ہو کہ وہ محض حسینوں کے جھرمٹ میں مست و مدہوش کھویا رہتا اور اخلاق ، کردار اور دین کی اسے خبر نہیں تھی - اس کے کلام سے تو ایسا ظاہر نہیں ہوتا ۔ اس کو اپنے مذہب اور ائمہ مذہب سے کیسا لگاؤ اور خلوص تھا اس کے ان قصاید سے ظاہر ہے جو اس نے علی بن ابیطالب اور علی بن موسی رضا کی منقبت میں لکھے ہیں ۔ اگر وہ زندگی کے آغاز میں عیاشانہ اور رندانہ زندگی گزارتا تھا تو اس کی زندگی میں ضرور انقلاب آیا ۔ جس کی وجہ سے اس نے درویشی اور فقیری کی باتیں کی ہیں ۔ اللّٰہ سے محبت کی باتیں کیں ۔ علایق ، اغراض، ہوس ، حسد و کینہ ترک کرنے کی باتیں بھی لکھیں ۔ یک جہتی اور انسانوں سے محبت کی باتیں کیں ۔ مکر و حیلہ نہیں کیا - ریا کاری نہیں کی ۔ ان باتوں کو پڑھ کر تو وہ ایک بلند پایہ درویش نظر آتا ہے ۔ مثلاً اس کی یہ غزل دیکھیے :

هرگز نظر به کام نیالوده ایم ما　　فارغ نشین حسود که آسوده ایم ما

یك رو و یکدلیم اگر نیك و گر بدیم　　قلب سیه به حیله نیندوده ایم ما
خود را چنانکه هست به مردم نموده ایم　　هر جا که بوده ایم چنین بوده ایم ما
کمتر ز هر کمیم و کم از کمتریم هم　　بر خود هزار بار نیفزوده ایم ما

فغانی نے ریاضت و مجاہدت اور جانسوزی اور تب و تاب عشق سے دل کی پرورش و تربیت کی ۔ اس کے اندر جو صفات برپا ہوئیں ان سے دوسروں کو بھی رہنمائی حاصل ہوئی اور ان کے درد کا درماں پیدا ہوا ۔ مندرجہ ذیل غزل میں فغانی نے اپنے دل کی کیفیت بتائی ہے جس سے اس کی شخصیت اجاگر ہوتی ہے :

آزاده تر از بلبل باغست دلِ ما　　کبك قفس کنج فراغست دل ما
صد گونه شراب از قدح دیده کشیده　　فارغ ز صراحی و اباغست دل ما
آسوده ز آب خضر و ساغر جمشید　　در روغن خود تازه دماغست دلِ ما
تا مغز قلم سوخته در تجربۂ عشق　　بر سوختگان مرهم داغست دلَ ما
آتش صفت نیم که در خانقه و دیر　　هرجا که نشینم چراغست دلَ ما
گر دیده کباب از دم جانسوز فغانی　　در میکده بی لابه ولاغست دلِ ما

فغانی کو بعض بابای فغانی لکھتے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فقیری و درویشی میں نام پایا تھا اور وہ دوسروں کی بھی رہنمائی کرتے تھے ۔ وہ درویشوں کی عظمت کے قائل تھے اور جانتے تھے کہ انہی کے عشق کی برکت سے حسن کی تابش اور عظمت پہچانی جاتی ہے ۔ ایك پوری غزل میں درویشوں کی صفات پر روشنی ڈالی ہے :

جگر پاره و داغ دل خونابه چکان　　لالۂ عیش و گل عشرت درویشانست
پای بر چشم فقیران نه و اندیشه مکن　　که این عنایت سبب حرمت درویشانست
رخ متاب از من درویش که سلطانی حسن　　از صفای نظر و همت درویشانست
غیر ازین قوم که آیینۂ احوال همند　　کیست کورا خبر از حالت درویشانست

درویش کو ایك ایسا مقام حاصل ہوتا ہے کہ وہ رنج و شادی ، نیکی و بدی ، زندگی و موت کو ایك نظر سے دیکھتا ہے ۔ زندگی کا یہ تضاد اسکی نظروں سے دور ہو جاتا ہے ۔ یہ چیزیں اس کے دل و دماغ پر اثر انداز نہیں ہوتیں ۔ فغانی اس رمز سے آشنا تھے ۔ انہوں نے اس کا اظہار ذیل کے اشعار میں کیا ہے :

پیش ما خاطر شاد و دل غمناك یکیست　　حال آسوده و درد جگر چاك یکیست
ما که از خویش گذشتیم چه هجران چه وصال　　مردن و زیستن مردم بیباك یکیست
صدق ما با تو درستست چو آیینه و آب　　عاشقان را دل صاف و نظر پاك یکیست
راحت و رنج فغانی ز خیال من و تست　　راست بین باش که نیك و بد افلاك یکیست

بابا فغانی ، جیسا کہ انہوں نے بیان کیا ہے ۔ ذکر و فکر میں غرق رہتے تھے ۔ ان پر

محو و استغراق کی حالت بھی طاری رہتی تھی ۔ گویا اصطلاح تصوّف میں وہ فنا فی اللّٰہ کے مقام پر پہنچ چکے تھے ۔ مثلاً ان کی یہ غزل :

نیست بیرون و درونم ذرہ یی خالی ز دوست صورتم آیینۂ معنی و معنی عین اوست
آنچنان با دوست یکتایم کہ چون مجنون زار هیچ غیر از دوست نبود گر برون آیم ز پوست
حسن روز افزون یار و عشق خرمن سوز من همچو گل در غنچه سیراب و چون می در سبوست

فغانی نے عشق و معرفت کے مضامین بیان کرنے میں شراب ، ساقی اور پیر مغاں کی اصطلاحات سے کام لیا ہے ۔ بعض جگہ تو می عشق اور میکدۂ عشق بھی لکھ دیا ہے ۔ بعض جگہ ایسے اشارات ہیں جن سے ظاہر ہے کہ شراب مادی کی بات نہیں کر رہے ۔ اور کئی اشعار ہیں جن میں شراب ، ساقی ، مست کی خود ہی تصریح کردی ہے ۔ دونوں قسم کے نمونے ملاحظہ کیجئے :

بیا کہ ساقی ما بادۂ طهور دهد ندیم بزم ، ندای هوالغفور دهد
دلم به مجلس مستان حق پرست کشید که داد عیش در آن زمرۂ حضور دهد
قدم به راه نه ای دل که آب نزدیکست اگرچه خضر رهت وعده های دور دهد
ز سنگ بادیه روشن شود زجاجۂ دل چو یار عرض تجلی به کوه طور دهد
یکیست درد فغانی و محنت ایوب خدای عز و جلش دلِ صبور دهد

امروز داد مرشد ما رخصت شراب امّا به این قرار که کم گفتگو کنند
می ده که وضع میکده بی مصلحت نشد کاری که می کنند حکیمان نکو کنند
مشکل حکایتیست که هر ذره عین اوست اما نمی توان که اشارت به او کنند
قسمت نگر که کشتۂ شمشیر عشق یافت مرگی که زندگان به دعا آرزو کنند

فغانی کے ہاں ایسے اشعار بہ کثرت ہیں جن میں شراب سے مراد عام دنیوی شراب ہے ۔ مثلاً یہ شعر جس میں کثیر مقدار میں پینے کی آرزو کی ہے :

از اندك می که بنشاند غباری نیست آزادی بلا اینست که این جنس نکو بسیار می باید

ایك شعر میں شراب چھوڑنے کا بھی ذکر ہے ۔

قطع نظر از ساغر می کرد فغانی بگذاشت در میکده و مرغ چمن شد

ایسے اشعار کی کثرت ہے جن میں شراب کیلئے مجازی و حقیقی دونوں معانی پہنائے جا سکتے ہیں مثلاً :

ای که می گوئی چرا جامی به جانی می دهی این سخن با ساقی من گو که ارزان کرده است

فغانی کو لطافت طبع ، ذوق جمال اور مزاج عشرت دوست حاصل تھا ۔ اس کی زندگی میں ایسا وقت آیا ہے کہ وہ اسباب عیش سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا ۔ باد و باران ،

باغ و بہار و می مینا کی نعمتوں سے فیضیاب ہونا چاہتا تھا ۔ زندگی کو غنیمت جان کر خواب غفلت میں نہیں گزارنا چاہتا تھا ۔ اپنی غزلیات میں اکثر ایسے جذبات کا اظہار کیا ہے ۔ خاص طور پر ذیل کی غزل دیکھیے :

باران و موج آب و می و روز عشرتست — از هر طرف که می نگرم دام صحبتست
بوی بهار مژدهٔ فردوس می دهد — وین خوبی هوا اثر لطف رحمتست
آمد برای عشرت این فصل در جهان — آدم که سایه پرور بستان جنتست
عمری چنین شریف و هوایی چنین لطیف — بیدار شو نه وقت شکر خواب غفلتست
این یك نفس که بوی گلی می توان شنید — بیرون مرو ز باغ که فرصت غنیمتست

لیکن ایك وقت ایسا آیا کہ اس نے عیش و نشاط سے بیزار ہو کر اپنی بد نصیبی کا گلہ کیا ہے اور یاس و نامرادی کے احساسات کا بھی اظہار کیا ہے :

دل از عیش جهان کندیم و ذوق بادهٔ نابش — نمی ارزد به ظلم شحنهٔ شت گشت مهتابش

شود در گلشنم دل چاك و در مجلس جگر خون هم — فغان از دختر بدحال و از بخت دگرگون هم
چندانکه رفته ام به چمن گل ندیده ام — فیض بهار و منفعت مل ندیده ام
زان عاشقان نیم که بدانم وفای گل — من غیر نامرادی بلبل ندیده ام

بعض درویش ایسے بھی ہیں جو روحانیت میں اپنے آپ کو ایسے مقام پر پاتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو شریعت کے ظاہری احکام سے بالاتر سمجھتے ہیں اور حرم و کعبہ سے انہیں دلچسپی نہیں رہتی ۔ فغانی کے کلام میں بھی ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے اس قسم کے نظریہ کی جھلك ملتی ہے ۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ محض تجریدی خیال ہو کہ مجذوب و دیوانہ خدا کیلئے ظواہر کی پابندی ضروری نہیں ، اس قسم کے اشعار یہ ہیں :

وقت نماند چون بود وعده به طرف گلستان — دل چه تحمل آورد زمزمهٔ خطیب را
مجنون ز در خانه لیلی نرود پیش — دیوانه چه داند که رهِ کعبه کدام است
عاشق ز کوی دوست نشد مایل حرم — مرغ از حریم باغ هوای قفس نکرد

فغانی عشق کی خصوصیت و اہمیت سے آگاہ تھے ۔ وہ جانتے تھے کہ عشق میں کیا کیا مشکلات سامنے آتی ہیں اور کونسا شخص عشق کے قابل ہوتا ہے اور پھر عاشق کے تن و جان پر کیا کیا بیتتی ہے اور صحیح معنوں میں کون کون عاشق کہلانے کا مستحق ہوتا ہے – فغانی نے جستہ جستہ عشق و عاشق کے متعلق رائے کا اظہار کیا ہے ۔ مندرجہ ذیل دو غزلوں میں خاص طور پر ان کی موضوع سخن بنایا ہے ۔ ملاحظہ کیجئے ۔ عاشق کا حال و احوال مندرجہ ذیل غزل میں دیکھیئے :

عاشقان را در سر شوریده سودا آتشست — در بدن خون نشتر و در دل سویدا آتشست
تن نخواهد خوابگاه نرم چون گرمست دل — گلخنی را زیر و پهلو فرش دیبا آتشست

می گذارم از حیاتا از تو می جویم مراد در نهاد بیدلان غرض تمنا آتشست
مرد صاحبدل رساند فیض در موت و حیات شاخ گل چون خشك گردد وقت سرما آتشست

فغانی کی نگاہ میں جس شخص میں عشق نہیں وہ زندہ نہیں :

آنرا که نیست گرمیی عشق حیات نیست سر بی هوای عشق و دلم بی جنون مباد

عاشق کا نام ہمیشہ زندہ رہتا ہے :

طاق کسری گل شد و تاج مرصع خاك شد نام عاشق همچنان بر هر در و دیوار هست

غزل کی نمایاں معنوی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عاشق کے دل کی فریاد ہو ۔ اس کا محبوب جور و جفا کا عادی ہے- بے التفات ہے ۔ اپنے حسن پر نازاں ہے ۔ اپنی دلکشی کی وجہ سے عاشق کیلئے پریشان اور غمناکی کا سبب بنتا ہے ۔ عاشق اس کے دیدار کا طالب ہے ۔ اس کی غیر حاضری میں تڑپتاہے ۔ فغانی کی غزلوں میں یہ کیفیات موجود ہیں ۔ مثلاً یہ غزل :

دل به بیداد نهادیم عطای تو کجاست ما خود از جور نناليم وفای تو کجاست
ما به یك جلوه خرابیم و تو پروا نکنی آخر ای نخل جوان نشو و نمای تو کجاست
می گذاری که کشد دامن پاك تو رقیب آن همه سرکشی و جور و جفای تو کجاست
روزگاریست که دل بوی مرادی نشنید نافه یی از گره بند قبای تو کجاست
شهر ز آمدنت گشت پریشان و هنوز کس ندانست مه من که سرای تو کجاست
آه از آنروز که تنها ز چمن مست رسی پرسی از سوختهٔ خویش که جای تو کجاست

فغانی کی اکثر غزلیں سہل ، سادہ ، واضح اور صریح ہیں اور غزل کا شیوہ بھی یہی ہے کہ بات سوز و اخلاص سے کہی جائے تا کہ سیدھی محبوب کے دل تك پہنچے ۔ لیکن شرط یہ ہے کہ حسن ادا سے کہی جائے ، نکتہ و مطلب بھی دلپسند ہو ۔ فغانی نے غزل کی آرایش کے لیے تشبیہات اور صنایع لفظی و معنوی بھی استعمال کی ہیں ۔ تجنیس ، تضاد ، رعایت لفظی اور ایہام کی مثالیں ملتی ہیں ۔ غزل کی ایك خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بحر موسیقی سے ہم آہنگ ہو ۔ الفاظ کا در و بست ایسا ہو کہ اس سے غنائیت پیدا ہو ۔ فغانی نے حروف تك کی تکرار سے ترنم پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ۔ مثلاً ایك غزل کے یہ اشعار :

رنگ قضا آمیخته حسن و ملاحت آمیخته نار و بلا انگیخته در صورت حور و پری
رخسار گلگون ساختی مستانه بیرون تاختی صد ملك دل پرداختی فریاد ازین جادوگری

فغانی نے لفظوں کی مدد سے تخیلی پیکر تراشنے میں بھی مہارت کا ثبوت دیا ہے ۔ وہ کسی واقعہ کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں کہ صورت ہماری آنکھوں کے سامنے مجسم ہو کر آجاتی ہے ۔ مثلاً یہ اشعار :

آشفته و کاکل به سر و دوش کشیده گویا که همین دم نه پری خانه چنین برخاست
لرزد دلم چو بنگرم از افت و خیز رقص لرزان چو برگ لاله و گل جامه بر تنت

منم آن ناتوان موری که نتوانم کشید آخر به صد سر گشتگی از خرمنت گر خوشه ای یابم

فغانی کا عام اسلوب تو متقدمین کا ہے یعنی سبک خراسانی لیکن عصر فغانی کے دیگر شعراء کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ شعراء غزل کے روایتی مضامین کو دہرا رہے ہیں اور جدت و ندرت پیدا نہیں ہو رہی ۔ لیکن فغانی کے بعض اشعار سے ظاھر ہوتا ہے کہ وہ تازہ گوئی کی کوشش کر رہے ہیں ۔ نئےمضامین پیدا کرنے کی تلاش میں ہیں ۔ اس لیے ایسے اشعار میں مطالب پیچیدہ ہوگئے ہیں اور ان کی گرہیں کھولنے میں دقت پیش آتی ہے ۔ اصل میں یہی خیال آفرینی اور ابہام آگے چل کر سبک ہندی کے رواج کا باعث بنا ۔ سبک سے بحث کرنے والوں کی رائے ہے کہ فغانی اور علی شیرنوائی جیسے شعراء نے اس قسم کے اسلوب کی بنیاد رکھ دی تھی ۔ لیکن فغانی میں ایسے اشعار کی تعداد کم ہے ۔ مثال کے طور پر چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں ۔

نسخه سحر سامری کاغذ توتیا شود گر به کرشمه سر دهی نرگس سرمه سای را
در طلب تو دیده ام کاسۀ آب جغد شد منکه ز مغز استخوان طعمه دهم همای را
تیغ زبان عارفان گرد گرفت و همچنان عشق تو جلوه می دهد خنجر سر زدای را

برِّصغیر میں سبک ھندی کے خواص میں ایک امتیازی خصوصیت یہ پیدا ہوگئی کہ شعرا تمثیل سے زیادہ کام لینے لگے ۔ وہ ایک مصراع میں کوئی تصور پیش کرتے اور دوسرے مصراع میں اس کی تائید میں ایک فلسفیانہ شگفتہ مثال لاتے جس سے مضمون اجاگر ہو جاتا ۔ نظیری ، عرفی ، کلیم ، صائب اور غنی نے اس اسلوب میں نہایت عمدہ نمونے پیش کیے ہیں ۔ فغانی کے ہاں کہیں کہیں مثالیہ ، کی مثالیں ملتی ہیں ۔ مثلاً :

این قید هستی تو فغانی بلای تست بشکن قفس که بر سر آزاده باج نیست

دیده دریا کن فغانی تا کنارت پر شود تا صدف باران نگیرد کی درّ مکنون دهد

فغانی کی مندرجہ ذیل غزل صحیح معنوں میں غزل ہے ۔ ایک چھوٹی بحر اور باتیں ایسی کہ عاشق محبوب سے گلے شکوے اور درد و فراق کی باتیں کرتا ہے - بعض تذکرہ نگاروں اور مؤرخین نے یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ فغانی کا معشوق روایتی تھا لیکن فغانی نے عاشق کو نئے پیرائے میں پیش کیا ہے ، لیکن ذیل کے اشعار سے کوئی نیا پن ظاہر نہیں ہوتا ۔

بگشای پرده از گل رخسار اندکی آبی نما به تشنۀ دیدار اندکی

بسیار نازکی ، مکن آزار بیدلان ای گل گذار همدمی خار اندکی
رفتی بگشت باغ و من از درد فغان کنان سر بر نکردی از سر دیوار اندکی
هر چند درد دل به تو بسیار گفته ام نشنیده ای هنوز ز بسیار اندکی
با آنکه دشمنی مکن اظهار دوستی گر با تو حال خود کند اظهار اندکی
شبها منم ز درد تو تا روز آهِ سرد نا کرده گرم دیده بیدار اندکی
ای مرهم شکسته دلان التفاتِ تو رحم از بر فغانی افگار اندکی

اسی انداز کی اور غزل ہے . اس میں پہلے شعرکے علاوہ محبوب بڑے پائے کا ہے ۔ وہ محبوب خدا ہوسکتا ہے ۔ اس کو پانے کے لیے عاشق کی کیا صفات ہونی چاہیں اورکس قسم کا عشق کامیاب ہوتا ہے ۔ ایك ایك شعر اپنے مطالب کے لحاظ سے بہت خوب ہے ۔ اور غزل پر فغانی کی قوت کو ظاہر کرتا ہے ۔

جز جور و جفا پیشۂ محبوب نباشد خوبی که جفایی نکند خوب نباشد
جای نرسد نکہت پیراهن یوسف گر خود کشش از جانب یعقوب نباشد
یك شمه نجات از علم عشق نیابد آن را که بدل صبر صد ایوب نباشد
گر دیده و دل پاك نگه داشته باشی هیچ از نظر پاك تو محجوب نباشد
هرگز دل پر خون نشود طالب درمان مارا که بجز درد تو مطلوب نباشد
گر جذبۂ عشقت نشود یار فغانی در راه طلب سالك مجذوب نباشد

غزل فغانی کی اہم خصوصیت اس کا سوز و اخلاص ہے وہ خود « سوز فغانی حزین » اور آہ سوز ناك فغانی، کہہ کر اپنے دل کی کیفیت بیان کرتا ہے ۔ اس لیے وہ اپنے کلام کی تأثیر کا شعور بھی رکھتا ہے ، مثلاً :

بلبلی ، صبح ، فغانی ، غزلی خواند غریب گریه آورد مگر نسخۂ دیوان داشت
چه جان گداز فغانی فسانه ای داری بگو که سوختۂ حرف جانگداز توام
سحرت حلال باد فغانی که از هنر کردی بطرز نو غزل عاشقانه خوب
آنان که با اخلاص کلام تو نویسند در اوّل دفتر همه نام تو نویسند

بخش هشتم :

قاجاری دور میں فارسی ادب کا جائزہ

قاجاری دور حکومت ۱۳۱۱ سے ۱۳۳۹ ھ تک رہا ۔ لیکن یہ جائزہ ۱۳۲۸ھ (فرمان مشروطیت) تک محدود رہے گا کیونکہ اس کے بعد ادب میں نیا تحول وجود میں آیا جسے نیا ایرانی ادب کہا جاتا ہے ۔ دورۂ قاجار کے بادشاہ فتح علی شاہ ، محمّد شاہ ، ناصر الدّین شاہ اور مظفر الدّین شاہ تھے ، اس دور میں حکومت کو کچھ استحکام حاصل ہوا. دربار قائم ہوئے ۔ علم و ادب کا چرچا ہوا - شعراء محمّد علی شاہ سے وابستہ ہوئے ۔ اسی زمانے میں شاہزادوں میں سے علی قلی میرزا ، اعتقاد السلطنة ، فرهاد میرزا ، عباس میرزا خود بھی علم دوست تھے اور شعر و سخن کے قدردان تھے ۔ وزراء میں میرزا تقی خان امیر کبیر ، میرزا حسین خان سپہ سالار ، محسن خان مشیر الدولہ اور امین الدولہ ایسے اشخاص تھے جنھیں ملك و ملت کی ترقی کا احساس تھا اور علوم و فنون کے احیا کا خیال تھا ۔

شاعری

صفوی دور میں سبك ہندی کے ردعمل میں دوبارہ سادہ واضح اور صریح لکھنے کی طرف توجہ ہوئی ۔ دقیقہ گوئی کے خلاف آواز اٹھی ۔ اصفہان کے چند شعراء مثلاً مشتاق اصفهانی،ہاتف ، آذر، صباحی وغیرہ نے قصیدہ غزل ، مثنوی میں قدیم شعراء کی پیروی کی ۔ رضا قلی ہدایت نے تجزیہ کرکے بتایا ہے کہ بعض شعراء نے خاقانی شیروانی اور عبدالواسع جبلی کی طرز پر مسجع و مقفی اور پرتکلف قصاید لکھے ۔ بعض نے فرخی اور منوچہری کی تقلید کی ۔ ایك گروہ نے رودکی اور قطران تبریزی کے شیوۂ سخن کو پسند کیا ۔ ایك جماعت نے عنصری ، مسعود سلمان اور ابو الفرج رونی کی پیروی کی ۔ فردوسی کے انداز پر رزمیہ اور نظامی کے اسلوب میں مثنویاں لکھیں ۔ اسی دورۂ بازگشت میں شعراء کا موضوع عموماً مدح ، پند و موعظت ، مرثیہ ، تاریخ ، بزم و رزم و مذہب ہے ۔ اس دور کے نامور شعراء حسب ذیل ہیں ۔

فتح علی خان صبای کاشانی (م - ۱۲۳۸ ھ) دیوان قصاید کے علاوہ اس کی مثنویاں شہنشاہ نامہ ، خداوند نامہ ، گلشن صبا اور عبرت نامہ مشہور ہیں ۔

محمّد سحاب اصفهانی (م - ۱۲۲۲ ھ) اس نے قصیدہ میں انوری اور خاقانی کا اتباع کیا ۔

سیّد حسین مجمر اصفهانی (م - ۱۲۲۵ھ) (غزل و قصیدہ)، عبدالوهاب نشاط

(م - ۱۲۴۴ھ) (غزل)، میرزا شفیع وصال شیرازی (م - ۱۲۶۲ ھ) (غزل، قصیدہ اور مثنوی) اس نے بزم وصال اور فرھاد و شیرین مثنویاں لکھیں ۔

میرزا حبیب قاآنی (م - ۱۲۷۰ ھ) قصیدہ میں موسیقیت پیدا کرنے میں نام پیدا کیا ۔ محمّد علی سروش اصفہانی (م - ۱۲۸۵ ھ) نے قصیدہ کے علاوہ اردیبہشت نامہ، ساقی نامہ ، اور الٰھی نامہ کے عنوان سے مثنویاں لکھیں ۔ ملک الشعراء محمود خان ماہر قصیدہ گو تھے ۔

قاآنی

حبیب اللّٰہ نام قاآنی ۱۲۲۲ ھ کو شیراز میں پیدا ہوئے ۔ قاآنی کے والد محمّد علی صاحب علم و فضل اور شاعر تھے ۔ گلشن تخلص کرتے ہیں ۔ دادا انجینئر تھے - قاآنی کے بڑے بھائی میرزا محب علی شیراز کے مشہور واعظ تھے ۔ چھوٹے بھائی میرزا اکبر بھی شاعر تھے ، ندیم تخلص کرتے تھے مگر لاابالی اور آزاد منش تھے ۔ باپ کی وفات کے بعد قاآنی تکمیل تعلیم کے لیے مشھد گئے ۔ جہاں انھوں نے صرف و نحو بیان و معانی و بدیع ، ھندسہ ، حساب و نجوم ، فقہ و اصول و تاریخ ، فلسفہ و حکمت ، اشعار عرب اور انشای نثر میں مہارت حاصل کی ۔ چھوٹی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیے تھے ۔ شہر بھر میں ان کا چرچا ہوا ۔ شاھزادہ شجاع السلطنت میرزا حسن علی نے ان کی قدر افزائی کی اور تعلیم مکمل کرنے میں مدد کی ۔

قاآنی نے محمّد شاہ قاجار کے دربار میں رسائی حاصل کی اور مجتھد الشعراء کا منصب ملا اور «حسان العجم» کا خطاب پایا- ۱۲۵۹ ھ سے ۱۲۶۲ھ تک شیراز میں رہے ۔ پھر تہران واپس گئے اور ناصر الدّین شاہ قاجار کے درباری شاعر مقرر ہوئے اور دوران قیام میں علی قلی میرزا اعتقاد السلطنۃ وزیر علوم و معارف کے الطاف و انعامات سے بھی بہرہ مند ہوئے ۔

قاآنی کی عائلی زندگی خوشگوار نہیں تھی ۔ دو بیویاں تھیں جن میں آئے دن چپقلش رہتی تھی ۔ ایک دفعہ گھر میں آگ لگنے سے سب کچھ تباہ ہوگیا ۔ قاآنی کی اولاد میں سے ایک فرزند محمّد حسن سامانی کا نام ملتا ہے ۔ جس نے دارالفنون میں سائنسی علوم کے علاوہ حکمت میں تعلیم حاصل کی ۔ شاعر بھی تھا چنانچہ باپ کی وفات کے بعد مختلف تقریبات کے موقع پر دربار میں اشعار پیش کرتا تھا ۔ ۲۹ سال کی عمر میں ۱۲۸۵ ھ کو فوت ہوا ۔

قاآنی ۱۲۷۰ ھ میں فوت ہوئے -

تصانیف

۱- دیوان
۲- پریشان در جواب گلستان سعدی
۳- گیاہ شناسی پر ایک کتاب کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا ـ

دیوان حکیم قاآنی جو محمّد جعفر محجوب کی کوشش سے شایع ہوا - اس میں قصاید، مسمطات ، ترکیب بند ، ترجیع بند ، غزلیات ، مثنویات ، قطعات اور رباعیات شامل ہیں ـ

قصاید کے علاوہ ترکیب بند ، ترجیعات اور قطعات بھی تقریباً مدحیہ کلام میں شامل ہیں . نعتیہ اور منقبت علی کے علاوہ اکثر قصاید سلاطین و امراء ، شاہزادگان کی مدح میں کہے گئے ہیں - ممدوحین میں نمایان محمّد شاہ قاجار ، ناصر الدّین شاہ قاجار ، شجاع السلطنۃ ، فریدون میرزا ، مھد علیا مادر ناصر الدّین شاہ ، صدر اعظم میرزا آقاسی ، قائم مقام اور امیر کبیر میرزا تقی خان ہیں ـ

قاآنی کو شاعری کا عجیب ملکہ حاصل تھا - تیز اور دراک ذہن پایا تھا - فوراً شعر کہہ جاتے تھے ان پر غور و فکر کرکے آرایش و پیرایش نہیں کرتے تھے - اسلئے ان کے کلام میں رطب و یابس شامل ہے - ملك الشعرا بہار نے کہا ہے :

قاآنی کے اشعار یا بہت اچھے ہیں یا بہت برے ہیں - الفاظ فصیح ، خوبصورت اور خوش آھنگ ہیں - مضمون و معنی دلکش یا مبتکر نہیں ـ

قاآنی کے کلام میں اس کی شتاب کاری اور سہل نگاری کی وجہ سے صرفی و عروضی غلطیاں موجود ہیں - قاعدے کے خلاف الفاظ بنا لیتا ہے - زاید حروف بڑھا لیتا ہے کبھی کبھی ایک بحر سے دوسری بحر میں داخل ہوجاتا ہے - اس کے کلام میں اطناب زیادہ ہے غیر ضروری تفاصیل داخل کرتا ہے ـ

قصاید کی تشابیب اکثر وصف بہار ، شب و روز ، شراب و شاہد ، سفر و رنج ، اور عید سے متعلق ہیں اور ان کو بالتکرار بیان کیا ہے اسی قسم کی تشبیب کا ایک نمونہ یہ ہے ـ

گاہ طرب و روز می و فصل بہارست جان خرم و دل فارغ و شاھد بہ کنارست
باد سحر از آتش گل مجمرہ سوزست خاك چمن از آب روان آئینہ دارست

بعض تشابیہ غیر حقیقی اور نامناسب ہیں مثلاً : گل نیلوفر = بختی مست نرگس = کفہ الماس - ساغر سیماب . مرغابی = بچۂ فیل خرطوم = پیشانی مار

قاآنی کے قصاید کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ مدح میں مبالغہ و اغراق سے کام لیتا ہے ۔ نہ صرف سلاطین کی مدح میں بلکہ اس کے خدمتگاروں کی مدح میں اس کا التزام کرتا ہے ۔ اپنی ستایش میں کوئی کمی نہیں کرتے ۔ مثلاً :

اینان تمام قطره و من بحر قلزمم اینان تمام ذره و من مهر خاورم
اینان ز تیرگی ظلمات و من کنون چون چشمۂ حیات به ظلمات اندرم

قاآنی نے اپنے آپ کو شاهسوار ، نیزه باز اسفندیار تن کہا ہے حالانکہ اس میں اس قسم کی جنگی خواص قطعاً موجود نہیں تھے ۔

مدح گو شعراء ممدوح کے زندہ ہونے تک ہی وفا شعار رہتے ہیں ۔ اور اس کی موت کے بعد اس کی ذم و قدح پر اتر آتے ہیں ۔ قاآنی کا بھی یہی حال ہے ۔ مثلاً اس نے قائم مقام کی مدح میں خوب مبالغہ کیا ہے مثلاً یہ شعر :

ای صدراستان ولیعهد کاستانت سبقت فرو پایه برین نه خیام گیرد

لیکن جب محمّد شاہ نے اسے قتل کردیا تو قاآنی نے بعد میں یوں کہا :

طناب در گلوی شیخ شهر باید بست روانه اش بر قائم مقام باید کرد

صدر اعظم میرزا آقاسی کی مدح میں تو اس نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں جب وہ معزول ہوا اور میرزا تقی خان نے اس کی جگہ لی تو قصیدے میں اس کی متعلق یوں لکھا ۔

بجای ظالمی شقی نشسته عادلی تقی که مومنان متقی کنند افتخار ما

مندرجہ بالا نقایص کے باوجود قاآنی فارسی زبان کا معروفترین قصیدہ گو شاعر ہے ۔ اسے زبان پر کمال تسلط حاصل ہے ۔ وہ فارسی، عربی، ترکی اور ہندی کے نا مانوس و متروک الفاظ بھی استعمال کر جاتا ہے ۔ اس کی طبیعت ایسی حاضر اور رواں ہے کہ وہ بالبداهت اشعار کہے جاتا ہے ۔ اس کا کلام گنجینۂ الفاظ و ترکیبات و اصطلاحات ہے ۔

قاآنی کو تشبیب میں دلپذیر مناظر بیان کرنے میں بھی کمال قدرت حاصل ہے ۔ وہ مجالس عیش و نشاط ، بزم شراب و رقص و سرود اور باغ و بہار کے رنگارنگ مناظر کی ایسی نقشہ کشی کرتا ہے کہ باید و شاید ۔ متقدم شعراء بہت کم ایسے مناظر کو چھو سکے ۔ مثلاً شیراز کے مرکز غوغا و فساد کو اس نے دقیق نظری سے بیان کیا ہے ۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے :

فتنه در شیراز چون مرد مجاور شد مقیم ایمنی از فارس چون شخص مسافر بست بار
شور و غوغا شد فراوان امن و سکوت گشت کم کفر و خذلان یافت رونق دین و ایمان گشت خوار
دیده ها از شرم خالی سینه ها از کینه پُر صدرها از غدر مملو چشم ها از خشم تار

صبح نمودار ہونے اور آفتاب نکلنے کا منظر :

خیمۂ زر بفت زد بر چرخ نیلی آفتاب از پرند نیلگون آویخت بس زرین طناب
بال بگشودم از پس شام سیه صبح سفید همچو سیمین شاهبازی از پی مشکین غراب

قاآنی نے مناظر جنگ بیان کرنے اور شجاعانہ کارنامے دکھانے میں بھی کمال مہارت کا ثبوت دیا ہے اور سلاست و طلاقت زبان سے پختہ و دلنشین اشعار کہتے ہیں۔ مثلاً ہرات میں محمّد شاہ کی لشکر کشی کے موقع پر مندرجہ ذیل قصیدہ :

سخن گزافہ چہ رانی ز خسروان کہن یکی ز شوکت شاہ جہان سرای سخن

حضرت علی (ع) کی منقبت میں ۳۳۹ اشعار پر مشتمل طویل ترین قصیدہ ہے۔ جس میں فتح خیبر کا تفصیلی ذکر اور آنحضرت کی شجاعت و بسالت کا بیان ہے۔ یہ قصیدہ شاعر کی قدرتی زبان و وسعت تخیل و مشاہدات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

سحر چو زمزمہ آغاز کرد مرغ سحر بسان مرغ سحر از طرب گشودم پر

قاآنی نے صنایع لفظی کو بڑی ہنرمندی سے استعمال کیا ہے - اور دیوان کے بیشتر اشعار پر جا بجا نظر آتی ہیں۔

تجنیس	:	بہار آمد کہ از گلبن همی بانگ هزار آید	بهر ساعت خروش مرغ زار از مرغزار آید
تنسیق الصفات	:	اکسیر فضل جوهر جان ، کیمیای عقل	رکن وجود رایت جود ، آیت هنر
تلمیحات	:	از لوم قدم تا نشود خستہ روح نوح	کی مستجاب گردد نفرین لاتذر
طباق و تضاد	:	بہ دهر دیدہ بسی سوگ و سور و سود و زیان	فراز و پست و نشاط و حلال و نفع و ضرر
استعارہ و تشبیہ	:	همای من ای باز طوطی تکلم	تذرو من ای کبک طاووس پیکر
		ماہ من ماند بسروار سرد جولان و داشتی	سرو من ماند بہ ماہ ار ماہ دستان داشتی

تذکرہ نگار و مؤرخ حبیب اللہ قاآنی کو حکیم بھی لکھتے ہیں جیسے مرتب دیوان نے بھی عنوان میں دیوان حکیم قاآنی لکھا ہے۔ اسی طرح مجدود کو بھی حکیم سنائی لکھتے ہیں۔ قاآنی نے اپنے قصاید میں خاص طور حضرت علی (ع) کی منقبت کے ابتدائیوں میں اپنی حکمت ، دانائی اور بصیرت کا مظاہرہ کیا ہے۔ احوال زمانہ پر تبصرہ کیا ہے۔ عوام و خواص کے اخلاقی و تہذیبی زوال و انحطاط پر گفتگو کی ہے اور پھر حکیمانہ نصیحتیں کی ہیں۔ جو عبرت آموز اور بصیرت افزا ہیں۔ انہی اشعار سے قاآنی کی علمی فضیلت و آگہی کا پتہ چلتا ہے۔ کلام کے اس گوشے کو اجاگر نہیں کیا گیا۔ ذیل کے چند اشعار سے یہ حقیقت واضح ہوگی :

بہ راہ صعب فنا در گذر نخست ز جان بہ بحر ژرف رضا بر شکن نخست ز سر
گرت سیاحت باید بهل اساس از بار ور سباحت باید بکن لباس از بر
مزن بہ گام هوس در طریق فقر قدم مکن بہ پای هوا در دیار عشق سفر
تو بد سگالی و نیکی طمع کنی هیهات ز خیر خیر تراوش نماید از شر شر
علوّ منزلت از نیستی بخواہ و مگوی کہ خط روح کی از نیستی شود اوفر

نگر به صفر که هیچست و در طریق حساب   اقل هر عدد از یارِیش شود اکثر

بعض قصاید میں عصر قاآنی پر روشنی پڑتی ہے ۔ احوال و کوائف زمان کے علاوہ لوگوں کے پیشوں اور ہنروں سے آشنائی ہوتی ہے ۔ ایک قطعہ میں وہ اپنا حال بیان کرتا ہوا مندرجہ ذیل اہل فن کا ذکر کرتا ہے :

میر ، وزیر ، سالار ، قاید و شیخ ، ضابط ، بگلر بیگی ، دزدگیر ، کد خدا ، شحنه ، محتسب ، مفتی نواب ، بواب ، مرده شو ، گوره کن ، کفن نویس ۔ ذکر خوان ، تاجر ، بقال ، نقال ، شعرباف ، صباغ ، موزه دوز ، دباغ ، کاسه گر ، کاسه فروش ، کیسه بر ، راه نشین ، قلندر ، تیغ ساز، تیغ باز، مہتر قبیله ، شانه بین ، ماسه کش ، فالگیر ، سیمیا نگار ، رمال ، قاضی ، واعظ ، مفتی ، روضه خوان ، قناد ، عطار ، فصاد ، نساج ، معمار و سلاخ ۔

قاآنی نے اپنے بعض قصاید میں نیشاپور ، ری ، شیراز اور ایک تصویر کی تعریف و توصیف میں ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے ۔ اور وصفیه نگاری کا اعجاز دکھایا ہے ۔ یادداشت کے لیے ان قصاید کا ایک ایک شعر نقل کیا جاتا ہے :

حبــذا از هــوای نیشــاپور   که بود مـایهٔ نشـاط ما و سـرور

تبارك الله از فارس آن خجسته دیار   که می نبیند چون آن دیار یك دیار

آفرین بر کلك سحر انگیز آن صورت نگار   کز مہارت برده معنیها درین صورت بکار

کچھ قصاید میں ہزل و مطایبه کے عنوان سے بعض ایسی غلیظ باتیں بیان کی ہیں که انہوں نے قاآنی کی فکری عظمت و پاکیزگی کو ناپاك کر دیا ہے ۔

ملك الشعراء بہار نے سبك قاآنی کے متعلق تشخیص کرکے بتایا ہے که وه پہلے سبك خراسانی کی پیروی یعنی عنصری، فرخی اور منوچہری کے انداز میں قصاید لکھتا تھا ۔ بعد میں سبك عراقی کی طرف متوجه ہوگیا ۔ جب کلام میں پختگی آئی تو پھر اپنا سبك نکال لیا یعنی خراسانی اور عراقی کے بین بین نئے طرز و اسلوب میں لکھنے لگا ۔

قاآنی الفاظ کی غنائیت سے خوب آشنا ہے ۔ ایک تو وه بحور بھی موسیقی سے ہم آہنگ ہونے والی انتخاب کرتا ہے۔ دوسرے حروف کی تکرار سے ترنم پیدا کرتا ہے۔ اشعار میں آوازوں کے زیرویم سے معلوم ہوتا ہے که دمادم ساز بج رہے ہیں ۔ مثال کے طور پر مندرجه ذیل دو شعر دیکھیے جن میں «ت» اور « خ » کی تکرار سے ترنم پیدا کیا ہے ۔

فراز خاک وخشتها ، دمیده سبز کشتها چه کشتها بهشتها نه ده نه صد هزارها
زنای خویش تافته دو صد اصول ساخته ترانها نواخته چو زیروبم تارها

نثر

قاجاری دور کے آغاز میں پر تصنع اسلوب جاری رہا - منشآت نشاط اور منشآت فاضل گروسی اسی قبیلہ کے نثری نمونے ہیں ۔ میرزا قائم مقام فراهانی نے مکتوب نویسی میں نرمی و ملائمت پیدا کی اور زبان کو عوام فہم بنانے کی کوشش کی ۔ صنایع لفظی کو اعتدال سے استعمال کیا ۔

سلاطین قاجار نے ایران کی تاریخ مرتب کرانے اور رجال ایران کے تذکرے تألیف کرانے میں سرپرستی کی چنانچہ مندرجہ ذیل مبسوط کتابیں مرتب ہوئیں ۔

ناسخ التواریخ (۱۵ جلد) ۔
جام جم از فرهاد میرزا ۔
آئینہ اسکندری از آقا خان کرمانی ۔
منتظم ناصری اور مرآة البلدان از حسن خان فصیح الدوله ۔
حدایق جهاں ۔
تاریخ و جغرافیای تبریز ۔

تذکرے

ریاض العارفین اور مجمع الفصحاء از رضا قلی هدایت ۔

نامۂ دانشوران ، نجوم السماء (تذکرہ علمای شیعه) روضات الجنات فی احوال العلماء و السادات ، قصص العلماء ، تذکرۂ خطاطین ، گنج دانش ، بستان السیاحت ۔

قاجاری دَور میں زبان میں بھی ایک تحول و انقلاب رونما ہوا ۔ ایران یورپی تمدن سے آشنا ہوا ۔ انگریزی اور فرانسیسی زبانیں سیکھنے کے لیے مدارس قائم ہوئے - دارالفنون کے قیام سے یورپ کے نئے علوم سے آشنائی ہوئی ۔ چھاپہ خانہ شروع ہوا ۔ اخبار چھپنے لگے ۔ انگریزی اور فرانسیسی کتابوں کے ترجمے ہوئے اور مغربی ادب کا تعارف ہوا ۔ مطلق العنان بادشاہوں کے خلاف تحریک چلی ۔ مشروطیت کیلئے جدوجهد ہوئی ۔ بیرون ملک رسائل و جراید کا اجرا ہوا ۔ نئے علوم و فنون کے اظہار کے لیے علمی و تفہیمی زبان کا رواج ہوا- افسانہ ، ناول اور ڈرامہ شروع ہوا ۔ اور عوامی زبان لکھنے کو پسند کیا گیا ۔ ان تمام تبدیلیوں کے زیر اثر مندرجہ ذیل کتابیں لکھی گئیں :

ناول

حاجی بابا اصفہانی ترجمہ از مرزا حبیب اصفہانی ، سیاحت نامۂ ابراھیم بیگ از زین العابدین ۔

ڈراما

فتح علی اخوند زادہ کے ڈراموں کا ترجمہ جعفر علی قراجہ داغی نے کیا ۔

سفرنامہ

سفرنامہ ناصر الدّین شاہ قاجار، سفرنامہ مظفر الدّین شاہ، کتاب احمد اور مسالك المحسنین از عبدالرحیم طالبوف، ترجمہ الف لیلہ و لیلہ از میر عبداللطیف طسوجی ۔

نثری ادب

منشآت قائمقام

منشآت قائمقام کے مصنف ابوالقاسم قائم مقام ۱۱۹۳م میں پیدا ہوئے ۔ ان کی اپنے والد عباس مرزا کے توسط سے نائب السلطنت کے دربار میں آمد و رفت تھی ۔ والد کی عزلت گزینی کے بعد قائم مقام، شہزادہ کے پیش کار مقرر ہوئے ۔ وہ سفارتی امور طے کرنے کیلئے روس بھی گئے ۔ انہوں نے محمّد مرزا کو تخت و تاج دلانے کیلئے بھی نہایت اہم خدمات انجام دیں ۔ لیکن بعد میں ان کی خدمت کا یہ صلہ ملا کہ ان کا گلا گھونٹ کر ۱۲۵۱م میں ہلاك کر دیا گیا ۔ ابوالقاسم قائم مقام شعر بھی موزوں کر لیتے تھے ۔ اور نثر میں بھی ان کا مرتبہ بہت بلند تھا ۔ قائم مقام کی یادگار کتاب « منشآت قائم مقام » کے نام سے شایع ہوچکی ہے ۔ جس کے مشمولات حسب ذیل ہیں :

۱- نامہ ھای دوستانہ ۔ ۲- نامہ ھای کہ بہ امیرزادگان نوشتہ است ۔ ۳- دیباچہ ھا ۔
۴- رسالات ۔ ۵- عربیات ۔ ۶- رقمہای حکومتی ۔ ۷- نامہ ھای خانوادگی ۔

اس کے بعض صفحات معتمد الدولہ کے خطوط کی وضاحت کے لحاظ سے بہت مفید نظر آتے ہیں ۔

اسلوب نگارش

ابو القاسم قائم مقام نے اپنے فطری ذوق اور حسن سلیقہ سے ایك نئے اسلوب کی بنیاد رکھی ۔ چھوٹے چھوٹے جملے لکھے ۔ مترادفات کو کم کیا ۔ خط و کتابت میں زائد القاب اور بے جا تعریفوں کو حذف کیا ۔

مصنف کی عبارات سے پتہ چلتا ہے ۔ کہ وہ «تعلیل » کو حذف کرتا ہے ۔ «را » علامت مفعول کو زیادہ استعمال نہیں کرتا ۔ غیر جانداروں کی علامت جمع کو جانداروں کیلئے بھی استعمال کرتا ہے ۔ مثال کے طور پر « نوکرها » اور « آدم ها » وغیرہ ۔ غیر جانداروں کے لیے جمع کا صیغہ لاتا ہے ۔ دوسرے مصنف ابوالقاسم قائم مقام کی تقلید کی طرف مائل ہیں ۔ شیخ احمد روحی نے ابوالقاسم قائم مقام کے زیر اثر کتابیں لکھیں ۔

عہد قاجار میں نثر نویسی میں تحول اور انقلاب معاشرت کے لیے کوشش

تین ایسے مصنف ہیں جنہوں نے معاشرے میں موجود برائیوں کو اجاگر کیا اور ان کی اصلاح کے لیے شعور پیدا کیا ۔

١ - عبدالرحیم طالبوف

١٢٥٥م کو تبریز میں پیدا ہوئے ۔ سولہ سترہ سال کی عمر میں تفلیس چلے گئے ۔ روسی زبان سیکھی . اس کی ادبیات کا مطالعہ کیا ۔ بعد میں قفقاز گئے . اور داغستان کے مرکز حکومت دمیرخان شوارا میں مقیم ہوگئے ۔ ١٣٢٩/١٣٢٨ هـ میں فوت ہوئے ۔ آزادی خواهی اور مشروطه طلبی کے حامی تھے اور اصلاح معاشرہ کے مخلص داعی ۔ ان کی تألیفات استانبول ، مصر اور قفقاز میں شایع ہوئیں ۔

١- سفینۂ طالبی یا کتاب احمد - دو جلدوں میں، ان میں مسائل زندگی ، اطلاعات و اکتشافات مکالمہ کی صورت میں کیے گئے ہیں ۔

٢- مسالك المحسنين ۔ سفر نامه خیالی ، ملك و ملت سے متعلق ہر قسم کے احوال و کوائف عمدہ اور دلچسپ زبان میں بیان کیے گئے ہیں ۔

٣- مسائل الحیات ۔ مقروضی . بیٹے احمد کے ساتھ سیاسی ، اجتماعی اور قانونی مسائل پر گفتگو کی ہے ۔ مشروطیت پر بھی روشنی ڈالی ہے ۔

۴- پند نامه مارکوس قیصر روم ، روسی سے فارسی میں ترجمہ ۔

۵- رساله فیزیك ۔

۶- نخبۂ سپهری ۔ خلاصه ناسخ التواریخ در احوال رسول اکرم (ص) .

٧- رساله هیأت جدید ، روسی سے فارسی میں ترجمہ ۔

٨- ایضاحات - اس میں معنی آزادی ، مجلس شورای ملی ، نمایندگان ملت اور قوانین سے بحث کی گئی ہے ۔

٢- زین العابدین مراغه ای

١٢٥٥ کو بنی مشهدی علی کے ہاں مراغه میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرکے

آوارگی اور بے راہروی کی زندگی گزاری ۔ پھر تفلیس چلے گئے ۔ وہاں ایران کے نائب کونسلر ہوگئے ۔ اپنی کمائی وطن کے مہاجرین پر خرچ کی اور مفلس ہوگئے ۔ پھر بھائیوں کے ساتھ مل کر تجارت شروع کی ۔ روسی شہریت قبول کرلی ۔ استانبول میں جا کر شادی کی اور یالٹا میں آرام و راحت کی زندگی گزاری ۔ بعد میں حج کیا ۔ روسی شہریت چھوڑ کر دوبارہ ایرانی شہریت حاصل کی ۔ ترکی میں مقیم رہے ۔ وطن کی خدمت کیلئے شوق و اخلاص سے کوشاں رہے ۔ ۱۳۲۸ میں وہیں انتقال کیا ۔

زین العابدین کی ایک کتاب « سیاحت نامۂ ابراهیم بیگ » تین جلدوں میں شایع ہوئی یہ ایک قسم کی ہجویہ ہے جس میں ایرانیوں کے ناپسندیدہ اخلاق و عادات کی تصویر کشی کی گئی ہے ۔ ادبی اور اجتماعی حلقوں میں بہت مؤثر رہی ۔

۳- مرزا ملکم خان

مرزا ملکم خان اصفهان کے ایک ارمنی قصبہ میں ۱۲۴۹ ھ میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد مرزا یعقوب خان نے جوانی میں بیرونی ممالک کا سفر کیا تھا اور فرانسیسی اور روسی زبانوں کو اچھی طرح جانتے تھے اور دنیا کے نئے تحولات سے بھی آشنا ہو چکے تھے ۔ وہ تہران میں روسی سفارت کے ترجمان بھی تھے اور ظل السلطان اور دوسرے شہزادوں کو فرانسیسی بھی پڑھاتے تھے ۔ اس لئے وہ اپنے گھر والوں کے ہمراہ تہران میں آ ٹھہرے۔ ملکم ان کا خاندانی نام تھا-

مرزا ملکم بچپن سے فرانس گئے اور ابتدائی اور متوسط تعلیم حاصل کرکے پیرس کے پولی ٹکنیک مدرسہ عالی میں تحصیلات کی تکمیل کی ۔ ایران آئے تو مدرسہ دارالفنون میں یورپین استادوں کی ترجمانی اور جغرافیا اور علوم مقدماتی کی تدریس کا کام سپرد ہوا ۔ انہوں نے قصر شاہی اور دارالفنون کے درمیان تار کا سلسلہ قائم کرنے میں مدد دی اور بادشاہ اور وزیر اعظم کی نظروں میں مقبول ہوئے ۔ بعد میں مدرسی کے علاوہ مترجم اور مستشار بھی ہوگئے اور سیاسی و اصلاحی امور میں مشورے دیتے رہے ۔

جب انگریزوں اور ایرانیوں کے درمیان جنگ ہرات کے موقع پر اختلاف ہوا اور پیرس میں صلح کانفرس ہوئی تو ملکم مترجم اور مستشار کی حیثیت سے ایرانی وفد کے ہمراہ گئے اور عمدہ خدمات انجام دیں ۔ ۱۲۸۸ ھ میں ترکمانوں کے ہاتھوں مرو میں شکست ہوئی اور ملکم نے اس شکست کی ذمہ داری مرزا محمّد حسین خان سپہ سالار پر ڈالی ۔

تو ان کو مصلحت کی بنا پر ترکی میں بھیج دیا گیا ۔ کچھ عرصہ کے لئے جنرل کونسل بھی ہو کر گئے اسی سال مرزا حسین جو اسلامبول میں ایران کے سفیر کبیر تھے ۔ تہران آئے اور وزیر سے ترقی کرکے صدر اعظم بنے تو ملکم کو بھی ترکی سے بلا لیا ۔ یہاں انہیں پھر تنظیمی امور مملکت میں اصلاح کا موقعہ ملا ۔ جب ناصر الدّین شاہ یورپ کے سفر پر روانہ ہوئے تو ملکم کو لندن میں وزیر مختار بنا کر بھیجا تا کہ وہ استقبال کے انتظامات کرائے ۔ ۱۲۹۵ میں برلن کنگرس میں ایران کی نمائندگی کی اور اپنی کارکردگی اور موقع شناسی کی وجہ سے ترکوں سے قطور کا علاقہ واپس لینے میں کامیاب ہوگئے ۔ بادشاہ نے ان کو سفیر کبیر بنا کر جناب اشرف اور پرنس کا لقب استعمال کرنے کی اجازت دی ۔ دوسرے سفر میں جب بادشاہ کو روپیہ کی ضرورت پڑی تو اس نے بیرن جولیس رایٹر کو بنك قائم کرنے اور ریلوے لائن بنانے کا اجارہ دلادیا۔ اس سے قومی اقتصادیات اور وقار کو بہت نقصان پہنچا ۔ مخالفین نے اس کام میں ملکم کا ہاتھ سمجھا ۔ تیسری مرتبہ جب بادشاہ انگلستان میں گیا تو ملکم نے بادشاہ کو کچھ رقم پیش کرکے لوٹری چلانے کا اجارہ حاصل کر لیا ۔ ایران میں پہنچ کر ملکم کے مخالفین نے علماء سے فتوی حاصل کرکے اجارہ کو فسخ کرادیا - لیکن ملکم نے اس سے پہلے ہی ایك انگریز کے ہاتھ اس کو فروخت کر دیا تھا ۔ امین السلطان اور دوسرے برسرکار درباریوں نے مل کر ملکم خان کو سفارت کبری کے عہدہ سے معزول کرادیا ۔

عہدہ سے برطرفی کے بعد ملکم نے « قانون » کے نام سے اخبار جاری کیا اور اپنی حیثیت عرفی کے دفاع اور ایران میں اصلاحات کے لئے مقالات لکھے ۔ سیّد جمال الدّین اسد آبادی بھی ایران سے جلاوطن ہو کر اس کے پاس پہنچے اور اس کے ساتھ شریك ہوئے چار سال تك یہ پرچہ مقبول ہوا اور ایران میں داخلہ کی ممانعت کے باوجود چوری چوری پڑھا جاتا تھا ۔

ناصر الدّین شاہ کے قتل کے بعد امین السلطان بھی صدارت سے معزول ہوئے اور مرزا ملکم کے دوست امین الدولہ صدر اعظم ہوئے اور مظفر الدّین شاہ کے حکم سے مرزا ملکم روم میں ایران کے وزیر مختار مقرر ہوئے ۔ آخر ۱۳۲۶ ھ میں ضعف پیری اور بیماریوں کی وجہ سے سوئٹزز لینڈ میں وفات پائی ۔

مرزا ملکم نے اگرچہ مشروطہ طلبوں اور آزادی خواہوں کے ساتھ شریك ہو کر خدمات انجام نہیں دیں لیکن ایرانی ان کی تحریروں اور ان کے افکار سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے ۔ قانونی اصلاحات کے بارے میں ان کے دو رسالے « کتابچۂ غیبی » اور « دفتر قانون » آخر کار نئی حکومت اور قانون وضع کرنے والوں کے لئے مشعل ہدایت ثابت ہوئے۔

ان کی معلومات ہمہ گیر تھیں ۔ ونفیلڈبلنٹ نے ان کے متعلق لکھا کہ وہ ایران کی ایک بزرگ شخصیت تھی جسے شرق و غرب کے افکار و عقاید سے واقفیت تھی ۔

تصانیف و تألیفات

کلیات رسائل جوان کی زندگی میں ایک مرتبہ تہران میں اور بعد میں تبریز میں شائع ہوئے ۔ ان میں مندرجہ ذیل گیارہ رسالے شامل تھے :

اصول تمدن ، حرفِ غریب،رسالۂ غیبیہ ، رفیق و وزیر ، شیخ وزیر ، پولتیکی های دولتی ، تنظیم لشکر و مجلس اداره ، سیاحی گوید ، اصول آدمیت ، توفیق امانت ، اصول مذہب دیوانیان ، محمّد طباطبائی نے ان کی تمام تصانیف کو اکٹھا کر کے نئے سرے سے ترتیب دیا ہے :

۱- جلد اوّل :

وہ رسائل جو اصلاح مملکت اور تنظیم قانون کے متعلق ہیں ۔

کتاب خانۂ غیبی یا دفتر تنظیمات ، رفیق وزیر ، دستگاه دیوان ، انتظام لشکر و مجلس تنظیمات ، دفتر قانون ، نوم و یقظه ، منافع آزادی ، کلمات متخیله ، حریت ، اشتہار نامه ، اشتہار نامه اولیای آدمیت ، راجع باستقراض خارجی ، ندائے عدالت اور رساله غیبیه ۔

۲- جلد دوم :

آثار سیاسی ۔ ترجمه وصیت نامه فواد پاشا ، تسخیر مرو و ترکمان ، سیاستهائی دولتی ۔

۳- جلد سوم :

آثار اقتصادی ۔ حرف غریب ، تأسیس بانك ، صورت مذاکرات ، مجلس شوری ، دولتی در باب بانك ، اصول تمدن ۔

۴- جلد چهارم :

آثار انتقادی ۔ مسائل عامه ، چهار چشمان ، مرأت البلهاء ، اصول مذہب دیوانیاں ، سوال و جواب دولتی ۔

۵- تین تمثیلیں

مرزا ملکم خان کو دارالفنون میں یورپی اساتذہ کی ترجمانی اور نئے علوم کی تدریس میں نہایت احتیاط سے الفاظ کا انتخاب کرنا پڑا اور اپنی تحریروں میں آسان و سادہ الفاظ استعمال کرتے ۔ جملوں کی بندش اس طرح کرتے کہ مضمون صراحت سے بیان

ہوجائے بعد میں انہیں اس خاص اسلوب میں خوب مہارت ہوگئی ۔ انہوں نے سرکاری مراسلات میں میانہ روی اختیار کی اور مرزا تقی خان اور قائم مقام کی تقلید میں منشیانہ تکلفات سے عاری نثر لکھنے کو تقویت دی ۔ قانون کے مقالات اور دیگر رسائل کے اسلوب نگارش کا بھی مفید اثر ہوا ۔ ایران میں صور اسرافیل ، حبل المتین ، ترقی ، تمدن اور معارف نے بھی اس کے اسلوب کو پسند کیا ۔

سیاسی ، اجتماعی اور قانونی مضامین کے اظہار کے لئے ان کی نثر سادہ روان اور فصیح ہے ۔ قانونی اصطلاحات اور رسمی عبارتوں کے لکھنے میں اکثر پرتکلف الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں اور مضمون کے مبہم ہوجانے کا اندیشہ رہتا ہے ۔ مرزا ملکم خان کا کمال سمجھئے کہ ان کے تخیل میں پچیدگی نہیں اور انہوں نے مشکل سے مشکل مسئلہ کو وضاحت سے ادا کیا ہے ۔ اس زمانے میں‌جب کہ نثر کی موجودہ روش عام نہیں ہوئی تھی اور اصطلاحات بھی وضع نہیں ہوئی تھیں قانونی اور سیاسی موضوعات پر لکھنا دشوار تھا لیکن ملکم نے اس مشکل کو آسان کیا ۔ اس لئے نثر کے تحول و تکامل میں ان کے طرز نگارش کو خاص امتیاز حاصل ہے ۔

ڈرامے انہوں نے فتح علی اخوند زادہ کی تقلید میں لکھے تھے اور ان کی نقل بھی اس کو بھیجی تھی ۔ موضوع بھی اس کے ڈراموں سے ملتا جلتا ہے ۔ دونوں کا مقصود سیاسی اور اجتماعی اصلاح تھا ۔ فتح علی کے ڈرامے زیادہ مقبول ہوئے ۔ مرزا جعفر علی نے عوامانہ زبان میں ترجمہ کرکے ان کی مقبولیت میں اضافہ کیا اور زبان کی بھی اہم خدمت انجام دی ۔ ایران میں تھیٹر شروع ہونے سے پہلے مرزا ملکم ہی ایسے شخص ہیں جنہوں نے فتح علی کے بعد طبع زاد ڈرامے لکھے اگرچہ ان کے اسٹیج ہونے کی نوبت نہیں آئی ، لیکن ڈرامہ نگاری کے ارتقاء میں ان کا ذکر آنا ضروری ہے ۔ مکالموں کے لحاظ سے طرز نگارش بھی اہمیت رکھتی ہے ۔

اخبار نویسی

ایران میں سب سے پہلا فارسی اخبار (روزنامہ) رمضان ۱۲۵۲ ھ میں میرزا صالح شیرازی کی ادارت میں شایع ہوا ۔ اس کے بعد وقفے وقفے کے بعد اخبار شایع ہوتے رہے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے :

روزنامۂ وقایع اتفاقیہ ۔ میرزا تقی خان امیر کبیر کی سرپرستی میں ۵ ربیع الثانی ۱۲۶۷ ھ کو شایع ہوا اور دس سال تک جاری رہا ۔

روزنامۂ دولت علیّہ ایران ۔ ۱۲۷۷ سے ۱۲۸۸ھ تک شایع ہوتا رہا ۔

روزنامۂ سنیّہ ایران ۔ محرم ۱۲۸۲ سے ۱۲۸۷ھ تك کل ۳۲ شمارے شایع ہوئے ۔
روزنامۂ دولت ایران ۔ محمّد محسن خان صنیع الدولہ کی ادارت میں ۱۲۸۸ھ سے شروع ہوا اور ۱۳۲۱ھ تك مختلف مدیروں کی ادارت میں شایع ہوتا رہا ۔
روزنامۂ رسمی ایران ۔ ۱۲۶۷ سے ۱۳۲۴ھ تك جاری رہا ۔
روزنامۂ نظامی علمیہ و ادبیہ ایران ۔ ۱۲۹۳ سے ۱۲۹۶ھ تك شایع ہوتا رہا ۔
روزنامۂ دانش ۔ علی قلی خان مخبر الدولہ نے دارالفنون سے جاری کیا ۔ ۱۲۹۹ھ سے ۱۳۰۰ تك ۱۴ شمارے نکلے ۔ مہینے میں دو شمارے نکلتے تھے ۔
روزنامۂ شرف ۔ محمّد حسن خان اعتماد السلطنة نے ۱۳۰۰ھ سے شروع کیا اور ۱۳۰۹ تك جاری رہا ۔
روزنامۂ شرافت ۔ ۱۳۱۴ میں محمّد باقر خان کی ادارت میں شایع ہوا ۔
تربیت ۔ مرزا محمّد حسین فروغی کی ادارت میں ۱۳۱۴سے ۱۳۲۵ھ تك شایع ہوا ۔ یہ ہفت روزہ تھا ، ۴۳۴ شمارے نکلے ۔
خلاصة الحوادث یومیہ ایران ۱۳۱۶ھ سے شروع ہوا ۔ ہفتے میں پانچ دن نکلتا تھا ۔ ۱۳۲۱ھ تك ۹۹۰ شمارے نکلے ۔
تہران کے علاوہ دوسرے شہروں سے بھی اخبار شایع ہوتے رہے ۔ مثلاً :
تبریز سے روزنامۂ ملتی ۱۲۷۵ھ میں ، روزنامۂ تبریز ۱۲۷۵ھ میں ۔
الحدید ۱۳۱۵ میں ، احتیاج ۱۳۱۵ھ میں،ادب ۱۳۱۶ھ میں ، کمال ۱۳۱۷ھ میں شایع ہوئے ۔ ان کے علاوہ آزاد ، اتحاد ، اخوت ، ابلاغ ، مجاھد اور حشرات الارض کے نام لیے جاتے ہیں ۔
شیراز میں روزنامۂ فارس ۱۲۸۹ میں ۔
اصفھان میں روزنامۂ فرھنگ ۱۲۹۶ میں شایع ہوا ۔

ڈراما

ڈراما جذبات و احساسات کا فطری اظہار ہے اس لئے دوسرے ممالك کی طرح ایران میں بھی اس کے اظہار کی کہیں نہ کہیں صورت نظر آتی ہے ۔ اسلام کا مزاج ڈرامہ کو راس نہیں آتا ۔ اس لئے مسلمانوں کے ابتدائی عہد سلطنت میں ڈرامہ کی کوئی واضح شکل دکھائی نہیں دیتی ۔ مسلمان علماء نے جہاں یونانی علوم کو اپنایا اور فلسفہ، طب اور قانون کی شہرہ آفاق کتابوں کے ترجمے کئے وہاں ہومر ، یوری پیڈیز ، ایسکلیز ، ارسٹوفین ،

سوفو کلیز کے ڈراموں اور ارسطو کے فن ڈرامہ اور فن تنقید و شعر کو نظر انداز کردیا۔ لیکن انفرادی ڈرامہ کی شکلیں ادبی و تفریحی مجالس میں موجود رہیں ۔ ایك شخص نے جسے جذبات و احساسات کو اپنے اوپر طاری کرنے اور اس کے اظہار کا خاص ملکہ حاصل ہوتا ۔ وہ رجز کے اشعار پڑھنے میں بہادری ، تندی و غضب کے جذبات کا اظہار اپنے اعضاء کی حرکات اور چہرے پر تغیرات سے کرتا ۔ اسی طرح مرثیہ کے اشعار پڑھنے سے غم و الم ، افسردگی و ماتم کی کیفیات اپنی آواز کے زیروبم اور صورت کی خارجی حالت سے اظہار کرتا - ایران میں قصّہ خوان کی ایك شخصیت نظر آتی ہے جسے ہم مجسم ڈرامہ کہتے ہیں ۔ یہ شخص قہوہ خانوں میں بیاہ شادی اور دوسری تفریحی مجالس میں اپنے فن کے کمالات دکھاتا ہے ۔ کبھی سپاہی کی طرح مسلح اور کبھی درویش کی طرح خرقہ پوش ہو کر قصّہ بیان کرتا اور کردار افسانہ کی ہو بہو تصویر بن کر واقعات قصّہ کو اسی انداز میں پیش کرتا کہ حاضرین مبہوت ہوکر اس کو سنتے اور محظوظ ہوتے ۔ قصّہ خوان کے علاوہ ایك شاہنامہ خوان بھی ہے جو اپنی سحر بیانی اور موزوں حرکات سے سامعین کو اس قدر مسحورکرتا تھا کہ جان مطلب کو ناتمام چھوڑ کر ان سے پیسے بٹورتا تھا ۔ اور کہانی کو دوسرے وقت پر ملتوی کرتا تھا ۔ شاھنامہ میں سے سہراب کشی کی داستان اس قدر پُر تأثیر انداز میں بیان کرتا تھا کہ لوگ اس کو معقول رقم ادا کرنے پر تیار ہو جاتے تھے تا کہ وہ سہراب کو مرتے نہ دیکھ سکیں ۔ کل عنایت یا کچل عنایت ، شاہ عباس صفوی کا ندیم اور بازیگر اپنے اس فن میں استاد تھا ۔ اشارات اور بدن کی حرکات سے واقعات کو اس طرح بیان کرتا کہ لوگ ہنسنے پر مجبور ہو جاتے ۔ اس کی چند ایك نقلیں مشہور ہیں جو اس نے خود سٹیج کیں مثلاً :

دایر کردن دکه کرباس فروشی ، کلك چیدن برای نجات جان محافظ باز شاه اور مداوای چشم .

اسی قبیل کے اشخاص میں سے ناصر الدّین شاہ کے بذلہ گو ندیم کریم شیرہ ای کا نام لیا جاسکتا ہے ۔ اس کو اپنے آزمودہ کار شاگردوں ، اشکی ماسی اور چوروکی کے ساتھ بادشاہ کے حضور کھیل دکھانے کا موقع مل جاتا اور وہ کھیل کے درمیان اراکین سلطنت پر بھی نکتہ چینی کرجاتا ۔ اس آزاد کلامی کی وجہ سے اسے بڑا رسوخ اور احترام حاصل تھا۔

رفتہ رفتہ قصّہ گویوں کی ارتقائی صورت یہ ہوئی کہ مختلف کھیل تماشا جاننے والوں کی ٹولیاں بن گیئں ۔ بعینہ جیسے ہمارے ملك میں نقال ۔ بھانڈ اور رہس دھارئیے ہوتے تھے ۔ یہ لوگ خاص تقریبوں پر کہانیوں کو ڈرامہ کی صورت میں پیش کرتے اور اپنی

اجرت وصول کرتے ۔ یہ لوگ اپنے چہروں کو رنگ و سفوف سے آراستہ کرتے اور رنگ برنگ لباس پہنتے .کھیل کے وقفوں میں رقص اور بازیگروں کے کرتب دکھاتے۔ کھیل اکثر مختصر ہوتے لیکن ساز و آہنگ کی ہم نوائی سے خوب لطف رہتا ۔ ناچنے والے لڑکے لڑکیوں کا لباس پہن کر سامنے آتے تو حاضرین کی دلچسپی کا اور بھی سامان ہو جاتا ۔

عام نقلوں یا کھیلوں میں ایک خاص جگہ پر درمیان میں سٹیج یا چبوترہ بناتے ، اس کے چاروں طرف تماشا دیکھنے والے بیٹھتے ۔ تماشاگر سٹیج پر آتے اور اپنا اپنا کردار ادا کرتے ، کبھی کبھی ماہر ایکٹر موقع کے مطابق اور دلچسپ باتتں بھی کر جاتے ۔ حاضرین پر فقرے کستے ۔ بعض ناشائستہ اور فحش کلمات سے خاطر تواضع بھی کرتے اور مجلس کو گرما دیتے یہ ٹولیاں شہر شہر اور گاؤں گاؤں پھرتیں اور اپنی روزی کا سامان پیدا کرتیں ۔ ان کھیل تماشوں میں عوام زیادہ حصّہ لیتے ۔ ایکٹر بھی ادنی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور لوطی و بازیگر کہلاتے تھے ۔ اس لئے ان کی نقلوں میں بھی ابتذال پایا جاتا تھا ۔ ہمارے ہاں بھی ایسی نقلیں کرنے والے میراسی اور بھانڈ کہلائے - یہ کھیل کامیڈی یا طربیہ کی ایک صورت تھی جو ہنسنے ہنسانے اور تفریح و مزاح کے کام آتی تھی اسے محض فارس یا نقل کا درجہ دیا جاتا ہے ۔

عوام میں ڈرامہ کی ایک سلجھی ہوئی شکل بھی مرغوب تھی ۔ ہنسنے ہنسانے والے مسخرے یا بھانڈ بیاہ شادی کی محفلوں کو گرمانے کے لئے چھوٹے چھوٹے کھیلوں کی نقلیں کرتے تھے ۔ ان میں اجتماعی اخلاقی قسم کے مضامین بھی ہوتے تھے ۔ جن کو شوخی اور مذاق کے رنگ میں پیش کیا جاتا تھا ۔ ان کھیلوں میں سے پہلوان کچل یا پہلوان پنبہ ۔ عروس ہالو ، خالو ردرد ، چہار صندوق اور طبیب کاشی موجود ہیں ۔ مثلاً عروس ہالو کا قصّہ یوں ہے ۔ ایک شخص نے خوبصورت عورت سے بیاہ کیا ہے لیکن وہ زن داری کے آداب و اطوار سے واقف نہیں ۔ دو اوباش کاجاما اور کاتاما یعنی کاکاجاماسب اور کاماطہماسب اس کی بے خبری سے فائدہ اٹھا کر اس کو الّو بنانا چاہتے ہیں ۔ ایک صاحب سالمندر ہیں . (سالمندر + آر) اور ایک ان کے شاگرد (صحیح معنوں میں یہی کھیل کی جان) اپنی عیاری طراری اور عجیب و غریب حرکات سے کاجاما اور کاتاما کا مقابلہ کرتے ہیں اور اپنے آپ کو عورتوں کے لباس میں ظاہر کرکے ان دونوں شخصوں کا مذاق اڑاتے ہیں ۔ جنھوں نے بیاہتا عورتوں کی طرف نظر بد لگا رکھی ہے ۔ وہ رقص و سرود ، اشعار اور دوسری تقریروں سے عوام کو ان کے عیوب سمجھاتے ہیں اور محفل کو گرم کرتے ہیں اس قسم کے ہنربازوں میں سے حسن کلاہ دوز،علی ترکہ اور

حاجی لرہ وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں ۔

ان تماشوں کے ساتھ ساتھ رونے رلانے یعنی ٹریجڈی کی بھی ایک صورت نکل آئی ۔ صفویوں کے عہد سلطنت میں شیعہ مذہب سرکاری مذہب قرار پایا ۔ مرثیہ خوانی کو رواج ہوا خاص خاص تعزیہ خوان اور تعزیہ گردان پیدا ہوئے ۔ محرم کے پہلے عشرہ میں شہادت امام حسین (ع) کی ٹولیاں بن گیئں ۔ یہ لوگ اپنے ساتھ مناسب لباس و اسلحہ رکھتے تھے ۔ واقعات شہادت کی تمثیلیں لکھتے اور شہروں میں جا کر سٹیج کرتے ۔ جب ان کی قدر ہوئی تو اچھے اچھے خوش آواز ممثل ڈھونڈ کر لائے جاتے جو خاص خاص کردار ادا کرنے میں مہارت رکھتے تھے ۔ ان میں سے بعض ثمر خوان ، امام خواں اورعباس خواں مشہور تھے - ان تمثیلوں میں جید فضلاء اور امراء بھی حصّہ لیتے ۔ عورتوں کا پارٹ مرد ادا کرتے اور ایک لمبا سیاہ برقعہ پہنتے جن میں سے صرف آنکھیں نظر آتیں ۔ خوبصورت لڑکے یا لڑکیاں سیاہ و سبز لباس میں آتیں ۔ سر پر چھوٹی چھوٹی پگڑیاں باندھتیں ۔ شمر و یزید کا پارٹ ادا کرنے والے قیدی ہوتے اور اکثر سرخ لباس پہنتے ۔ بعض انتقامی جوش کے اثر میں مارے بھی جاتے ۔ شاہانہ سرپرستی حاصل ہونے پر ان تمثیلوں کا بڑا چرچا ہوا اور وسیع پیمانے پر ان کا انتظام ہونے لگا ۔ تہران میں اس مقصد کے لئے ایک جگہ « تکیہ دولت » کے نام سے مخصوص کی گئی تھی ۔ اس میں بادشاہ اور امراء کے لئے کمرے بنائے گئے تھے ۔ سٹیج پر کئی کئی مناظر بدلنے کے لئے پہلے سے انتظام ہوتا تھا ۔ یہ تمثیلیں اثر انگیزی اور ہیجان خیزی میں بے نظیر سمجھی جاتی ہیں ۔ ایک تو حاضرین خود اعتقاداً غم و الم کے جذبات لے کر ایسی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے ۔ دوسرے ایکٹروں کی فنی مہارت اور مذہبی عقیدت شامل ہوتی ۔ اس لئے تأثر انگیزی میں سارا ماحول ایک المناک فضا پیدا کر دیتا ۔ ساز و آہنگ کا موزوں استعمال حاضرین کے جذب و کشش کا اور سامان پیدا کرتا۔ مکالموں میں جہاں جہاں اشعار پڑھے جاتے ڈرامے کی رفتار اور تیز ہو جاتی کبھی کبھی خستگی کو دور کرنے کے لئے ہنسی مذاق کے کھیل بھی شامل کر لیتے ۔ یا وقفوں کے درمیان موسیقی سے حاضرین کی تواضع کرتے ۔ شاہی دستہ ان تعزیوں کو بڑے اہتمام سے سٹیج کرتا۔ ایکٹروں کو خلعت اور انعام ملتے اور بعضوں کو معین البکاء جیسے خطابات ملتے ۔ ان ایکٹروں کو اپنے اپنے پارٹ زبانی یاد ہوتے اور جن کو یاد نہ ہوتے وہ کاغذ یا کاپی پر لکھ کر اپنے پاس رکھتے اور اپنے کام سے فارغ ہو کر منیجر کو دے دیتے ۔ ان تمثیلوں کی نقلیں ہم تک نہیں پہنچیں ، بعض مشہور تمثیلیں یہ ہیں :

حجة الوداع ، شہادت مسلم ، بازار شام ، یوسف و زلیخا ، ہفتاد و دو تن ، شست

بستن دیو اور بلقیس و سلیمان کچھ تمثیلیں ، سرلویس بیلی نے انگریزی میں ترجمہ کرکے ۱۸۷۹ م میں شایع کیں ۔

یہ تمثیلیں اس فنی ڈرامہ کی صورت میں نہ تھیں ۔ جن میں پرانی تین وحدتوں کا التزام ہوتا تھا - انیسویں صدی کے اروپائی تھیٹر کے مقابلہ میں بھی ان کو پیش نہیں کیا جاسکتا البتہ ان تمثیلوں سے ایرانی تھیٹر کی ابتدائی شکل معرض وجود میں آگئی ۔

فتح علی شاہ قاجار (۱۷۹۷ء - ۱۸۳۴ ء) کے زمانہ میں قفقاز کا علاقہ روسیوں کے زیر اقتدار آگیا ۔ روس کا تھیٹر کافی ترقی یافتہ تھا - ایران کے اس نئے علاقہ میں بھی وہاں کا تمدّن اثر انداز ہوا ۔ تفلیس میں تماشاخانے بنائے گئے اور عوام کو فضول رسوم و قیود سے آزاد کرانے اور علم و اخلاق کی نئی روشنی میں لانے کے لئے ڈرامے سٹیج کئے گئے ۔ اس سلسلے میں ایک ڈرامہ « انعام زن »کے عنوان سے ۱۸۳۱ء میں تہران میں سٹیج ہوا لیکن ایرانی تھیٹر کی تاریخ میں اس کو کوئی اہمیت حاصل نہ ہوئی ۔ ایرانیوں نے اپنی سٹیج کی اصلاح کے لئے کوئی قدم نہ اٹھایا ۔ مرزا فتح علی اخواند زادہ نے قومی و ملی جذبہ اصلاح کی خاطر آذربائیجانی اور ترکی میں مندرجہ ذیل ڈرامے لکھے :

۱- ملاّ ابراہیم خلیل کیمیاگر ۱۸۵۰ ء ۔ ۲- موسیوژ دردان ، حکیم نباتات ۱۸۵۰ء ۔ ۳- خرس و زد افگن ۱۸۵۱ ء ۔ ۴- وزیر خان لنگران ۱۸۵۲ ۔
۵- مردخسیس ۱۸۵۴ ء ۔ ۶- وکلائے مرافعہ ۱۸۵۵ء ۔ ۷- قصہ یوسف شاہ سراج ۱۸۵۶ ء ۔

مرزا جعفر علی قراجہ داغی نے ان تمثیلوں کا فارسی میں ترجمہ کیا (۱۸۷۲ء ۔ ۱۸۷۴ ء) ان کی زبان سادہ اور روزمرہ محاورہ کے مطابق ہے ۔ اس میں پر تکلف اور پر تصنع انداز بالکل نہیں ۔ فارسی نثر کو سادہ اور دلاویز بنانے میں ان تمثیلوں کی مثال بڑی اہم ہے ۔ ترجمہ نہایت عمدہ ہے ان پر ذاتی تخلیق کا شبہ ہوتا ہے ۔

ناصر الدّین شاہ قاجار نے اپنے یورپ کے سفروں میں تھیٹر کو دیکھا اور بہت پسند کیا ۔ اس نے مرزا علی اکبر خان مزّین الدولہ معلّم دارالفنون کو ایران میں تھیٹر کو عام کرنے کے لئے مقررکیا ۔ چنانچہ اس نے مولیر کے ڈراموں کو دارالفنون کے ہال میں سٹیج کیا لیکن وہ لوگ جو بھدی ظرافت یا تمسخر کے عادی تھے یا تعزیہ کے المناک مناظر سے آشنا تھے وہ ان ڈراموں کے باریک نکات کو کیسے سمجھ سکتے تھے ۔ اس لئے ان کو خاص قبولیت حاصل نہ ہوئی ۔

فارسی زبان میں سب سے پہلے لکھے جانے والے ڈراموں میں مرزا ملکم خان سے منسوب تین مختصر ڈرامے ہیں جن کا کچھ حصّہ روزنامہ « اتحاد تبریز » کے حاشیے پر

۱۳۲۶ھ/۱۹۰۷ء میں چھپا - بعد میں ۱۳۴۰ ھ/۱۹۲۱ء میں یہ مکمل طور پر «مجموعه ای مشتمل بر سه قطعه تئاتر » منسوب به مرزا ملکم خان ناظم الدوله کے نام سے برلن میں چھپے ۔ حال ہی دستیاب ہونے والے بعض حوالوں کے مطابق یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ ان ڈراموں کا حقیقی مصنف میرزا آقا تبریزی ہے جو تہران میں فرانسیسی سفارت خانے میں فرسٹ سیکرٹری تھا ۔ اس نے یہ ڈرامے ۱۲۸۷ھ/ ۱۸۷۰ء میں لکھے اور ان کے یہ نام رکھے :

۱- سرگذشت اشرف خان حاکم عربستان در ایام توقف او در ایران ۔

۲- طریقه حکومت زمان خان بروجردی و سرگذشت آن ایام ۔

۳- حکایت کربلا رفتن شاه قلی میرزا و سرگذشت آن ایام و توقف چند روزه در کرمانشاهان نزد شاه مراد و میرزا حاکم میرزا ۔ (۱)

۱- تفصیل کے لیے دیکھیے : از صبا تا نیما ، ج ۱ ، ص ۳۵۸-۳۶۰ ۔

بخش نہم :
دورۂ مشروطیت

شاعری

ناصر الدّین شاہ اور مظفر الدّین شاہ (۱۸۹۶- ۱۹۰۶ ھ) کے دور حکومت میں ایرانیوں میں نئے سیاسی افکار اور وطنی اور قومی جذبات پرورش پا رہے تھے ۔ اس زمانے میں اخبار و رسائل جاری ہوئے ۔ نئی طرز کے مدرسے ہر جگہ قائم کئے گئے ۔ ترکی اور مغربی ممالک میں آمد و رفت شروع ہوئی ۔ روس اور جاپان کی جنگ میں جاپانیوں کی فتوحات سے لوگوں میں غرور ملّی اور وطنی وقار کا خیال پیدا ہوا ۔ اور یورپ میں نئے علوم و فنون کو دیکھ کر لوگوں میں حیرت و تعجب کی لہر دوڑ گئی ۔ لوگ مستبد حکومت سے تنگ آگئے تھے اور دوسرے ممالک کی انصاف اور قانون پر مبنی حکومتوں کے ساتھ اپنی حالت کا مقابلہ کرتے تھے ۔ تہران ،تبریز ، اصفہان ، مشہد اور دوسرے شہروں میں ہفت روزہ اور ماہنامہ رسائل جاری ہوئے ۔ اسلامبول ، مصر اور ہندوستان سے بھی تربیت ، اطلاع ، حبل المتین ، پرورش اور ثریا کے نام سے رسائل جاری ہوئے ۔ ان میں وطن پرستی ، مفاخر تاریخی ، اتحاد دول اسلامی اور یورپی و مغربی علوم و فنون کی تحسین کے موضوعات پر نظمیں اور قصیدے شایع ہوتے تھے. اس زمانے میں بھی بادشاہ ، وزیراعظم ، امرائے سلطنت اور شہزادے شعراء کی قدر و تربیت کرتے تھے ۔

۱۹۰۶میں مشروطیت کے نفاذ سے استبداد کا دور ختم ہوا ۔ مجلس ، دفاتر اور وزارتیں بنیں، اخبار و رسائل جاری ہوئے ۔ فرانسیسی ، انگریزی اور عربی جدید کی کتابیں اور ان کے ترجمے عام ہوئے ۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم واقع ہوئی جس کی وجہ سے سارا جہان متأثر ہوا ۔ ایران کا شاہ جو آئے دن یورپ کی سیاحت کو جاتا ۔ حکومت نائب السلطنة یا وزیراعظم کے ہاتھ میں ہوتی ۔ مرکزی حکومت کمزور ہوئی تو قبائل کے سرداروں نے اطراف سے بغاوتیں کردیں ۔ سیاسی پارٹیوں میں عجیب کشمکش ہوئی ۔ اختلاف آراء سے سارا نظام مضمحل رہا ۔ اس دور میں شعر و سخن کا موضوع حکومت اور اس کے محکموں پر تنقید رہا ۔ اجتماعی بدحالی کی اصلاح کے لئےفکرمندی ، عورتوں کی افسوسناک پستی پر اظہار ، اور آزادی و مشروطیت کے قیام کیلئے جد و جہد جیسے موضوعات پر اکثر نظمیں لکھی گیئں ۔ اس زمانے میں ابوالقاسم خان نائب السلطنت اور علی قلی خان ، سردار اسعد خان بختیاری کی تشویق سے

علم و فضل کی قدر و منزلت ہوتی رہی ۔ حسن وثوق کے عہد میں جو دو سال تک ایران کے خود مختار حاکم رہے ، جرمنی کو شکست رہی ۔ روس میں انقلاب برپا ہوا . جنگ عظیم کے اختتام پر اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا ۔ وثوق اور ان کے وزیر تعلیم احمد نصیر الدولہ خود بھی شاعر اور فاضل تھے . ان کے اشعار بھی رسائل وجہ ابد میں چھپتے تھے۔ اور ان کے زیر اثر شعر و سخن کی طرف توجہ ہوتی رہی ۔

ڈراما

بیسویں صدی کے آغاز میں وطن پرستوں اور آزادی خواہوں نے تھیٹر کو تبلیغی مقاصد کے لئے ایک اہم وسیلہ سمجھا ۔ مگر ان کے سامنے سرمایہ کی کمی کے علاوہ اور بہت سی رکاوٹیں تھیں . ایکٹروں کو رذیل اور ادنی سمجھا جاتا تھا ۔ اس پر رسوائی ، ملّا کی تکفیر اور حکومت کی شمشیر بھی ہر دم سر پر رہتی ۔ لیکن بعض با ہمت اشخاص نے ایک منظم کوشش کے تحت ڈرامہ شروع کیا اور شرکت فرہنگ کے نام سے ایک عمارت بھی بنائی جس میں کافی دیر تک مدرسة المعلین قائم رہا ۔ کچھ عرصہ بعد تیأتر ملی کے نام سے ایک نیا ادارہ قائم ہوا جس کے صدر عبدالکریم محقق الدولہ تھے . انہوں نے کورش کبیر اور جمشید کے تاریخی ڈرامے پیش کیے اور حاصل شدہ آمدن کو امور خیریہ میں صرف کیا ۔ یہ ڈرامے بہت مقبول ہوئے ۔

۱۹۱۶ء میں سیّد علی نصر کی ادارت میں «کمدی ایران» کے نام سے ایک اور کمپنی تشکیل ہوئی ۔ علی نصر اور ان کے دیگر شرکائے کار یورپی تھیٹر سے واقف تھے ۔ انہوں نے اپنے مصنفہ یا مترجمہ ڈراموں کو حسین انداز میں پیش کیا ۔ صحیح معنوں میں یہی لوگ ایرانی تھیٹر کے بانی ہیں جنھوں نے لوگوں میں ڈرامے کا شوق پیدا کیا ۔ اسی کمپنی کی حوصلہ افزائی پر باقر اُف تاجر نے خیابان لالہ زار میں ایک عالی شان تھیٹر بنایا ۔ اس تھیٹر کی سٹیج پر یہودی ، ارمنی اور ترک عورتوں نے زنانہ کردار ادا کیے ۔ جنگ عظیم(۱۹۱۴-۱۹۱۸م) کے بعد روسی اور قفقازی ایکٹر بھی ایران آئے ۔ چونکہ وہ فن سے واقف تھے ، انہوں نے آہستہ آہستہ فارسی لہجہ بھی اپنا لیا اور ساتھ ساتھ اپنے دلربا رقص و سرود سے حاضرین کو محظوظ کیا ۔ ۱۹۱۹م میں پری خانم آقا بایف روس سے رقص و موسیقی کی تعلیم حاصل کرکے ایران میں آئی ۔ اس کی شخصیت سے تھیٹر کو بہت فروغ ہوا ۔ رضا شہرزاد کا ڈرامہ پری چھرہ و پری زاد کھیلا گیا جو بہت مقبول ہوا ۔ مادام بایف نے مجتبی طباطبائی کی اعانت سے تیاتر الھہ سٹیج کیا جو تقریباً چالیس مرتبہ بار بار سٹیج ہوا ۔ اس مختصر دور میں ارمنیوں کی کوششیں بھی قابل قدر ہیں . اس زمانے میں «دکتر ریاضی دان» ، «دیوانہ مزاحم» اور

«جعفر خان از فرنگ آمده» جیسے مشہور ڈرامے سٹیج ہوئے ۔

ناول نویسی

تنقیدی ناولوں کی ابتدا سفر ناموں سے ہوئی ہے ۔ «سیاحت نامہ ابراہیم بیگ» اور «مسالك المحسنین» دو ایسی کتابیں ہیں جنہوں نے ایرانی ذہن کی بیداری میں بڑا حصّہ لیا ۔ سیاحت نامہ ابراہیم بیگ بڑا مقبول ہوا. اس کے مصنف حاجی زین العابدین مراغہ‌ای تھے جو اسلامبول میں رہتے تھے ۔ اور روزنامہ اختر کے نامہ نگار بھی تھے ۔ یہ کتاب تین حصّوں میں منقسم ہے :

پہلے حصے میں حیات ابراہیم کے واقعات کا ذکر ہے ۔ دوسرے میں سفر کے حالات مندرج ہیں اور تیسرے میں ایك ایرانی دانشمند کے بیانات شامل ہیں ۔

یہ کتاب ایك دردمند وطن پرست کی پکار ہے ۔ اس کا دل ایرانیوں کی زبوں حالی اور پسماندگی پر جلتا ہے اس نے حکام کے استبداد ، علماء کی بے راہ روی اور عوام کی بے علمی اور توہم پرستی پر سخت تنقید کرکے ان میں جذبہ بیداری اور اصلاح پیدا کرنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے ۔ اس کتاب کا طرز بیان سادہ اور عام فہم ہے ۔ پرانے مروجہ تصنع و تکلف سے خالی ہے ۔ جا بجا تقریریں بھی شامل ہیں اور کہیں کہیں نامانوس الفاظ و مرکبات بھی ملتے ہیں ۔

دوسری کتاب مسالك المحسنین کے مصنف عبدالرحیم طالبوف ہیں ۔ یہ کتاب ۱۳۲۳ ھ قاہرہ میں چھپی تھی ۔ یہ سیاحت نامہ خیالی اور علمی ہے ۔ محسن بن عبداللّٰہ ایك شخص اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جن میں انجینئر اور ڈاکٹر بھی شامل ہیں کوہ دماوند پر جاتے ہیں اور وہاں سے نئی معلومات اور انکشافات حاصل کرکے تین مہینوں میں اپنی رپورٹ پیش کرتے ہیں ۔ اس کتاب میں علمی باتوں کے علاوہ ضمناً مختلف طبقات کے آداب و رسوم کا تذکرہ ہے ۔ لیکن قصہ کہانی کا انداز بھی قائم رکھا ہے ۔ اس لئے اس کتاب کا ادبی مقام بھی بلند ہے ۔ زبان سادہ اور عام فہم ہے ۔ کہیں کہیں صرفی و نحوی غلطیاں ہیں اورترکی اصطلاحات کا استعمال بھی عام ہے ۔

حاجی بابا اصفہانی اگرچہ موریہ‌کے انگریزی ناول کا ترجمہ ہے لیکن زبان و بیان کے اعتبار سے ترجمہ پر اصل کا گمان ہوتا ہے ۔ یہ ناول ایران کے نظم و نسق اور ایرانیوں کی اخلاقی زندگی پر بہت بڑی طنز و تنقید ہے ۔ ایرانیوں کی ذہنی بیداری میں حاجی بابا اور سیاحت نامہ ابراہیم بیگ دونوں کتابوں کا اہم حصّہ ہے ۔ متأخر افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں نے دونوں کتابوں کی تقلید میں سماج پر تنقید کی ہے ۔

سب سے اچھا سماجی ناول جس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی ہے ۔ مشفق کاظمی کا «تہران مخوف» ہے جو پانچ جلدوں میں شائع ہوا اور بڑا مقبول ہوا ۔ اس ناول میں نچلے طبقوں پر حکام کا ظلم و ستم اور ماحول کی خرابی اور فساد کا بیان ہے ۔ زبان سادہ ہے اور کہانی بڑی دلچسپ ہے ۔ اس مصنف کے اور ناولٹ یا طویل افسانے « گل پژمردہ » اور « اشك پر بہا » بھی شایع ہوئے مگر ان کو تہران مخوف جیسی شہرت حاصل نہ ہوئی ۔

عباس خلیلی کے تین چار ناول بنام « روزگار سیاہ » «انتقام »"انسان"اور" اسرار شب" بھی اچھے خاصے مقبول ہوئے ہیں ۔ ان میں عورتوں کی زبوں حالی کے متعلق واقعات اور حوادث بیان کئے گئے ہیں ۔ ربیع انصاری کے ناول"خیانت بستر"اور"سیزدہ عید"ہیں ۔ جہانگیر جلیلی کے تین ناول « من ہم گریہ کردہ ام» ، «از دفتر خاطرات» اور «کاروان عشق » بھی اجتماعی خرابیوں کی نشاندہی کرتے ہیں ۔

موجودہ دور میں سماجی ناول لکھنے والوں میں سے دو مصنفوں کو بڑی شہرت حاصل ہوئی، ایك میر محمّد حجازی اور دوسرے محمّد مسعود دھاتی ۔

محمّد حجازی نے ۱۳۴۷ھ.ش میں « ہما » اور ایك سال بعد «پریچہر» کے نام سے ناول لکھے ۔ ان دونوں ناولوں کے اشخاص قصبہ اور شہری متوسط طبقہ کے افراد ہیں ۔ دونوں میں مصنف کا مقصد حقوق نسواں کی حمایت اور تجدد کی تبلیغ ہے ۔ اس نے ہما کو ایك خوش اخلاق اور متوسط درجہ کے خاندان کیلئے مفید اور سلیقہ مند لڑکی پیش کیا ہے ۔ لیکن «پریچہر» بالکل اس کے متضاد ایك ہوسباز اور شہوت پرست عورت ہے ۔ اگرچہ یہ ناول جدید فن نگارش کے اصولوں کو مدنظر رکھ کر لکھے گئے ہیں لیکن بعض کردار حقیقی اور واقعی معلوم نہیں ہوتے ۔ کہانی ایك قصّہ معلوم ہوتی ہے ۔ حجازی نے تیسرا ناول « زیبا » کے نام سے لکھا ہے ، جو دو جلدوں میں چھپ چکا ہے ۔ اس ناول میں ان شہر نشین اشخاص کا ذکر ہے جو برے نظام اور مفسد سماج میں بری زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں ۔ اس ناول میں زیادہ حقیقت اور واقعیت ہے ۔ اس کے پہلے دو ناولوں سے یہ ناول زیادہ مقبول ہوا ۔ اس میں بھی عورت کے مکر و خباثت کو بد نما رنگ میں پیش کیا گیا ہے ۔ اور اجتماعی ماحول ، حکومت اور اس کے اداروں میں نظم و نسق کی خرابیوں کا تذکرہ کیا ہے ۔

دوسرے ناول نگار جنھوں نے سماج پر تنقید کی ہے ۔ محمّد مسعود دھاتی ہیں . ان کے ناول «تفریحات شب » ، «در تلاش معاش » اور « اشرف المخلوقات » اچھے خاصے مقبول ہوئے ۔ ان ناولوں کے اشخاص شہری طبقہ کے لوگ ہیں ۔ خاص طور پر ان اشخاص کا ذکر ہے جو دن کو دفتروں اور کارخانوں میں کام کرتے ہیں اور رات کو عیاشی

اور آوارہ گردی میں گزارتے ہیں ۔ مصنف کا خیال ہے کہ یہ لوگ خود قصوروار اور تباہ کار نہیں بلکہ غلط عادتوں اور جاہلانہ تعلیم کی وجہ سے یا اقتصادی بدحالی اور مفسد ماحول کی وجہ سے وہ ایسی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں ۔ ان ناولوں میں تجدد و تعلیم پر زور دیا ہے اور مروجہ روایتی تعلیم و تدریس پر اعتراضات کئے ہیں کیونکہ رائج تعلیم مسائل زندگی کو حل نہیں کرتی ۔ مصنف کے اسلوب بیان میں عامیانہ محاورہ اور اخباری زبان کا استعمال عام ہے ۔اس مصنف کے آخری دو ناول «گلہای کہ در جہنم می رویند » اور « بہشت آرزو » شایع ہوئے ہیں ۔

سماجی ناول نگاروں میں جواد فاضل کا نام سر زبان ہے ۔ انہوں نے دو دو ڈھائی سو صفحوں کے کم و بیش پچاس ناول لکھے ہوں گے ۔ان کا عام موضوع جوان مرد اور عورتوں کی بے راہ روی ، ازدواجی خرابیاں اور اجتماعی مفسدات ہیں ۔ یہ ناول خاصے مقبول اور دلچسپ ہیں ۔

۱۹۶۱ء میں محمّد علی افغانی کے ناول « شوھر آھو خانم» کو بہت شہرت حاصل ہوئی ۔ اس میں حرفہ و صنعت سے وابستہ خاندان کی زندگی اور احوال و کوائف کی بھرپور ترجمانی ہوئی ہے ۔

تاریخی ناول

ایران میں نقالوں کی زبانی قصے بیان کرنے کا رواج تھا ۔ اس میں بہادری کی داستانیں بیان ہوتی تھیں ۔ زبان بھی دلکش ہوتی تھی ۔ لوگ دلچسپی سے سنتے تھے لیکن ادبیّات میں ان قصوں کا شمار نہیں ہوتا تھا ۔ یہ بھی ایک طرح کے ناول ہیں ۔ ان میں رستم نامہ ، اسکندر نامہ ، داراب نامہ ، سمک عیار حسین کرد وغیرہ معروف ہیں ۔

ایران میں تاریخی ناولوں کا رواج ترجموں سے شروع ہوا ۔ الیگزنڈر ڈوما اور جرجی زیدان کے ناول ایران میں بہت مقبول ہوئے ۔ انھی ناولوں سے متاثر ہو کر ایرانیوں نے خود اپنے ملک کی تاریخ سے واقعات کو منتخب کرکے ان کو قصے کی صورت میں لکھنا شروع کیا ۔ تاریخی ناول نگاروں میں محمّد باقر خسروی ، شیخ موسی نثری ، حسن خان بدیعی، صنعتی زادہ کرمانی کےنام نمایاںہیں .ان کے ناول ۱۹۰۹ اور ۱۹۲۱ کے درمیان شائع ہوئے :

تاریخی ناول نگار

محمّد باقر خسروی

پہلا تاریخی ناول شمس و طغرا کرمانشاہ میں ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا ۔ ماری وینسی ، طغرل و ہمای ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئے ۔ یہ تینوں الگ الگ کہانیاں ہیں لیکن ان کے

اشخاص مشترک ہیں ۔

شمس آل بویہ کا شہزادہ ہے جو منگول حکمران کی بیٹی کے عشق میں گرفتار ہوگیا اس کی شادی میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کےلئے شمس نے جرأت سے مقابلہ کیا . بڑے بڑے حوادث سے دوچار ہوا ۔ تاریخی لحاظ سے اس ناول کو بہت اہمیت حاصل ہے .مصنف نے مستند کتابوں سے معاصر کوائف جمع کئے ہیں اور کتابوں کی فہرست بھی درج کی ہے ۔ اس ناول میں اس زمانے کے شادی بیاہ اور ماتم کے رسوم ، سفر ، شکار ، تاریخی مقامات ، قبائل کے سرداروں ، پہلوانوں اور نقالوں کے حالات بیان کئے ہیں ۔ اس نے تعدد ازدواج اور عورت کی غلامی کے خلاف ہجو و طعن سے کام لیا ہے . اسی نے حکومت کے مستبدانہ نظام اور جاگیرداروں کے ظلم و ستم کی زبردست مذمت کی ہے ۔ خسروی نے عوام کی زندگی کی عکاسی کرنے میں اچھی مہارت کا ثبوت دیا ہے ۔ محمّد علی جمالزادہ نے اس ناول کی بہت تعریف کی ہے اور اسے ادبیّات جدید میں مغربی زبانوں میں ترجمہ کے لئے ایك مثالی نمونہ قرار ہے ۔

شیخ موسی نثری

موسی نثری نے قدیم تاریخ سے متعلق تین ناول لکھے :

۱- عشق و سلطنت یا فتوحات کورش کبیر ۔

۲- ستارہ لیدی ۔

۳- سرگذشت شاہزادہ قاسم بابلی ۔

عشق و سلطنت ۱۹۱۹ء میں ہمدان میں شائع ہوا ۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے . اس میں کورش کبیر کی ابتدائی زندگی سے فتح ہمدان تك کے واقعات کا ذکر ہے. قدیم ایرانی ناموں کو اصلی تلفظ میں نہیں لکھا بلکہ فرانسیسی تلفظ کی مدد سے فارسی میں منتقل کیا ہے ۔ ناول میں واقعات کے تاریخی، آثارِ قدیمہ اور اساطیر کہن کے متعلق حواشی بھی دیئے گئے ہیں ۔

ستارہ لیدی ۲۵- ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا ۔ اس میں کردنسوس کے خلاف کورش کبیر کی مہمات ، ساردیس کی فتح اور لیدیا کو ایرانی سلطنت میں شمولیت کے واقعات بیان کئے گئے ہیں ۔

سرگذشت شاہزادہ بابلی ۲-۱۹۳۱ء میں کرمانشاہ میں شائع ہوا ۔ اس ناول میں میدیا کے شاہزادہ ہرمزان اور بیبی لون کی شہزادی ایری دیس کے معاشقہ کی داستان بیان کی گئی ہے ۔ آخری دو ناولوں کی کہانی محکم اور دلچسپ ہے ۔ اسلوب بیان بھی مستقیم اور دلکش ہے ۔ مکالمات بہت کم ہیں ۔ سب کردار ایك طرح کی زبان استعمال کرتے ہیں .

حسن بدیع نصرۃ الوزراء

«داستان باستان » کے نام سے اس کا تاریخی ناول تہران میں ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا . اس نے دیباچے میں دعوی کیا ہے کہ یہ پہلا تاریخی ناول ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے ۔اس ناول میں بیژن و منیژہ کی عشقیہ داستان کے پس منظر میں ایران کی قدیم تاریخ بیان کی گئی ہے ۔ ہخامنشیوں کی حکومت کے آغاز سے کورش کبیر کے ہاتھوں میدیا اور سیجارون پر تصرف تک کے واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے ۔ تفصیلات شاہنامہ فردوسی میں مندرج تاریخی اور اساطیری اطلاعات پر مبنی ہیں ۔ حسن نے تاریخی مقامات ، آثارِ قدیمہ اور بیبی لون کی سنگ تراشی و نقاشی کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے ۔ کہیں کہیں واقعات کی غلطیاں ہیں، لیکن واقعات کا تسلسل اور پلاٹ کا خاکہ کہانی کی دلچسپی کو قائم رکھتا ہے ۔ حسن نے یہ اہتمام کیا ہے کہ ناول کے کردار اپنی شخصیت اور علمی سطح کے مطابق گفتگو کرتے ہیں ۔ عام آدمی اپنی زبان میں بات کرتا ہے اور شہزادہ اپنے درباری لہجے میں ۔

صنعتی زادہ کرمانی

صنعتی زادہ کے والد حاجی علی الہ شاہی استبداد سے تنگ آ کر ۱۹۰۱ء میں کرمان سے قسطنطنیہ چلے گئے وہاں سیّد جمال الدّین اسد آبادی سے دوستی ہوگئی . انہوں نے علی اکبر کو انقلابی نشریات کی تقسیم کے لئے دوبارہ ایران بھیجا . مشروطہ خواہوں سے وابستگی رکھنے والوں کا بُرا حال تھا ۔ علی اکبر کے کاروبار کا سلسلہ ٹھپ ہوگیا لیکن آخر اس نے اپنی استقامت سے حالات بہتر کر لئے ۔اس نے ہنر سکھانے کے لئے یتیم خانہ کھولا اور صنعتی زادہ نے کتاب فروشی کی دکان کھولی ۔دس سال تک اس کی دکان چلتی رہی اور اس کی دکان شہر کے روشن فکروں کا مرکز بنی رہی ۔ بعد میں صنعتی زادہ تہران چلے گئے اور وہاں کپڑے کا کارخانہ لگایا اور شہر کے مشہور تاجر بن گئے .

عبدالحسین صنعتی زادہ نے کافی تعداد میں تاریخی اور دوسرے موضوعات پر ناول لکھے ہیں .تاریخی ناولوں میں اس کا پہلا ناول ۱۹۲۱ء میں دام گستران یا انتقام خواهان مزدك کے نام سے شائع ہوا ۔ اس میں اس نے سلطنت ساسانی کے زوال اور عرب فتوحات کا ذکر کیا ہے ۔ اس نے یزدگرد سوم کے ظالمانہ رویے اور اقلیتوں کے خلاف اس کے مذہبی تعصب پر تبصرہ کیا ہے ۔ اس کے درباری مزدك کے حامی تھے اور خسرو کے ہاتھوں مزدك کے قتل کا انتقام لینا چاہتے تھے ۔ مصنف نے زردشتی موبدوں کے متعصبانہ اخلاق کی خوب مذمت کی ہے ۔

دام گستران کی دوسری جلد تہران میں ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی ۔ براؤن نے پہلی جلد میں بعض غلطیوں کی نشاندہی کی تھی ۔ اس سے متاثر ہو کر دوسرا حصہ لکھا ۔

صنعتی زادہ کا دوسرا تاریخی ناول داستان مانی نقاش ہے ۔ اس میں تاریخی اور غیر تاریخی مواد مخلوط ہے ۔ مانی چین جاتا ہے اور نقاشی سیکھتا ہے ۔ وہ ایک لڑکی زاہدہ کی محبت میں بھی گرفتار ہوتا ہے وہ ایک مرتبہ شیرببر کی گردن سے چابی حاصل کرکے ایک مندر سے خزانہ حاصل کرتا ہے ۔ اور شاپور کے حوالے کرتا ہے ۔ وہ اسفند یار کو شہنشاہ روم ولیرین کو قفس میں بند کرتا ہے۔ آخر مانی اور زاہدہ کی شادی ہو جاتی ہے ۔ یہ ناول واقعات کے لحاظ سے دام گستران سے زیادہ متحرک ہے ۔ پلاٹ بھی اچھا ہے اور غیر متوقع حوادث سے دلچسپی قائم رہتی ہے ۔

صنعتی زادہ کا تیسرا ناول سلحشور ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا ۔ اس میں حکومت ساسانیاں کے آغاز اور اس کے بانی اردشیر اول کے احوال زندگی بیان کئے گئے ہیں۔ پس منظر کے طور پر اردوان (۲۰۹-۲۲۶ ع) آخری پارتھین بادشاہ کے عہد حکومت کے واقعات کا بھی ذکر کیا ہے ۔

صنعتی زادہ کا ایک اور تاریخی ناول ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا ۔ اس کا موضوع ظالم حکمرانوں کے خلاف ایرانی ہیرو کی بغاوت ہے ۔ یہ ابو مسلم خراسانی کی داستان ہے ۔ جس نے بنو اُمیہ کے خلاف بنو عباس کی حمایت کی ۔ بعد میں ہردلعزیزی و شہرت کی بناء پر وہ منصور عباسی کے ہاتھوں قتل ہو جاتا ہے ۔ ناول میں ابو مسلم کو ایران اور اسلام کا ممتاز سربرآوردہ شخص پیش کیا گیا ہے ۔ وہ اکثر اپنی کہانی کے پیش نظر حقیقی واقعات کو نظر انداز کر جاتا ہے ۔

صنعتی زادہ نے ایک اور ناول نادر فاتح دہلی کے عنوان سے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا ۔ اس کے دو اور تاریخی ناول جو شائع ہوئے ایک یزدگرد سوم کے جانشینوں کے متعلق مادر غمزدہ کےعنوان سے موجود ہے ۔ دوسرا ناول مرزا محمّد علی باب اور عبدالبہا سے متعلق ہے ۔

صنعتی کے غیر تاریخی ناول مندرجہ ذیل ہیں ۔

۱- چگونہ ممکن است متمول شد	۱۹۳۸ء
۲- رستم در قرن بیست دوم	۱۹۳۵ء
۳- عالم ابدی	۱۹۳۸ء
۴- مجمع دیوانگان	(دو جلد)
۵- فرشتۂ صلح یافتانۂ اصفہان	۱۹۰۳ء

دوسرے تاریخی ناول نگار

کمالی ، حیدر علی

مظالم ترکان خاتون ، افسانہ تاریخی لازیکا ۔

خلیلی ، محمّد علی

دختر کورش، نگارستان خون ، بہرام گور۔

حسین سخن یار، مسرور

داستان تاریخی محمود افغان

دہ نفر قزلباش

قوران یا سرگذشت عف علی خان زند ۔

ابراهیم مدرسی

پنجۂ خونین ، عروس صائن .

سعید نفیسی

آخرین یادگار نادر ، یزدگرد سوم ، بابك خرم دین ، دلاور آذربائیجان ۔

سرگذشت طاہر بن حسین.

رحیم زادہ ، صفوی

داستان شہربانو، داستان نادر شاہ ،یادداشتہای خسرو اوّل ، بیژن و منیژہ ۔

سماجی ناول نگار (۱)

نئے ناول نگاروں میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں جن کے ناولوں میں اجتماعی مباحث شامل ہیں :

بہمن شعلہ ور	– سفر شب	۱۳۴۵	ش
زکریا ہاشمی	– طوطی	۱۳۴۸	"
سیمین دانشور	– سووشون	۱۳۴۸	"
جمال میر صادقی	– دراز نای شب	۱۳۴۹	"
اسماعیل فصیح	– دل کور	۱۳۵۳	"
محمود گلابدرہ ای	– پرکاہ	۱۳۵۳	"
احمد محمود	– ہمسایہ ہا	۱۳۵۳	"

۱- نویسندگان پیشرو ایران ، محمّد علی سپانلو ، تہران ۱۳۲۱ ھ ش رمان نویسی ۔

ہوشنگ گلشیری	- برۂ گمشدہ راعی	۱۳۵۶	ش
احمد سکائی	- باید زندگی کنیم	۱۳۵۶	"
شہرنوش پارسی پور	- سگ و زمستان بلند	۱۳۵۴	"
محمود دولت آبادی	- کلیدر	۱۳۵۲	"
اصغر الہی	- مادام بی بی جان	۱۳۵۷	"
ناصر شاہین پر	- سالہای اصغر	۱۳۵۷	"
ہرمز شہدادی	- شب ہول	۱۳۵۷	"

اخبار نویسی

اعلان مشروطیت کے بعد یعنی ۱۹۰۶ء میں «مجلس» ، «ندای وطن» ، «حبل المتین» اور «صبح صادق» کے نام سے غیر سرکاری اخبار شایع ہوئے ۔ پہلے ہفت روزہ تھے ۔ پھر روزانہ شایع ہونے لگے ۔ ۱۹۰۸ء سے پہلے اخباروں کو آزادی نہیں تھی ۔ خبروں کو سنسر کرانا پڑتا تھا ۔ باہر سے آنےوالے اخبار و جراید پر بھی پابندیاں ہوتی تھیں ۔ کلکتہ کے « حبل المتین» اور قاہرہ کے «ثریا » کا بڑا اثر و رسوخ تھا ۔ لوگ چوری چھپے ان کے پرجوش مضامین کو پڑھتے تھے ۔ ۱۹۱۰ء میں ان کا داخلہ ممنوع ہوا ۔ آزادی پسندوں، وطن دوستوں نے « شب نامے » نکالنے شروع کیے ۔ انہوں نے انجمن گلستان بنا کر متحدہ کوشش کی اور پریس کی آزادی کے لئے ایک بل منظور کرایا ۔ دوسرے دن ہی آزادانہ رائے کا اظہار کیا ۔ سنسر کی پابندی ختم ہوئی ۔ محمّد علی شاہ نے ۱۹۰۸ء میں مجلس پر بمباری کرائی ۔ اخبـــــار نویسوں اور مدیروں کو گرفتار کیا «روح القدس» اور «صور اسرافیل» کے مدیروں کو قتل کرا ڈالا ۔ بعض ایڈیٹر یورپ ، مصر اور ہندوستان بھاگ گئے ۔

۱۹۰۹ء میں محمّد علی شاہ نے محل چھوڑ کر روسی سفارت خانے میں پناہ لی ۔ اس کے بعد احمد شاہ - نابالغ عضدالدولہ کی سرپرستی میں بادشاہ تسلیم کیا گیا ۔ نئی پارلیمنٹ بنی ۔ قومی رہنما اور اخباروں کے مدیر وطن واپس آگئے ۔ پھر اخبار جاری ہوئے . سیاسی پارٹیوں نے اپنے اپنے اخبار نکالے ۔ جمہوریت پسندوں ، اعتدالیوں اور حزب اتفاق اور ترقی شرق نے« ایران نو» ، «شوری»اور«استقلال ایران» کے نام سے اخبار جاری کیے ۔ اشاعت بھی بڑھ گئی ۔ «صور اسرافیل» پانچ ہزار اور «مجلس» دس ہزار کی تعداد میں تک چھپتا تھا ۔

۱۹۱۱ء میں پھر مجلس توڑ دی گئی ۔ روسیوں کے ظلم و تشــــدد کی وجہ سے بہت

سے اخبارات بند ہوگئے ۔ اخباروں کے مدیر جلاوطن ہوگئے ۔ ملك الشعراء بہار مشہد سے تہران چلے آئے ۔ ان کے اخبار « نوبہار» اور « تازہ بہار » کی اشاعت بند ہوگئی ۔

۱۹۱۴ء میں جب تیسری مرتبہ پارلیمنٹ وجود میں آئی تو اخبار پھر سے جاری ہوئے ۔ «نوبہار» ، «شوری» اور «رعد» تہران سے جاری ہوئے ۔ «ستارۂ ایران» اور «بامداد روشن» دارالسلطنت کی طرف سے شایع ہوئے ۔ جنگ عظیم میں خبروں کی بڑی وقعت ہوئی ۔ آزاد اخباروں کی تنقید حکومت کو راس نہ آئی چنانچہ ۱۹۱۸ء میں ایك نیم سرکاری اخبار « ایران » کے علاوہ سب اخبارات کی اشاعت روك دی گئی ۔

دور تجدد اور آزادی خواہی میں بعض رسائل و جراید نے بھرپور حصّہ لیا ۔ ان میں سے تین خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ جنہوں نے طنزیہ اور ہزلیہ انداز میں ملك کے مفاسد کو بیان کیا اور اہل وطن کی بیداری کے لئے کوشش کی ۔

۱- روزنامہ' ملا نصر الدّین

اگرچہ آذربائیجانی ترکی میں شایع ہوتا تھا ۔ تبریز اور دوسرے علاقوں میں بھی پہنچتا تھا اور سمجھا جاتا تھا ۔ اس میں ہزلیہ اشعار، کہانیاں، افسانے ، خطوط ، مزاحیہ تار ، تضمینیں اور کارٹون درج ہوتے تھے ۔ نظروں سے اوجھل معاشرتی گوشوں کو اجاگر کرتے تھے ۔ ایران میں ہونے والے واقعات پر تبصرہ ہوتا تھا ۔ صابر جیسے با کمال ترکی شاعر کا کلام صفحات کی زینت بنتا تھا ۔ جو تیغ و تفنگ کا کام دیتا تھا ۔ مرزا جلیل محمّد قلی زادہ نے ۱۹۰۶ء میں تفلیس سے جاری کیا ۔

۲- نسیم شمال ، اشرف

یہ چھوٹا سا مزاحیہ روزنامہ رشت سے شایع ہوتا تھا ۔ اس کے مدیر سیّد اشرف الدّین قزوینی تھے . شروع سے لے کر آخر تك وہ خود اپنے اشعار درج کرتے تھے ۔ بیس سال تك یہ ہفت روزہ چار صفحوں میں شایع ہوتا رہا ۔ اور عوام کے ہاتھوں میں پہنچتا تھا ۔ لوگوں میں وسوسہ پیدا کرتا اورحکومتیں اس کی تنقید سے تنگ آ جاتیں ۔

۳- صور اسرافیل

یہ ہفت روزہ میرزا جہانگیر خان اور میرزا علی اکبر خان دھخدا کی کوشش سے ۱۳۲۵ ھ. ش میں جاری ہوا ۔ اور۱۳۲۶ ھ. ش میں میرزا جہانگیر کے قتل پر ختم ہوا. صور اسرافیل کا وہ حصّہ پرکشش تھا جو «چرند پرند» کے عنوان سے شایع ہوتا تھا۔ اس میں دھخدا عامیانہ فصیح زبان میں ہجو آمیز تنقیدی مضامین لکھتے تھے اور ان میں نچلے طبقات کے معاشرتی مسائل پر گفتگو ہوتی تھی ۔ صور اسرافیل کا دوسرا دور محرم ۱۳۲۷ ھ.ش سے شروع ہوا اور ۱۵ صفر کو بند ہوگیا ۔ اس روزنامہ میں دھخدا کی

ایسی نظمیں شایع ہوئیں جن میں اروپائی رجحانات نمایاں تھے ۔

مجلاّت

سب سے پہلا ادبی مجلّہ «بہار» ہے ۔ جو ۱۳۲۱ ھ.ش میں جاری ہوا ۔ اس کے مدیر یوسف اعتصامی تھے ۔ اس رسالہ میں مشاہیر کے سوانح زندگی ، اخلاقی و اجتماعی مضامین ، افسانے ، نئی نظمیں اور یورپی اشعار کے ترجمے شایع ہوتے تھے ۔ بہار ایك سال جاری رہ کر بند ہوگیا ۔ ۱۳۲۹ھ ش میں پھر جاری ہوا ۔ یوسف اعتصامی سادہ رواں اور آہنگدار زبان لکھتے تھے ۔ بعد میں اس اسلوب کا پھر رواج ہوا ۔ یورپی اشعار کی تقلید میں اکثر نئے شاعروں نے نئے موضوعات پر قطعات لکھے ۔

۱۳۳۶ھ .ش میں «دانشکدہ» کے نام سے ایك رسالہ جاری ہوا ۔ یہ رسالہ ایك انجمن ادبی کی طرف سے شائع ہوا تھا ، جس کا نام پہلے «جرگۂ دانشوری» تھا ۔ بعد میں اس کا نام «دانشکدہ» میں تبدیل کر دیا گیا ۔ اس رسالہ کی اشاعت کے مقاصد میں یہ بات بھی مندرج تھی کہ اساتذہ متقدمین کے اسلوب کا لحاظ بھی رکھا جائے اور زمانۂ جدید کے تقاضوں کو بھی مدّنظر رکھاجائے ۔ اس مجلّہ کے بانی ملك الشعراء بہار تھے ۔ اور اس میں عباس اقبال ، رشید یاسمی ، سعید نفیسی ، رضا کمال شہرزاد جیسے صاحب قلم حضرات کے مقالات چھپتے تھے ۔

ملك الشعراء نے ۱۳۴۱ھ.ش میں « نوبہار» کے نام سے ایك ہفت روزہ رسالہ جاری کیا ۔ اس میں بھی « بہار» کی طرح تاریخ و ادبیات ایران و فرانس اور مغربی ممالك میں ادبی انقلابات کے متعلق مضامین شائع ہوتےتھے ۔ یورپی افسانوں اور نظموں کے ترجمے بھی چھپتے تھے ۔ ان رسائل کی وجہ سے نوجوانوں کے ذوق پر کافی اثر پڑا ۔

۱۳۳۸ھ.ش میں مجلّہ «ارمغان» وحید دستگردی کی ادارت میں جاری ہوا اور سترہ سال تك شائع ہوتا رہا۔ اس رسالے میں شعر و سخن کے متعلق زیادہ توجہ دی جاتی تھی ۔

دیگر مشہور علمی ادبی رسائل میں «آئندہ» ، «مہر »، «یادگار» ،«کاوہ» اور «ایرانشہر» کے نام لئے جا سکتے ہیں ۔

مجلّہ آئندہ ڈاکٹر محمود افشار کی ادارت میں نکلتا تھا ۔ اس میں سیاسی ، اجتماعی اور دیگر مختلف موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے ۔ ایك حصّہ خواتین کے لئے مخصوص تھا ۔

مہر ادبی ، تاریخی ، علمی و اجتماعی ماہنامہ تھا ۔ اس کے مدیر و موسس مجید موقر تھے ۔ اس میں بلند پایہ علمی تحقیقی مضامین شائع ہوتے تھے ۔

«یادگار» عباس اقبال کی یادگار تھا ۔ اس میں بھی معاصر ادیب ، استاد اور محقق اپنے تحقیقی اور انتقادی مضامین شائع کرتے تھے ۔

مجلّہ کاوہ ، تقی زادہ نے ۱۹۱۶ء میں برلن سے شائع کیا ۔ یہ ہر پندرہ روز کے بعد شائع ہوتا تھا ۔ ۱۹۱۹ء تک سیاسی و انتقادی مضامین پر مشتمل تھا ، ۱۹۲۰ء سے اس میں علمی و ادبی موضوعات کا بھی اضافہ ہوگیا ۔ مجلہ ایرانشہر ۱۹۲۲ء میں برلن سے شائع ہوتا تھا جس کے مدیر حسین کاظم زادہ ایرانشہر تھے ۔

فارسی میں افکار نو اور اسالیب نو کو رواج دینے میں ان رسائل کا بڑا حصّہ ہے ۔ حاکمانہ تشدد سنسر اور زبان و قلم کی پابندیوں کے زمانے میں نہ تو شاعر جی کھول کر نظم لکھ سکتا تھا اور نہ مقالہ نگار ہی علمی و تحقیقی مضامین میں بے باکی سے اپنی رائے کا اظہار کر سکتا تھا کیونکہ اس میں سیاسی مصلحتیں حارج ہوتی تھی ۔

اب علمی و ادبی رسائل کو آزادی حاصل ہے تاریخی اور ادبی موضوعات پر اچھے مضامین شائع ہوتے ہیں ۔ نظم و نثر میں نئے موضوعات دیکھنے میں آتی ہیں ۔ رسائل میں سے «یغما» ، «سخن» اور «مجلّہ دانشکدہ ادبیات ،تہران» ، «مجلہ دانشکدہ ادبیات، تبریز» ، «آموزش و پرورش» خاص شہرت رکھتے ہیں ۔

ہفت روزہ رسائل میں سے «تہران مصور» ، «اطلاعاتِ ہفتگی» ، «آسیا جوان» اور «ترقی» قابل ذکر ہیں ۔

تطہیر زبان

فارسی قدیم کے اسلوب کو تبدیل کرنے میں وطن پرستی اور قوم پرستی کے جذبات کا بھی کافی اثر ہوا ۔ کچھ لوگ ایسے بھی نکل آئے جو عربی الفاظ کو نکال باہر کرنے میں کوشاں تھے ۔ شاھنامہ اور گرشاسب نامہ کو نمونہ سمجھ کر خالص فارسی میں نثر لکھتے تھے ۔

نامۂ خسرواں اور داستان ترکتازان ہند اس تحریک کی بنا پر خالص فارسی میں لکھی گیئں ۔ ایک شاعر نے لکھا ہے ۔

بیا کہ پاک الفبای مرزا ایران را ز عین و قاف ط ظ و صاد و ضاد کنیم

اس تحریک کو رواج دینے کے لئے ابوالقاسم خان آزاد نے ۱۹۰۶ء میں (علی اصغرحکمت نے «پارسی نغز» میں نامہ آزاد کا ذکر کیا ہے)۔ نامۂ پارسی کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار جاری کیا ۔ آئیتی نے" نمکدان"کے نام سے ایک ماہوار مجلہ شائع کیا جس میں فارسی سرہ کے عنوان کے تحت خالص فارسی میں نظمیں چھپتی تھیں ۔ امیری

کی « پیوستہ فرہنگ پارسی » اسی زمانے کی یادگار ہے ۔ اس میں عربی الفاظ کے معنی فارسی میں منظوم کئے گئے ہیں ۔ احمد کسروی نے زبان کی اصلاح اور عربی الفاظ و مصطلحات کو نکال باہر کرنے کے لئے عملی تجاویز پیش کیں ۔ اور « زبان فارسی » کے عنوان سے ایک رسالہ بھی لکھا ۔ ذبیح بہروز نے زبان کو آسان کرنے کے لئے بنیادی اصلاحات تجویز کیں اور فارسی رسم الخط کو آسان بنانے کے لئے خط و فرہنگ کودک دبیرہ اور نوشتن و خواندن در دو ھفتہ لکھیں ۔ عربی زبان کے نقائص گنوانے کے لئے انہوں نے زبان ایران ، عربی یا فارسی کے نام سے ایک رسالہ لکھا اور عربی زبان کی مشکلات اور پیچیدگیوں سے بحث کرکے عربی الفاظ کے اخراج کی تلقین کی.ایک عربی فارسی لغت بھی مرتب کی، جس میں عربی کے مقابل فارسی الفاظ بھی لکھے ہیں ۔ ان کے متبعین میں ڈاکٹر صادق کیا اور پروفیسر محمّد مقدم معروف ہیں ۔ بعض حلقوں سے اس تحریک کی مخالفت بھی ہوئی ہے ۔ اور زبان کے ماہروں نے اس تحریک کو زبان کے طبعی ارتقاء کے منافی سمجھا ہے ۔ علامہ محمّد قزوینی اور بہار جیسے محققوں نے معتدل راَہ اختیار کرنا ہی مناسب سمجھا ۔ استاد عباس اقبال ، استاد بہمنیار ، اپنی تحریروں میں بے تکلف کثرت سے عربی الفاظ استعمال کرتے تھے اور اب ڈاکٹر ذبیح اللّٰہ صفا کا طرز تحریر بھی انہی سے ملتا جلتا ہے ۔ ادبیات فارسی میں عربی الفاظ اس قدر سرایت کر چکے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ناخن کو گوشت سے جدا کرنا ہے ۔ اجتماعی ، اقتصادی مضامین اور فلسفہ و سیاست کی اصطلاحات کے لئے عربی الفاظ و مرکبات نہایت موزوں و مناسب تھے ۔ اس لئے صحافی اور ادیب اخبار و رسائل میں عربی الفاظ استعمال کرنے کے لئے مجبور ہوگئے ۔ آج کل عربی الفاظ مثلاً مجلس شورای ملّی، وکیل، مسئولیت، تجدد ، استبداد ، قوہ مجریہ ، مشروطہ ، حقوق ملّی ، حقوق بین المللی انقلاب ، معاون وغیرہ ہر جگہ استعمال ہوتے ہیں ۔

بخش دهم :

پہلوی دور میں فارسی ادب کا جائزہ

شاعری

دورۂ حکومت پہلوی میں شعراء کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

اوّل : وہ شعراء جو متقدمین کے کلاسیکی انداز میں لکھتے رہے ہیں ۔ انہوں نے بزرگوں کی پرانی روش کے مطابق قصیدہ، غزل ، قطعہ ، رباعی میں اپنے خیالات کا اظہارکیا ہے مثلاً ادیب الممالک امیری ، بہار، جلال همائی ، وحید دستگردی ، حبیب یغمائی ، لطف علی صورتگر ، رعد تبریزی ، پژمان ، ادیب طوری وغیرہ ۔

دوم : وہ شعراء جنہوں نے مغرب کی تقلید میں مالیات و معنی دونوں میں نئی راہ نکالی . انہوں نے پرانی روش میں بھی اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں ۔ مثلاً محمّد حسین فروغی ، علی اکبر دھخدا ، ایرج مرزا ، پروین اعتصامی ، عارف قزوینی ، عشقی،صادق سرمد، غلام رضا روحانی ، بہار ، فریدون توللی ۔

سوم : وہ شعراء جنہوں نے ہیأت تو پرانی رکھی لیکن معنوں کے لحاظ سے نئے افکار پیش کیے ۔ مثلاً بہار، فرخی یزدی، رعدی، رشید یاسمی ، سعید نفیسی ، موید ثابتی ، صورتگر ، رہی معیری ، نصر اللّٰہ فلسفی وغیرہ ۔

موضوع کے اعتبار سے بھی شعراء کے کلام کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے مثلاً :

۱- اشعار وصفی : اس قسم کی اچھی نظمیں لکھنے والوں میں بہار ، رشید یاسمی ، وحید دستگردی ، رعدی و رہی معیری کا نام لیا جاسکتا ہے ۔

۲- اشعار وطنی : اس موضوع پر ایران اور ایرانی یادگاروں پر فخریہ اشعار کہے گئے ہیں اور وطن پرستی کے جذبات کا اظہار جوش و اخلاص سے کیا گیا ہے ۔ پرانے اساتذہ میں سے ادیب الممالك ، ادیب پشاوری ، فروغی ، عشقی ، دانش مشہدی وغیرہ اور ایران قدیم کے آثار مناظر پر لکھنے والوں میں بہار ، صورتگر ، جلال ہمائی ، حسین مسرور معروف ہیں ۔

۳- اشعار تاریخی : اس موضوع پر وہ نظمیں ہیں جن میں ایران اور دنیا کے سیاسی و تاریخی انقلابات و حوادث کا ذکر ہے ۔ مثلاً جنگ و صلح ، کنفرانس ، قتل بادشاہ اور بنای حکومت نو وغیرہ ۔ اس سلسلہ میں ادیب الممالك ، شوریدہ ، بہار ، افسر،

عشقی ، فرخی یزدی ، وحید دستگردی کی اچھی نظموں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے ۔

۴- **اشعار مترجم** : یہ وہ اشعار ہیں جو غیر زبانوں سے فارسی میں ترجمے کئے گئے ہیں مترجمین میں سے حیدر علی کمالی ، نصر اللّٰہ فلسفی ، رشید یاسمی ، حسن وثوق الدّوله ، ڈاکٹر خانلری اور لاہوتی کے نام لئے جا سکتے ہیں ۔

۵- **سرمایہ دار، مزدور اور شوشلزم پر اشعار** : اس موضوع پر لکھنے والوں میں سے فرخی یزدی، لاھوتی ، رعدی ، پروین گنابادی ، علی اشرف دبیر ، عشقی ، کاظم رجوی کے نام معروف ہیں ۔

۶- **اشعار انتقادی** : اس موضوع پر ان شعراء کی نظمیں شامل ہوسکتی ہیں جنہوں نے حکومت، سرکاری اداروں اور اجتماعی خرابیوں پر تنقید کی ہے مثلاً ادیب الممالك ، علی اکبر دھخدا، وحید دستگردی ، سید اشرف گیلانی ، غلام رضا روحانی وغیرہ ۔

۷- **اشعار اخلاقی** : یعنی وہ نظمیں جو بری عادات و رسوم کی مخالفت اور تنقید اور اچھی عادات اور بلند اخلاق کی ترویج اور تشویق کے لئے لکھی گیئں ۔ اس طرز کے اشعار میں بہار، ایرج مرزا ، وحید دستگردی، حبیب یغمائی ، جلال همائی ، رعدی ، پروین اعتصامی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں . اس موضوع پر ترکیب بند، مسمط ، قطعات اور فکاہی نظمیں اکثر رسائل و جرائد میں چھپتی رہتی ہیں ۔

۸ - **نسائیات** : اس عنوان پر عورت کے سیاسی اور اجتماعی حقوق کی نگہداشت ، جنس لطیف کے بلند مقام اور آزادی پر بہت سے اشعار لکھے گئے ہیں . مثلاً پروین اعتصامی ، ژاله اصفهانی ، جنت تہرانی ، بہار ، حسین سمیعی ، ایرج مرزا اور روحانی وغیرہ کے اشعار قابلِ قدر ہیں ۔

۹- **اشعار صنایع عصری** : اس موضوع پر عصر حاضر کی اختراعات اور ایجادات سے متعلق شعراء نے نظمیں لکھی ہیں ۔ یہ خاص خاص نظمیں مجدی کردستانی ، ابو الحسن مرزا ، فروزانفر، صورتگر، روحانی، حسین شجرہ اور افسر کے فکر کا نتیجہ ہیں .

۱۰- **اشعار تربیتی** : یعنی بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے مدارس اور نئی درسگاہوں سے متعلق اشعار . اس عنوان پر مندرجہ ذیل شعراء کے قطعات کا ذکر کیا جاسکتا ہے . مثلاً عبدالعظیم قریب ، سمیعی ، ہدایت ، محیط طباطبائی ، ادیب طوسی،جلال همائی ، ابو الحسن فروغی وغیرہ .

۱۱- اشعار موسیقی : وہ نظمیں جو موسیقی کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں مثلاً تصنیف ، ترانہ اور سرود وغیرہ۔ اس قسم کی نظموں میں عشقیہ ، طنزیہ اور انقلابی جذبات کا اظہار کیا گیا ہے ۔ ایسی نظمیں لکھنے والوں میں بہار ، عارف ، امیر جاہد ، افسر ، گل گلاب اور قریب مشہور ہیں ۔

ملك الشعراء بہار نے طبقہ دوم میں شامل شعراء کے متعلق مندرجہ ذیل نظم میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور ساتھ ہی اپنے مقام و مرتبہ کا تعین کیا ہے ۔

بدعت افگند ز چندی زاهل هوش سبکهای تازه با جوش و خروش
لیك زشت آمد به گوش

سه بسر تصنیف عارف لیك بود سبك عشقی هم بدان نزدیك بود
شعر ایرج شیك بود

نیك بودند این سه تن از اتفاق در فن خود هر سه قاآنی مذاق
گاه لاغر گاه چاق

بود ایرج پیرو قائم مقام کرده از او سبك و لفظ و فکر وام
عارف و مشقی عوام

احمدای ، سید اشرف ، خوب بود احمدا گفتن ازو مطلوب بود
شیوه اش مرغوب بود

سبك اشرف تازه بود و بی بدل لیك هپ هپ ناز بودش در بغل
بود شعرش منتحل

بعد از آنها گشت روحانی علم آن که در شعرش اجنه زد رقم
خوب گوید لیك کم

دیگری پژمان و دیگر شهریار شعرهاشان تازه است و خوشگوار
هر دو لیکن کند کار

قطعه های افراز روی یقین هست طرز قطعه ، ابن یمین
لیك محدود است این

شعر سرمد هست شیرین چون عسل چامه و قطعه ، دو بیتی و غزل
شیوه اش نا منتحل

نورترین سبکی که دردست شماست بار اوّل از خیالِ بنده خاست
دفتر و دیوان گو است

شعر کہنہ و نو

جب یورپی شاعری کے ترجمے ہوئے اور ایرانی ذہن نئی ہیتوں اور نئے افکار و احساسات سے آشنا ہوا تو نوجوانوں نے اپنی زبان میں بھی اسی طرز و ہئیت میں تجربے شروع کئے ۔ ملک میں سیاسی و تمدنی بدلتے ہوئے حالات نے بھی لکھنے والوں کو قدیم روائتوں سے بغاوت پر آمادہ کیا اور انہوں نے صنف شاعری کی مروّجہ ہیتوں ، بحورو اوزان و بیان و بدیع کے تکلفات کو خیرباد کہہ کر بے قافیہ نظمیں لکھنا شروع کیں ۔ پرانی تشبیہات اور روایتی استعارات کے بجائے نئے الفاظ اور نئی ترکیبیں وجود میں آئیں ۔ نئی روش کے حامیوں نے اپنے تجریدی خیالات کو مبہم انداز میں پیش کیا اور بعض نظمیں بے آہنگ نثر بن کر رہ گیئں . کلاسیک انداز کے پیرو بزرگوں کو ایسی جدید شاعری پر غصہ آیا اور انہوں نے ایسی نثر نما شاعری کا مذاق اڑایا ۔ مدتوں تک بحثیں چلتی رہیں ۔ احمد کسروی نے «در پیرامون شاعری» ، ایك مقالہ لکھا اور شاعری میں نئے رجحانات پیدا کرنے کی تلقین کی ۔ وحید دستگردی نے انقلاب ادبی کے نام سے ایك رسالہ لکھا اور نئی شاعری کے دلدادوں کی مذمت کی ۔ ابھی تك یہ بحثیں جاری ہیں ۔ اخبار اور رسائل میں مخالف و موافق رائے کا اظہار کیا جاتا ہے ۔ نئی طرز کے حامیوں نے کہا ۔ قدیم شاعری پرانے ماحول کی پیداوار تھی ۔ لوگ اپنے اپنے زمانہ کے مطابق سوچتے اور لکھتے تھے ۔ اب مدحیہ قصاید کا عہد گیا ۔ رزمیہ مثنویوں اور عشقیہ داستانوں کے زمانے لد گئے ۔ سراپائی غزلوں کاوقت نہیں رہا ۔ ایك ہی قسم کی تشبیہات و استعارات بھی مکروہ اور ناپسندیدہ ہو گئے ۔ سخت قافیوں اور بے جا ردیفوں کی پابندیوں سے معانی و مطالب بیان کرنے میں دقتیں پیدا ہوتی ہیں ۔ اب نئے قسم کے مناظر دریا ، پہاڑ نئے مشاہدات ، حسن و جمال کی نئی زیبائشیں ، عقل و فکر کے نئے تجربات اور نئے معاشی و معاشرتی مسائل بیان کرنے کے لئے آسان اور بلیغ شاعری کی ضرورت ہے ۔ بحور و اوزان کی پابندی اور قصیدہ و غزل کی ہیئّت اظہار خیالات میں رکاوٹ پیش کرتی ہے ۔ قدیم روش کے حامیوں نے کہا نئے شاعروں نے بے قافیہ نظمیں لکھ کر اور قافیہ وزن کی پابندی چھوڑ کر آہنگ و موسیقی کا تانا بانا بکھیر دیا ۔ ایك ہی نظم میں چھوٹے بڑے جملے ہونے کی وجہ سے اشعار میں متانت اور استواری نہیں رہتی ۔ ایسے اشعار حافظہ میں بھی محفوظ نہیں رہتے ۔ ان کے مطالب سمجھنے میں بھی تعقید پائی جاتی ہے ۔ نادرپور نے شعر نو کی حمایت میں اپنے مجموعہ کلام چشمہا و دستہا کے دیباچے میں اور فریدوں تولّلی نے اپنے مجموعہ کلام « رہا » کے دیباچے میں شعر نو کی حمایت میں دلائل پیش کئے ہیں اور کہا ہے کہ دنیا کی وسیع و غنی زبانوں

میں نظم عاری، نظم بے قافیہ کے بہترین نمونے پائے جاتے ہیں . افکار نو کے لئے ہیئت نو اور کلمات نو ہی موزوں اور مفید ہو سکتے ہیں ۔ نئے رجحانات سے متأثر اور نئے افکار کے مدعی لیکن کلاسیك طرز میں لکھنے والے شعراء کی یہ رائے عام پسند کی جاتی ہے کہ خیالات میں تو بے شك جدّت اور قومی و ملّی ضرورتوں کا بھی خیال ہو لیکن وزن و قافیہ کی پابندی ضرور برقرار رکھی جائے ۔ چنانچہ اکثر اسی نظریہ کی حمایت کی جا رہی ہے.

روزنامہ تجدد (تبریز) اور مجلہ آزادیستان (تبریز) میں تقی رفعت بانو شمس کسمائی اور جعفر خامنہ ای نے تقریباً ۱۲۹۷- ۱۳۰۰ ش کے درمیان فرانس اور ترکی میں نئی شاعری کے زیر اثر ایسی منظومات شائع کیں جن میں پُرانی ادبی روایت سے انحراف تھا ۔ ہیئت بھی نئی تھی اور موضوع بھی نیا ۔ مصرعوں کو چھوٹا بڑا کیا اور قوافی کی پابندی بھی نہ کی ۔ عشقی اور رشید یاسمی نے قدیم مروجہ قالبوں میں ترمیم اور تجدید کرکے اپنے اشعار کو نئی شکلوں اور نئے قالبوں میں پیش کیا ۔ بعد کے شعراء میں نیما کا نام سرِ فہرست ہے جس نے شعر جدید کے اس اسلوب کو ایك تحریك کے طور پر پیش کیا اور اس کا رواج دیا ۔ اکثر نوجوان شعراء نے اس کی پیروی کی ۔

نادر نادرپور نے شعر نو یا شعر امروز کے متعلق جس رائے کا اظہار کیا ہے ۔ مزید توضیح و توجیہ کی خاطر اس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے ۔

شعر نو یا شعر امروز : نادر نادر پور نے شعر انگور کے دیباچہ میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے :

« بعض کہتے ہیں کہ آج کل دو قسم کے اشعار ہیں ۔ شعر نو اور شعر کلاسیك لیکن میرا خیال ہے کہ موجودہ زمانے میں شعر نو کے سوا اور کچھ استادان قدیم کی تقلید میں لکھا جا رہا ہے ، وہ شعر نہیں» .

شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اجتماعی حوادث و مشکلات کا ان کے وقوع سے قبل یا ان کے ہم عصر احساس کرے ۔

شعر نو میں دو اصول واضح ہونے چاہیں :

۱- دید تازہ ۔ ۲- بافت تازہ ۔

دید تازہ سے مراد اشیاء و موجودات کا نیا احساس و ادراك ہے ۔ شاعر زندگی اور قدرت کے نئے نئے گوشوں کو آشکار کرتا ہے ۔ شاعر کا احساس و ادراك نیا ہوتا ہے ۔ تو اس کا بیان ، تعبیرات ، کلمات و ترکیبات بھی تازہ ہوتے ہیں ۔

محض پرانی ہستیوں کو توڑنا ، مصرعوں کو چھوٹا بڑا کرنا ، قافیوں کو ترك کرنا ،

تجدید و تجدد کی دلیل نہیں ۔ جس کسی نے بے قید و بند شعر کہے وہ شاعر نو پرداز نہیں کہا جاسکتا ۔ پرانی ہیئتوں میں نئے شعر کہے جا سکتے ہیں ۔ مثلاً شہریار کی غزلیات اور ڈاکٹر رعدی کا قصیدہ « زگاه ». ہم غزل و قصیدہ یا شعر آزاد کے مخالف نہیں لیکن چاہتے ہیں کہ ہئیت اور مضمون کا تناسب سمجھا جائے ۔ اور مظروف کو مناسب ظرف میں رکھا جائے ۔

۳ شہریور ۱۳۲۰ھ .ش کے بعد نوجوانوں میں ایک تبدیلی آئی وہ پرانی نسل کے مراسم چھوڑ کر تجدد کی طرف مائل ہوئے ۔ لیکن یورپی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ ان میں ابھی مشرقیت کے آثار باقی تھے ۔ اس لئے ابھی ان کی حیثیت دوغلی تھی ۔ نئی نسل کے شعرا میں وحشت ، ہراس ، اندوہ ، مرگ ، بیگانہ ، ناشناس ، ناپائیدار قسم کے الفاظ ملتے ہیں ۔ جن سے اندرونی احساسات منعکس ہوتے ہیں ۔ دور مشروطیت کے ابتدائی زمانے میں اجتماعی اور سیاسی مسائل پرموزوں کئے گئے اشعار ایک طرح سے اخباری مقالات سے مشابہ تھے ۔ ۱۳۲۰ھ. ش کے بعد شعراء شخصی احوال و کوائف کی طرف مائل ہوگئے ۔ قبل الذکر دورکے شعرا مثلاً ادیب الممالک اور بہار کے کلام میں جوش و خروش اور ہیجان پایا جاتا ہے ۔

۱۲۲۲ھ.ش. میں ڈاکٹر پرویز خانلری نے صادق ہدایت ، ڈاکٹر شہید نورانی اور رضا برجانی کی اعانت سے مجلہ سخن جاری کیا ۔ اس میں شعر ، شاعری کے بارے میں مقالات شائع ہوئے اور اروپائی شعراء میں سے بودلر اور ریلکہ کے منظومات کے تراجم شائع ہوئے اور دوسرے نئے لکھنے والے ممتاز صاحب طبع شعرا کا کلام شائع ہوا ۔

« تولّلی درمیان شاعران ہم نسل خود نیما ، خانلری ، گچین ، لاہوتی ، پس از نیما بیش از ہم ، برروی شاعران نسل بعد (کہ سخنوران جوان امروزند) تاثیر کرده و لذا باید او را حد فاصلی بین نسل سالدیده و نسل جوان کنون شمرد » ۔

۱۳۲۳ھ.ش / ۱۹۴۴ء میں ڈاکٹر خانلری نے اپنے مقالہ ، شعر نو میں لکھا ہے ۔ کہ شاعر وہ ہے جو زندگی سے نئے اور خصوصی مطالب اخذ کرے اور ان کو بیان کے قالب میں ڈھالے اور دوسروں تک منتقل کرے ۔ پھر ۱۳۲۵ ھ.ش/ ۱۹۴۶ء میں جوانہ ھای شعر نو کے عنوان سے لکھا اور بتایا کہ نوجوان نئے موضوعات تلاش کرتے ہیں ۔ اور بیان کے نئے اسلوب کام میں لاتے ہیں ، اگرچہ اس کوشش میں وزن و قافیہ کو توڑتے پھوڑتے ہیں . فصاحت کاخیال نہیں کرتے ۔ پھر بھی ان کی طفلانہ کوششوں سے ظاہر ہے کہ وہ قدیم مضامین کی تکرار و تقلید سے بیزار ہیں ۔

اسماعیل نُوری علا نے اپنی کتاب « صور و اسباب در شعر امروز ایران » ، میں

۱۳۲۰ ھ . ش ۱۹۴۱ء سے ۱۳۲۱ ھ .ش ۱۹۶۸ ء کی شاعری کا تجزیہ و تحلیل پیش کیا ہے ۔ ان کے خیال میں نیما کے تتبع میں شعر جدید کے پیشرو منوچہر شیبانی اور اسماعیل شاہرودی شمار ہوتے ہیں ۔ ان کے بعد کچھ ایسے شاعر نمودار ہوئے جو نیما سے روش سے مطابقت کے ساتہ ساتھ نئی راہیں بھی تلاش کرتے رہے ۔ ان میں سے احمد شاملو (۱- بامداد) اور سہراب سپہری کا نام لیا جا سکتا ہے ۔ اسی زمانے میں دو اور اُبھرتے ہوئے شاعر لکھنے میں مصروف تھے جو میانہ روی کے قائل تھے اور شعر قدیم ایران سے بھی متاثر تھے اور شعر میں ابہام سے اجتناب کرتے ہیں ۔ ان میں ہوشنگ ابتہاج (۱- سایہ) اور سیاوش کسرائی نامور تھے ۔ مہدی اخوان ثالث (م - امید) شعر آزاد کے قائل ہیں لیکن سبک خراسانی اور سبک مازندرانی کے بیس بین چلتے ہیں ۔ نئے لکھنے والوں میں جو شعرکے نئے اسلوب کے ساتھ نئے مضامین لانے میں کوشاں تھے ، ان میں سے نصرت رحمانی ، ید اللّٰہ رؤیائی اور فروغ فرخزاد معروف ہیں ۔ ان شعراء میں جو نئے نئے اسالیب کے امکانات کی تلاش میں رہتے ہیں محمود مشرف آزاد کا نام سربرآوردہ ہے ۔ اورجو شاعر پیکر تراشی (تصویر سازی) کو اہمیت دیتے ہیں ان میں سہراب سپہری کا نام لیا جا سکتا ہے ۔

نادر نادر پور شعر نو کے مروّج شمار ہوتے ہیں . لیکن قدیم روایت سے نہیں ہٹنا چاہتے . نئے اجتماعی تحول کے زیر اثر شعر نو میں ایك موج نو وارد ہوئی ۔ اس نئی تحریك کے ہیرو محمّد علی سپانلو شمار ہوتے ہیں ۔ اور اسماعیل نوری موج نو سے متعلق لکھتے ہیں :

۱- شاعر به بارهای اجتماعی و تاریخی ادوات شعری نظر دارد.

۲- شاعر شکل ترکیبی این ادوات را مورد توجه قرار می دهد.

۳- قدرت خیال انگیزی و نیز تجسم آنها را مورد استفاده قرار می دهد ۔

شعرائے جدید کے مجموعہ ھائے کلام مشکل سے ہی دستیاب ہوتے ہیں ۔ اس لئے ان کا تعارف صور و اسباب در شعر امروز ، اور ادبیات دورۂ بیداری و معاصر کے توسط ہی سے پیش کیا جا سکا ہے ۔

شعراء

احمد شاملو (ا- بامداد) (ولادت ۱۳۰۴ ھ.ش./۱۹۲۵ء)

شاملو خود کہتے ہیں کہ شعر و شاعری سے مجھے خاص لگاؤ تھا ۔ نیما نے مجھے شعر کی حقیقت سمجھائی اور میں ان کی « ناقوس » پڑھ کر اس طرف مائل ہوا ۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے نزدیك شاعری صنایع شعری پر تسلط سے نہیں آتی بلکه میرے خیال

میں شعر کا ایک قالب شاعر کے ذہن میں آتا ہے ۔ نقاشی ، شعر اور رقص کا ایک ہی مفہوم ہے ۔ اصل مقصد خیال و فکر کی دریافت ہے ۔ پھر اس کا بیان ہے ۔ شاملو شعر سپید شعر معرّا یعنی بے وزن شعر کے حامی ہیں ۔

شاملو کا پہلا شعری مجموعہ « آهنگهای فراموش شده » شائع ہوا ۔ کسی نے اس کی طرف اعتنا نہ کیا دوسرا مجموعہ « آهن ها و احساس » تھا ۔ اس کو بھی کامیابی نہ ہوئی تیسرا مجموعہ « قطعنامه » کےعنوان سے شائع ہوا ۔ اس میں اکثر اشعار تند اور اجتماعی شعور کے حامل تھے ۔ اس کتاب کے بعض اشعار اِدھر اُدھر شائع ہوئے ۔ چوتھا مجموعہ «هوای تازه » کے چھپنے سے معلوم ہوا کہ وہ محض نیما کا مقلد نہیں بلکہ خود بھی نئی چیزوں کی تلاش میں ہے ۔ پانچواں مجموعہ « باغ آینه » کے شائع ہونے سے شاملو کا کافی چرچا ہوا ۔ لوگ اسے « شاعر مردم » کہنے لگے ۔ هوای تازه میں سے ایک نمونہ دیکھئے :

برف آب شد ، شگوفه رقصید ، آفتاب درآمد
من بخوبی ها نگاه کردم و عوض شدم
من بخوبی ها نگاه کردم
چرا که تو خوبی و این همه ی اقرار هاست ، بزرگترین اقرارهاست

چھٹا مجموعہ « آیدادر آئینه » کے عنوان سے ۱۳۵۰ھ.ش./۱۹۷۱ء میں شائع ہوا ۔ اس مجموعہ کے اشعار میں آگ زیر خاکستر چھپ گئی ہے ۔ شاعر کے فکر پر غم وتأسف چھا گیا ہے ۔ وہ زیادہ سنجیدہ ہوگیا ہے ۔ مثلاً :

جنگل آئینه هـــا فرو ریخت
در سولان خسته به بهار شهیدان پیوستند
و شاعران به تبار شهیدان پیوستند
چونان کبوتران آزاد پروازی که به دست غلامان ذبح می شوند ۔

ساتواں مجموعۂ « ققنوس‌دریاران » کے نام سے شائع ہوا ۔ اس میں شاملو پختہ تر اور داناتر ہوگیا ۔ وہ اپنے تجربات نژاد نو کے سامنے پیش کرتا ہے ۔

آٹھواں مجموعہ" نطعنامه"کے عنوان سے ۱۳۶۰ ھ.ش. میں سامنے آیا ۔

شاملو کے اور بھی شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں ۔ ۱۳۴۸ھ.ش میں «مرثیه های خاك» ۱۳۴۹ھ.ش ۔ میں « شگفتن درمه» - ۱۳۵۲ ھ.ش. میں « ابراهیم در آتش » ۱۳۵۳ ھ.ش.میں «هوا و آئینه ها » ،۱۳۵۶ھ.ش. میں « دشنه در دیس » شائع ہوئے ۔ ان مجموعوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے موضوعات میں تحول آ رہا ہے ۔ اجتماعی

اورحماسی مضامین سے ہٹ کر عاشقانہ موضوعات آ رہے ہیں ۔ آخر میں اس کے افکار فلسفیانہ عمیق اورعلاقائی ہوئے جاتے ہیں ۔ اجتماعی اور غنائی دونوں قسم کے موضوعات ملے جُلے ملتے ہیں ۔ آخری مجموعہ «دشنه در دیس » سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اشعار پُرتحرک زندہ اور روبہ تکامل ہیں ۔

شاملو نے عوامی لہجہ اور بولی میں شعر کہے ہیں ۔ مثلاً پرج ، دخترای تنه دریا قابل اعتنا نظمیں ہیں ۔اس نے مغربی منظومات کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا . le passoge ناول کا فارسی ترجمہ « برزخ » کے نام ۱۳۳۴ھ .ش میں شائع کیا .

احمد شاملو شعر کے مقصد و موضوع سے متعلق لکھتے ہیں :

امروز شعر حربۂ خلق است
زیرا که شـــــاعران
خود ساقه ای از جنگل خلقند
نه یاسمین نه سنبل گلخانه فلان

وہ کہتے ہیں : شعر یعنی دست نہادن به جراحات شهر پیر ... شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ شہرو دیار کے دکھوں کو بیان کرے اور دکھیا دلوں کو خشنود کرے ۔ شاعر خالی اور ٹھنڈے دلوں میں زندگی کی اُمنگ پیدا کرے اور اسی طرح آگہی و بیداری عطا کرے .وہ اپنی شاعری کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ میری کامل خود نوشت ہے ۔ شعر سے مراد زندگی کے تأثرات نہیں بلکہ وہ خود یکسر زندگی ہے ۔ تنگدستی اور نا انصافی کے واقعات خیالی نہیں بلکہ بیداری میں مجھ پر گزرے ہیں ۔

اسماعیل شاهرودی

شاہردوی کے پہلے شعری مجموعہ آخرین نبرد (۱۳۳۰ھ. ش) کے دیباچے میں نیما یوشیج لکھتے ہیں :

تمہیں توفیق حاصل ہو تو اِن زنگ آلود طولانی زنجیروں کو توڑنے کے لئے آخری نبرد کرو. جنھوں نے تمہارے اور تمہارے ابنائے جنس کی زندگی کو جکڑ رکھا ہے ۔

نیما نے یہ بھی لکھا تھا کہ پانچ چھ سال کے بعد تمہارا فن اور ٹیکنیک ترقی کرے گا ۔ شاہرودی نے اپنے دوسرے مجموعہ «آینده» (۱۳۴۶ھ.ش.) میں خود لکھا :

چنان بودم که در هر رهگذر و هر جا گذشتم
بیگانگان را سوخت رنج من، تلاش ، شتاب من
رسید آخر که رنج من بپوشانم به شادی های هستی
به امان هوسهایت نهادم سراسر دوائی ام را

شاہردوی زندگی سے وابستہ ہے وہ زندگی کی گیرودار میں حالت تشنج میں ہے ۔ مقصد و مسلك میں جس قدر ایمان محکم ہوتا ہے اس قدر احساسات بر افروختہ ہونگے اور فن بھی مقبول ہوگا ۔ وہ اپنے مجموعۂ کلام «آینده» میں اپنے دل و دماغ کی کیفیات کا یوں اظہار کرتا ہے :

در درون دل بی آرامم
که ز بسیار کسان ست نهان
جای خون است روان از همه سو
آتش سرکش و سر گردان
از دم آتش من وز گل اوست
دل دنیای . دل من گلشن
باز بان آمدی اوست که هست
ره آینده ، به چشم روشن

اس کے دو اور شعری مجموعوں کے نام یہ ہیں :

ہر سوی راه راه راه ..... ، ای میقات نشین (۱۳۵۱هـ.ش .)

ڈاکٹر حمید زریں کوب لکھتے ہیں :

« شاهرودی شاعر مردم است و شعر خود را همه جا وقف انسان و عشق به انسان ها کرده است » ۔

منوچهر شیبانی

۱۳۲۱ ش/۱۹۴۲ء سے شاعری شروع کی ۔ ۱۹۴۴/۱۳۲۳ء میں « جرقه » کے نام سے مجموعۂ کلام شائع کیا ۔ پھر ۱۹۶۴/۱۳۴۳ء میں «آتشکدۂ خاموش » کے نام سے دوسرا مجموعہ شائع ہوا ۔آخر میں « سرابهای کویر » کے نام سے تیسرا مجموعہ شائع ہوا ۔

«منوچهر تصویر ساز موضوعی است که در مخیله او جان می گیرد و عناصر آن بشدت به فعالیت می افتند و خیال او از راه تداعی معانی و تشبیه سازی به ترسیم حرکاتی سریع و تند می پردازد » ۔

شعر شیبانی ، باوجود زبان درہم ریخته و ناہموارش، دارای شکل قابل وقتی است لحن و وزن و ضربان شعر او به مقتضای معنی و ضرورت حال کلام تفسیر می کند و این تفسیر بسیار طبیعی و راحت است ۔

محمّد علی سپانلو می گوید : مسئله ی بیان گسترده و در عین حال مفهوم شعرهای شیبانی بهترین طرز موجود بیان برای نمایشنامه های منظوم را که جای آن در ادبیات امروز

ما خالیست ، ارائه می دهد » ۔

حمید زریں کوب نے لکھا ہے : شیبانی نماینده نسلی است که زندگی و دنیای قدیم بر ایشان روّیا انگیز و لذت بخش است ۔ ہر چند محتوای شعر شیبانی صد در صد شعر اجتماعی امروز نرسیده امّا سعی می کند سطحی از آن را در ابیاتی توصیفی ارائه بدهد ۔

زبان او پُرتوان و پُر تحرك است ۔

فروغ فرخ زاد

فروغ ۱۳۱۲ش /۱۹۳۳ء میں پیدا ہوئی ۔ دبیرستان کے تیسرے سال میں تھی کہ شادی کرلی ۔ اس کے شوہر بڑے مہربان ، ہمدرد اور ہنر دوست تھے ۔ اس نے خیاطی کی تعلیم بھی حاصل کی اور ہنرستان کمال الملك میں مصوری بھی سیکھی ۔ ۱۳۴۵ ش/۱۹۶۶ء میں کار کے حادثہ میں فوت ہوئی ۔ اس کے مندرجہ ذیل مجموعہ کلام شائع ہوئے :

اسیر ۔۱۳۳۴ ھ ، دیوار ۔۱۳۳۶ ھ ، عصیان ۔ ۱۳۳۷ ھ ، تولدی دیگر.

ان عنوانات سے ظاہر ہے کہ شاعرہ زندگی کی دیوار میں اسیر ہے . اور عصیان کے راستے آزاد ہونا چاہتی ہے ۔ لیکن «تولدی دیگر» میں وہ فلسفۂ تجدید حیات لئے ہوئے منظر عام پر آئی ہے ۔ اس کے افکار میں وسعت آئی ہے اور وہ مفکر کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہے ۔ اس نے عاشقانہ کلام کے ساتھ ساتھ معاشرہ پر سخت تنقید کی ہے ۔

فروغ نے بڑی حساس طبیعت پائی تھی ۔ معاشرتی روایات کی پروا کئے بغیر وہ اپنے جذبات کا برملا اظہار کرتی تھی ۔ اس دلیری و بیباکی کی وجہ سے اس کا نام زبانوں پر آنے لگا ۔ فروغ نے لکھا ہے کہ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اسیر ، دیوار اور عصیان جیسی کتابیں شائع کیں کیونکہ ان تینوں کتابوں میں میں نے بیرونی دنیا کو بیان کیا ہے اس زمانے میں شعر میرے اندر تحلیل نہیں ہوا تھا بلکہ وہ شوہر ، معشوق اور آدمیوں کی طرح تھوڑی مدت کے لئے میرے گھر میں رہتے تھے . فروغ کو زندگی اور فن سے عشق تھا ۔ لیکن اسے شکست و ناکامی کا سامنا ہوا ۔ اس لئے وہ ہر چیز کے خلاف طوفان کھڑا کرنا چاہتی تھی ۔ وہ گناہ کی طرف راغب تھی وہ درد و سوز و فراق و تنہائی سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی ۔ فروغ کو یقین تھا کہ شعری زندگی بوجود می آید و شاعر باید زندگی شاعرانه داشته باشد ۔

«تولدی دیگر» میں فروغ «همه چیز را با دیدی روشنگرانه می بیند ۔ اندیشه اش درای جسم است و دیگر به خود و به تن خود نمی اندیشد بلکه به چیزی وسیع تر فکر

می کند ۔ به اجتماع به زندگی به ہستی و به انسان» ۔

فروغ بیباکی سے جنسی تلذذ کی بات کرتی ہے ۔ مثلاً :

همسایه روی سایه ای خم شد در نهانگاه راز پرور شب
نفسی روی گونه ای لغزید بوسه ای شعله زد میان دو لب

اپنے شعر کی دفاع میں مردوں کے خلاف نبرد آزما ہے ۔

ولی ای مرد - ای وجود خود خواه مگو ننگ است این شعر تو ننگ است
برای شاعری شوریده چون من ندانی این قفس تنگ است تنگ است
مگو شعر تو سر تا پا گنه بود ازین ننگ و گنه پیمانه ای ده
بهشت و حور و آب کوثر از تو مرا در قصر دوزخ خانه ای ده

رضا براہنی فروغ کے بارے میں لکھتا ہے :

« در فرخزاد یك من وجود دارد که حاکم بر ہمه چیز است ۔ این من یك من تغزلی است که گاهی سر اجتماعی در می آورد و گاهی سر از فلسفه » ۔

فروغ خود کہتی ہے :

کار هنری یکجور تلاش است برای باقی ماندن و یا باقی گذاشتن خود و نفی معنی مرگ ۔

من ، من که هیچگاه ۔
جز باد باد کی سبك و دلگرد ۔
بر پشت بامهای مه آلود آسمان ۔
چیزی نبوده ام ۔
و عشق و میل و نفرت و دردم را ۔
در غربت شبانه ی گورستان ۔
موشی بنام « مرگ » جویده است ۔

« فرخزاد درعرفان در عشق در نفرت و حتی در طنز همیشه به این آگاهی مجهز است و عین آگاهی است که خامی را قابل بخشش می کند ۔ (۱)

مہدی اخوان ثالث ، امید

اخوان نے ابتدائی زندگی مشہد میں گزاری جہاں اس کے والد تاجر تھے ۔ وہیں وہ کلاسیکی شعراء سے آشنا ہوئے اور وہیں انہوں نے پرانے اسلوب میں قصیدہ و غزل میں

۱- صور و اسباب در شعر امروز ص ۲۹۱ ۔

اشعار لکھے ۔ ان کا پہلا مجموعۂ اشعار « ارغنون » ، کلاسیکی روایت کا نمایندہ ہے ۔ بعد میں وہ تہران آئے اور نیما سے آشنا ہوئے اور اس کی روش پر لکھنے لگے ۔ ان کا دوسرا مجموعہ ۱۳۳۵ ش میں « زمستان » کے نام سے شائع ہوا اور وہ شاعر نو پرداز کی حیثیت سے پہچانے گئے ۔ ۱۳۳۸ش میں «آخر شاهنامه » ۱۳۴۵ میں « ازین اوستا » شائع ہوئے ۔ ایك اور مجموعه « پائیز در زندان » کے نام سے ۱۳۴۸ ھ میں شائع ہوا جس میں ۱۳۴۵ سے ۱۳۴۷ش تك کا کلام محفوظ کیا گیا اس کے بعد جرائد و رسائل میں متفرق کلام چھپتا رہا۔قالب و اسلوب کے اعتبار سے اخوان نیما سے بھی ایك قدم آگے رہے ۔

اخوان شعر میں وزن کے قائل ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں :

« وزن چیزی نیست که از خارج به شعر تحمیل شده باشد بلکه هم زاد و پیکرۂ روحانی و جسمانی شعر است ۔ شعر بدون قافیه تعادل و توازن و تناسب خود را از دست می دهد » ۔

« اخوان زبانی کامل ، مستقل و تازه بوجود آورده » ۔

ذهن اخوان پرشور و ناآرام و مبتکر و آفریننده است ۔

اخوان کے خیال میں شعر « داد نامه » اور «فریاد نامه» ہے جو ظالموں کی آنکھ کا کانٹا بنتا ہے اور مظلوموں کی فریاد ہے ۔ شعر انسانوں کے لئے روحانی پناہ گاہ ہے ۔ اخوان کہتے ہیں که شاعر کے لئے ضروری ہے که وہ تفکر و تأمل سے کام لے اور اپنے ماحول سے غافل نہ ہو ۔ وہ لکھتے ہیں :

« من اصلاً آدم هایی‌راکه خالی از تأمل،خالی از اندیشه و تفکر نسبت به زندگی و هستی و محیط اطراف خود باشند در حقیقت آدم نمی دانم »۔

اخوان کو انسانوں سے محبت ہے ۔ اس کا کلام انسانوں کی سرگذشت ہے ۔ جن انسانوں میں وہ زندگی بسر کرتا ہے ۔ ان کے غموں ناامیدیوں اور خوف و ہراس کو پہچانتا ہے اور ان کے درد و الم کو دیکھتا ہے اور اپنے مجروح دل سے فریاد کرتا ہے ۔

هوشنگ ابتهاج ، سایه

ابتہاج ۱۳۰۶ ش/ ۱۹۲۷ ء کو رشت میں پیدا ہوا سکول میں ہی تھا کہ شعر کہنے لگا ۔ ابتہاج کا پہلا مجموعه کلام ۱۳۳۵ ش میں «نخستین نغمه ها » ، کے نام سے شائع ہوا ۔ اس میں تقریباً تمام منظومات قدیم اسلوب میں تھے ۔ دوسرا مجموعه «سراب» ، کے نام سے شائع ہوا ۔ ابتہاج ، فریدون تولّلی ، نادر نادر پور اور گلچین گیلانی جیسے میانه رو شعراء سے آشنا ہو چکا تھا ۔ اس میں مضامین اور قالب کے اعتبار سے نئے رجحانات کی جھلك تھی ۔ اس نے اکثر دوبیتیاں لکھیں لیکن عروضی سرحدوں سے باہر نہیں نکلا۔ اس کا تیسرا مجموعه « شبگیر » کے نام سے ۱۳۳۲ ش ۔ میں شائع ہوا ۔ اس نے اس

مجموعے میں نیما کے نئے اسلوب سے متأثر ہو کر بے وزن قافیہ قطعات لکھے ہیں ۔ نادر نادر پور کے تجزیہ کے مطابق قطعات میں حدیث نفس کی بجائے اجتماعی مضامین آگئے ہیں لیکن ان کا رنگ وعظ و نعروں کا ہے ۔ سایہ کی طبیعت ان قطعات میں تابناک نظر آتی ہے ۔جن میں تغزل کا عنصر زیادہ ہے۔ سایہ کے دیگر شعری مجموعے حسب ذیل ہیں :

سیاہ مشق - ۱۳۳۲، زمین ۔ سیل - ۱۳۳۴ ، چند برگ ازیلدا - ۱۳۴۴ ، شبگر - ۱۳۶۰۔ یادگار خون سرد - ۱۳۶۰۔

سیاؤش کسرائی

کسرائی کا پہلا مجموعۂ شعر «کولی» کے عنوان سے ۱۳۲۷ ش میں شائع ہوا ۔ نادرنادر پور لکھتے ہیں کہ کسرائی کا تخیل شعری قوی ہے ۔ اس کی تشبیہات خوش رنگ اور شگفتہ ہیں ۔ اس کے دو بیتی اور ترانے مضامین لطیف کے حامل ہیں ۔ اس کا دوسرا مجموعہ « خانگی » کے نام سے شائع ہوا ۔ اس کے مضامین میں تنوع ہے ۔ اور وہ تغییر کا آرزومند ہے ۔ زندگی کے محسوسات سے بہرہ مند ہونا چاہتا ہے ۔ کسرائی کے دوسرے مجموعہ ھائے شعری حسب ذیل ہیں :

آرش کمانگر ۱۳۳۸ ، خون سیاؤش - ۱۳۴۲ ، با دماوند خاموش، فرهنگ ، ۱۳۴۵ ۔

محمّد علی سپانلو

سپانلو کا پہلا مجموعۂ کلام « آہ .... بیابان » تھا ۔ اس کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ شاعر کی کوشش ہے کہ وہ ہر شخص کے میلان کے مطابق بات کہے ۔ در اصل وہ اپنا تعارف کرانا چاہتا ہے ۔ محمود آزاد نے لکھا ہے :

« این مجموعه با هیچك از آثار اولیه شعرا قابل مقایسه نیست ».

دوسرا مجموعہ « خاك » کے نام سے ۱۳۴۴ ش میں شائع ہوا ۔ اس کے متعلق وہ خود کہتا ہے :

« در خاك ، من زیاد روی نکرده ام ، زیاد روی این کار کرده ام که فیلی بیاد بیاورم که خودم را نیست به مسئوولیت که مغزم به ذهن ، رویا و تداعی دارد ، مبرا کنم ».

تیسرا مجموعہ کلام ۱۳۴۶ میں دیوان رگبارہا ، کے نام سے شائع ہوا ۔ سپانلو کا عقیدہ ہے کہ قدیم ورثہ ہمارے وجدان ، ہمارے حافظے ، ہماری زندگی اور ہماری روایات پراثر انداز ہوتا ہے ۔ ہمارے سامنے ایسی دنیا ہے جو متمول ہے ۔ وہاں نئے نئے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے ۔ ہر روز نئے نئے مسائل کا سامنا ہوتا ہے ۔ کبھی یہ دنیا ہمارے ساتھ موافق ہوتی ہے اور کبھی مخالف ۔ انھی احوال و کوائف سے شعر میں تنوع پیدا ہوتا ہے ۔

سہراب سپہری

پہلے مرحلے میں شعر نو کے حامیوں میں سپہری کا شمار ہوتا ہے ۔ دوسرے مرحلے میں اس نے ، مکتب « تصویر سازاں » کی بنیاد رکھی ۔ تیسرے مرحلے میں « عرفان گرایان » کو وجود میں لایا ۔ مرگ رنگ (۱۳۳۰) اور زندگی خوابہا ، (۱۳۳۲) پہلے دور کے نمایندہ شعری مجموعے ہیں ۔«آوار آفتاب» (۱۳۴۰) تصویر سازی کا نمایندہ ہے ۔ سپہری کے باقی مجموعے « صدای پای آب (۱۳۴۴) اور حجم سبز (۱۳۴۶) هشت کتاب (۱۳۵۵) کے عنوانات سے شائع ہوئے ۔

نادر نادر پور نے لکھا ہے :

« من هر بار که یکی از اشعار سپهری را می خوانم ، می پرسم چگونه درین زمان می توان این قدر آرام و خوش بین بود » ۔

« سپهری در همین دوره به نگاهی نافذ و ذهنی ماوراء نگه مجهز می شود ۔ اکنون درخت برای او ارزش سمبولیك و اساطیری دارد » ۔

ید اللہ رؤیائی

رؤیائی کا پہلا شعری مجموعہ « رؤیائی ها » تھا دوسرا مجموعہ ۱۳۲۶ ش میں «دلتنگی ها » کے عنوان سے شائع ہوا ۔ اور وہ « نظم گرایان مشکل گو » میں شمار ہوا ۔ رؤیائی کا خیال ہے کہ شعر میں اجتماعی مضامین ہوں، تجربہ سے حاصل کئے ہوئے ہوں ۔ روزانہ معاملات سے دور نہ ہوں ۔ شعری آزادی سے لکھے جائیں ۔ عبدالعلی دست غیب لکھتے ہیں :

« قطعه های بسیاری در کتاب رؤیائی هست که شکل کامل خود را گرفته اند و تصویرهای تازه ای را نیز بیان می کنند ۔ واژه های ساده و هم آهنگ و پُر از طنین هستند و به ترکیب خویش به موسیقی شعر کمك می کنند » ۔

ڈراما

علی نقی وزیری ۱۹۲۴ء میں یورپی تحصیلات سے فارغ ہو کر ایران آئے تو انہوں نے ایك مدرسہ عالی موسیقی اور ایك کلب قائم کیا اور ایسے فیچر لکھے جو تھیٹر کی سٹیج پر پیش کئے گئے اور بہت مقبول ہوئے ۔ چونکہ یہ تمثیلیں مدرسہ کی عمارت میں ہی کھیلی جاتی تھیں اس لئے عورتوں کی جھجك بھی دور ہوئی اور انہوں نے بھی ان محفلوں میں شریك ہونا شروع کیا ۔

۱۳۰۵ ش (۱۹۲۷ء) میں اسماعیل مہرتاش نے « جامعه بارید » کے نام سے ایک کلب کی بنیاد رکھی ۔ اس ڈرامه کلب یا کمپنی کی غرض یه تھی که ہنرهای ملی ایران کو زنده کیا جائے چنانچه تھوڑے ہی عرصه میں انہوں نے لیلی و مجنوں ، خیام ، خسرو شیریں کے اوپیرا سٹیج کئے اور سٹیج کی آرائش میں نئے اضافے کئے ۔ یہی مہرتاش ہیں جو ایرانی موسیقی میں قطعات فکاہی اور « نشاط آور موسیقی » کے موجد ہیں ۔ ۱۳۰۹ ھ.ش (۱۹۲۱ء) میں ارباب افلاطون نے ایک مستقل تھیٹر « نکیسا »کی بنیاد رکھی . سیف الدّین کرمان شاهی نے سٹوڈیو درام کرمان شاهی آغاز کیا اور تھیٹر کی تکنیک سکھانے کے لئے ایک کلاس بھی جاری کی لیکن حریفوں کے حسد کی تاب نه لاکر اس نے ۱۳۱۲ش میں خودکشی کرلی ۔ ۱۳۱۲ سے ۱۳۱۷ش تک کا زمانه ایرانی ڈرامے کے زوال کا زمانه ہے ۔ پولیس کے تشدد، سنسر اورحکومت کی طرف سے بے اعتنائی کی وجه سے کوئی مستقل اداره نه رہا ۔ ۱۳۱۸ش(۱۹۴۰ء) سید علی نصر کی صدارت میں انجمن پرورش افکار کےتحت ایک شعبه تھیٹر بھی قائم ہوا .اسی سال « ہنرستان ہنرپیشگی » کے نام سے ایک مدرسه کا آغاز ہوا ۔ جس میں یورپی انداز میں تمام اصناف ڈرامه ، سٹیج ایکٹنگ اور تھیٹر کے متعلق عملی تربیت دی جاتی تھی ۔ یه ہنرستان اب تک قائم ہے ۱۳۱۹ش(۱۹۴۱ء) میں سید علی اور احمد دہقان نے ایک مستقل تھیٹر« تماشا خانه» تہران کے نام سے شروع کیا اور اس کے ساتھیوں رفیع حالتی ، غلام علی فکری اور فضل اللّٰه بایگان کی کوششوں سے فن ڈراما کی پھر قدر و منزلت ہوئی ۔ ان لوگوں نے خود ڈرامے بھی لکھے اور سٹیج بھی کئے ۔ اسی دور میں پردوں کے پہلے یا درمیان میں تصنیف ہائے سیاسی پڑھنے کا رواج ہوا اور « قطعات آہنگ دار» یا « پیش پرده » لکھنے کا طریقه عام ہوا ۔

دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹- ۱۹۴۶ء) کے دوران میں ایک بڑا سیاسی اقتصادی اور اجتماعی انقلاب آیا ۔ جہاں زندگی کے اور شعبے متاثر ہوئے ۔ ادب بھی نئے اثرات سے نه بچ سکا ۔ مصنفوں میں ایک نیا ولوله پیدا ہوا . لوگ نئے افکار سے آشنا ہوئے ۔ ان کا ذوق بھی بدلا اور اسی طرح ۱۳۲۰ء سے گویا ایران میں «تیاتر جدید» رونما ہوا ۔ ۱۳۲۲ء سے ۱۳۲۶ء (۱۹۴۴-۱۹۴۸ء) تک نئے تھیٹروں کی بنیاد رکھی گئی ۔ ان میں سے خاص طور پر «تیاتر فرہنگ» اور«تیاتر فردوسی» قابل ذکر ہیں ۔ سیاسی پارٹیوں نے بھی اپنے مقاصد کی تبلیغ کے لئے تھیٹر کو استعمال کیا ۔ اس لئے بھی ان میں خوب رونق رہی ۔ اس عرصے میں عبدالحسین نوشین کا نام اوج پر تھا ۔ جس نے نئے ڈراما کو اوج پر پہنچایا اور ڈراما نگاروں کے مشہور کھیل سٹیج کئے ۔ بن جانسن کاولپن ،

شیکسپئیر کا تاجر ونیزی ، مارسل پانیول کا توپاز ، پریستلی کا مستنطق اور میترلنگ کا پرندۂ آبی نہایت مہارت سے پیش کئے گئے جو بہت مقبول ہوئے ۔ نوشین نے ڈراما کی سب سے بڑی خدمت یہ انجام دی کہ ڈرامہ کی زبان کو آسان اور روزمرہ کے مطابق بنا دیا ۔

ایران میں تھیٹر اچھا خاصا مقبول رہا ہے ۔ سات آٹھ مستقل تھیٹر صرف تہران میں موجود تھے ۔ ان میں سے جامعۂ باربد . تماشا خانۂ تہران ، تیاتر پارس ، تیاتر فردوسی نام آور تھے ۔

نئے ڈراما نگاروں میں سے چند ایک نامور اشخاص کا ذکر کرتے ہیں ۔ ان کے علاوہ اور بھی نام ہیں ۔ جو تھیٹر کے لیے ڈرامے لکھتے ہیں :

علی نصیریان

بلبل سرگشته ، استعمال دخانیات ممنوع است ، بنگاه تأترال سیاه بازی

غلام حسین ساعدی

چوب به دستها ی ورزیل، آی با کلاه ۔ آی بی کلاه ، چشم در برابر چشم، بهترین بابای دنیا ، وای بر مغلوب. جانشین، دیکته ، زاویه ، ضحاك، پردار بندان ۔

بہرام بیضائی

هشتمین سفر سند باد ، پهلوان اکبر می میرد ، طلحك، گم گشتگان، میراث ، دیوان بلخ ، دنیای مطبوعاتی آقای اسراری ۔

اکبر رادی

افول ، از پشت شیشه ها ، ارثیهٔ ایرانی، صیادان ،

ڈراما نگار

اسماعیل خلج

حالت چطوره مش رحیم، گلدونه خانم، قمر در عقرب، پاتوغ ، صغرا دلاك ، بابا شیر علی، مثبات ، جمعه کشی، احمد آقا یرسکو ۔

ریڈیائی ڈراما

ریڈیو کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ ریڈیائی ڈراموں کا بھی رواج ہوا لکھنے والوں میں سے نصرت اللہ محتشم،ڈاکٹر ابوالقاسم جنتی اور سرہنگ زیدی کے نام لئے جاسکتے ہیں ۔ نصرت اللہ محتشم وزارت کشور میں رئیس نمایشات کے عہدہ پر سرفراز تھے ۔ انہوں نے تھیٹر کے لئے ڈرامے ، فلموں کے لئے سناریو اور ریڈیو کے لئے کھیل لکھے ہیں ۔ وہ

بیس سال سے اسی کام میں مشغول رہے ۔ ان کے ریڈیائی ڈراموں کی تعداد چالیس تک پہنچ چکی ہے ۔ ڈاکٹر جنتی وزارت فرهنگ میں ادارۂ کل انتشارات میں رئیس نمایشات تھے ۔ وہ بھی دس سال تک انجمن شیر و خورشید کے لئے ریڈیائی ڈرامے لکھتے رہے ۔ زیدی ایک نوجوان فوجی افسر تھے ۔ کل انتشارات ارتش میں کام کرتے رہے اور انہوں نے تقریباً تیس ڈرامے لکھے ۔

یورپی ڈراما نگاروں میں شیکسپئیر اور مولیئر مقبول ہوئے ۔ مولیئر کے ڈراموں کے جو ترجمے ہوئے ان میں سے یہ تین قابلِ ذکر ہیں :

۱- طبیب اجباری ۔ ۲- گزارش مردم گریز ۔ ۳- خر ۔

شیکسپیئر کے ہنری چهارم اور اوتھیلو کا ترجمہ ہوا اور مؤخر الذکر سٹیج بھی ہوا ۔

ایرانی ڈراما نگاروں میں سے مرزا ملکم خان نے مندرجہ ذیل تین ڈرامے لکھے جو سٹیج نہیں ہوئے ۔ یہ ڈرامے فتح علی اخوند زادہ کی تقلید میں لکھے گئے تھے اور ان کا موضوع بھی حکومت اور اجتماعی خرابیوں کی اصلاح تھا ۔

۱- سرگذشت اشرف خان ۔ ۲- طریقۂ حکومت زمان خان ۔ ۳- سفر کربلای شاہ قلی مرزا ۔

ذبیح بهروز کے دو ڈرامے "جیجک علی شاہ" اور "شاہ ایران و بانوی ارمن"، فنی اور انتقادی نقطہ نظر سے بہت مشہور ہوئے ۔ حسن مقدم کا ڈراما ، «جعفر خان از فرنگ آمدہ» بھی بڑے کام کی چیز ہے ۔ اس میں فرنگی مآب شخص کامقابلہ پرانی وضع کے آدمی سے کیا گیا ہے اور استادانہ نکات پیدا کئے گئے ہیں ۔

اوپیرا

ڈراما کی ایک اور شکل اوپیرا بھی ہے . فارسی میں سب سے پہلے اوپیرا کے نمونے وہ ہیں جو ترکی قفقازی سے ترجمہ ہوئے ۔ چونکہ ایرانی قفقازی موسیقی سے آشنا تھے اس لئے یہ اوپیر بعینہ اسی آهنگ کے ساتھ سٹیج پر پیش کئے جا سکے ۔ اصلی و کرم اور آلهہ ۔ مشهدی عباد ایرانی ایکٹروں کے ہاں بہت مقبول ہوئے . اسی نمونہ کے مدنظر رضا شهزاد نے پری چهر و پریزاد کے نام سے اوپیرا لکھا جو کئی مرتبہ سٹیج ہوا ۔ عشقی کے اوپیرا «رستاخیز سلاطین ایران» اور « بچہ گدا » کو بہت شہرت ہوئی ۔ خسرو شیرین ، لیلی مجنون کے اوپیرا بھی بار بار سٹیج ہوئے ۔

منظوم ڈراما

ایران میں منظوم ڈراما کا روج ہوا۔ مولیئر کے ڈراما و میزان تروپ ، کا ترجمہ فارسی شعر میں ہوا ۔ فارسی نام « گزارش مردم گریز » ہے ۔ جشن فردوسی کے موقع پر شاهنامہ کی

ایک کہانی فردوسی کے اپنے اشعار میں مختصر سے تصرّف کے ساتھ پیش کی گئی۔ اس قسم کے منظوم ڈرامے آج کل بھی پیش ہو رہے ہیں۔ رستم و سہراب ، منیژہ و بیژن ان کی مرغوب مثالیں ہیں۔ ذبیح بہروز کا ڈراما شاہ ایران و بانوی ارمن ، آزاد نظم میں ہے۔

تاریخی ڈراما

تاریخی ڈراموں کا بھی بڑا چرچا ہوا۔ بزرگ اسلاف کی یاد تازہ کرنے اور اپنے بڑوں پر فخر کرنے کے جذبات پیدا کرنے کے لیے یہ ڈرامے بہت مقبول ہوئے۔ ان میں سے شاہ عباس کبیر ، امیر کبیر ، داستان خونین ، آخرین یادگار نادر شاہ اور عمر خیام قابل ذکر ہیں۔

جب تک ڈراما نگاروں کی تصانیف شائع نہ ہو جائیں اور ان کا مطالعہ کرنے کا موقع نہ مل سکے ہم ڈراما نگاروں کی حیثیت اور فن ڈراما میں ان کا مقام متعین نہیں کر سکتے۔ ایران میں بہت کم ڈرامے چھپے ہیں وہ ناپید ہیں۔ بعض کے صرف ایک ایک دو دو ڈرامے مل سکے ہیں۔ انفرادی طور پر ان کا ذکر کیا جاسکتا ہے مگر ہمارا مقصد تھا کہ ہم ایران کے چند برگزیدہ شخصیتوں کو ڈراما نگار کی حیثیت سے روشناس کراسکیں۔ فی الحال ہم مندرجہ ذیل ڈراما نگاروں کے حالات حاصل کر سکے ہیں اور ان کے چند ایک ڈرامے بھی پڑھ سکے ہیں۔ ایرانی ڈراما سے دلچسپی رکھنے والوں کا خیال ہے کہ تاریخ ڈراما نگاری میں ان اشخاص کا ذکر ضرور آئے گا۔

۱- مرزا ملکم خان۔ ۲- ذبیح بہروز۔ ۳- علی نصر۔
۴- علی جلالی۔ ۵- رضا کمال شہزاد۔ ۶- ابوالقاسم جنتی۔

افسانہ نویسی

ایران میں ناول سے کافی دیر بعد افسانے کا رواج ہوا۔ سب سے پہلے بہار میں اور پھر دانشکدہ ، میں سعید نفیسی اور رضا ہنری نے الفونس دودہ اور موپساں کے افسانوں کا ترجمہ شائع کیا ، اس کے بعد اور مصنفوں کے ترجمے بھی عام ہوگئے۔

تہران میں مؤسسہ خاور نے غیر ملکی افسانوں کی ترویج و اشاعت کے لئے افسانہ کے عنوان سے ایک رسالہ جاری کیا۔ اس نے دورۂ اوّل ۱۳۰۶ - ۱۳۷۰ ھ ش میں دس جزو دورۂ دوم یعنی ۱۳۰۹ میں ۸ جزو ، دورۂ سوم یعنی ۱۳۱۰ میں ۶۰ جزو اور دورۂ چہارم یعنی ۱۳۲۳ میں ۸ جزو شائع کئے۔

افسانہ نگار

محمّد علی جمالزاده

ایران میں افسانہ نویسی کے مؤسس محمّد علی جمال زادہ ہیں ۔ جنھوں نے ۱۳۳۹ ھ میں اپنی چھ کہانیوں کا مجموعہ « یکی بود یکی نبود » کے عنوان سے برلن میں شائع کیا ۔ اس کتاب کے دیباچہ میں مصنف نے افسانہ کی افادیت اور اہمیت بیان کی ہے کہ وہ قوم کی اخلاقی و سماجی خصوصیات کا آئینہ دار ہوتا ہے اور مختلف طبقات کے خیالات اور رجحانات بیان کرنے کے لئے عوامی محاورات اور اصطلاحات کے استعمال سے زبان میں وسعت پیدا ہوتی ہے .ان کہانیوں میں طعن و مزاح کو پُر لطف انداز میں استعمال کیا ہے . اور اس اسلوب بیان میں جمال زادہ اپنے فن میں یکتا ہیں ۔ ان کہانیوں میں سے«درد دل باقر علی خان » بہترین افسانوں میں شمار ہونے کے قابل ہے ۔ اسی مصنف کی دوسری کتابیں .«سرگذشت عمو حسین علی»،«صحرائی محشرشہ، «راہ آب نامہ» ، وغیرہ ہیں ۔

صادق هدایت

دوسرے سب سے نامور افسانہ نویس صادق ہدایت تھے جنھوں نے ۱۹۵۳ء میں خودکشی کرلی ۔ ان کی کہانیوں کے چار مجموعے اور پانچ طویل افسانے یا ناولٹ الگ الگ کتاب کی صورت میں شائع ہوئے ہیں ۔ مجموعوں کے نام یہ ہیں :

« زندہ بگور» ۱۳۰۹ ھـ ش . « سہ قطرۂ خون » ۱۳۱۱ ھـ ش ۔ «سایۂ روشن» ۱۳۱۲ ھ ش اور « سگ ولگرد » ۱۳۲۳ ھ ش ۔

انسانی کردار کی بلندیاں نظر آتی ہیں لیکن ان کے افسانوں میں متوسط اور اعلی طبقہ کے افراد کا بھی ذکر ہے ۔ کہانیاں مختلف زمانوں اور مکانوں سے وابستہ ہیں اور زندگی کے مختلف ادوار سے متعلق ہیں ۔ موضوعات کی رنگا رنگی کے باوجود ہر کہانی کا آغاز و انجام ایك دوسرے سے مختلف ہے ۔ ہر کہانی کا پلاٹ اور اس کی کشاد ایك دوسرے سے جدا ہے .

صادق ہدایت بہت حساس ہے ۔ اسے دنیا میں دکھ ہی دکھ نظر آتا ہے ۔ وہ تڑپتے انسانوں زمانے کے دھتکارے ہوئے مایوس و نامراد غریبوں کو دیکھتا ہے ۔ اور اپنے دردمند دل کو دکھیا محسوس کرتا ہے ۔ اس نے اپنے تخیل کی ایك حسین بہشت تیار کی ہے ۔ جب وہاں رسائی نہیں ہوتی تو وہ بے قرار ہو جاتا ہے ۔ اس کو اپنے وطن سے والہانہ محبت ہے . وہ ایران کے تاریخی دشمنوں سے کینہ رکھتا ہے .اس نے پہلوی کتابوں کے ترجمے کئے ہیں اور پھر سے دنیا کو ایرانی عظمت سے روشناس کرایا ہے ۔ صادق کی زبان پُر لطف ہے ۔ امثال و محاورات اور روزمرہ کے استعمال سے اس نے زبان کو وسعت بخشی

ہے ۔ شروع شروع میں صادق ہدایت کی بالکل قدر نہ ہوئی.اس نے اپنی کتابیں چھپوائیں ۔ وہ بھی تھوڑی تعداد میں فروخت ہوئیں ادیب اس کے عامیانہ محاورات کو رکیک سمجھتے تھے بعد میں بعض مستشرقین نے اس کو ایران کا ایك بہت بڑا ادیب سمجھا ۔ آہستہ آہستہ اس کی بڑی شہرت ہوئی اور اس کے بہت سے پیرو پیدا ہوگئے ۔

بزرگ علوی

جمال زادہ کے اتباع میں لکھنے والوں میں سے بزرگ علوی مشہور ہیں ۔ ان کی کہانیوں کا مجموعۂ «چمدان» کے نام سے ۱۳۱۳ ھ ش میں شائع ہوا ۔ ۱۳۳۱ میں آزادی پسند خیالات رکھنے کے جرم میں اسے قید کر دیا گیا ۔ رہائی کے بعد اس نے کہانیوں کے دو مجموعے شائع کئے ۔ «ورق پارہ ھای زندان» اور «۵۳ نفر» ، ان میں اپنی گرفتاری ، مقدمہ اور قید خانے کی زندگی کی داستانیں ہیں ۔ ان میں سے ایك ڈائری ہے ۔ جس میں روزانہ اپنی بیوی کو مخاطب کرکے اپنے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ۔ یہ چیزیں اپنی المناکی اور دردمندی کی وجہ سے بڑی مؤثر ہیں ۔ اس کی دو اور کتابیں « نامہ ھا» ، اور «چشمھایش» ، کے نام سے شائع ہوچکی ہیں ۔ علوی کا اسلوب ہدایت سے ملتا جلتا ہے

عبارات سادہ رواں اور بے تکلف ہیں ۔ اس کی کہانیوں سے پلاٹ کی فنی مہارت عیاں ہے اس کے کردار متوسط اور نچلے طبقے کے لوگ ہیں ۔ اجتماعی مسائل پر اس کی تنقیدیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں ۔

حسین قلی مستعان

اجتماعی زندگی کے مسائل پر لکھنے والوں میں حسین قلی مستعان کی شخصیت بہت اہم ہے ۔ وہ نہ صرف قابل قدر صحافی ہیں بلکہ ناول نگار ، ڈرامہ نگار اور افسانہ نویس کی حیثیت سے علمی و ادبی حلقوں میں ان کا اثر و رسوخ رہا ہے ۔ انہوں نے اخبار و رسائل میں بے شمار کہانیاں لکھی ہیں ۔ «اندیشہ ھائے جوانی» ، اور «ارمغانِ زندگی» کے عنوانات سے ان کے افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۔ ۱۳۱۹ اور ۱۳۲۰ ش کے درمیان انہوں نے چوبیس ناولٹ یا طویل افسانے الگ کتابی صورت میں شائع کئے ہیں . ان میں سے بعض دو دو بار بھی چھپے ہیں . انہوں نے عیش کوش امراء ، بدمعاشوں ، جوان مردوں اور عورتوں کےانحرافات اور معاشرے کے بعض ضرر رساں آداب و رسوم کو تلخ حقائق کے ماحول میں پیش کیا ہے ۔ ان کے پلاٹ کی دلبستگیاں اور کردار قصہ کی زندہ تصویریں ایرانیوں کی آپ بیتیاں معلوم ہوتی ہیں . ان کی کہانیاں پڑھ کر بعض لوگ اس قدر متأثر ہوئے کہ انہوں نے اس کو مار ڈالنے کی دھمکیاں دیں ۔

نئے لکھنے والے بھی ہیں جن کا مستقبل درخشندہ نظر آتا ہے اور ممکن ہے کہ ادبیات

فارسی میں ان کو نیا مقام حاصل ہو جائے ۔ ان کا اپنا خاص اسلوب بھی ہے ۔

اعتماد زادہ، م. ا. بہ آذین

ان لکھنے والوں میں ایک اعتماد زادہ ہے جس کے افسانوں کامجموعہ ۱۳۲۳ ش میں «پراکندہ » کےعنوان سے شائع ہوا ۔ سب کہانیوں کے موضوعات مختلف ہیں .بعض کہانیوں میں اجتماعی امور پر تنقید کی ہے اور خاص طور پر زندگی کے چھپے ہوئے گوشوں کو ظاہر کیا ہے ۔

صادق چوبك

انہی دنوں صادق چوبك نے معاصرین میں ایك اچھا مقام حاصل کر لیا ہے ۔اس کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۔ ان میں سے بعض کہانیاں تو صرف زندگی کے ایك گوشہ یاد ایك منظر یا ایك حادثہ کی تصویر کھنچتی ہیں ۔ اس مصنف کو منظر نگاری اور انسانی فنا و کردار کی تصویر کشی میںخاص ملکہ حاصل ہے ۔ اس لئے معمولی سے معمولی واقعہ بھی اس کی دلکشی سے دلچسپ ہوگیا ہے جمالزادہ اور صادق ہدایت کے مانند اس کی زبان تہرانی روزمرہ اور محاورہ کے مطابق اور عوام کے زیادہ قریب ہے ۔

جلال آل احمد

جلال آل احمد بھی زیرك لکھنے والوں میں سے ہیں ان کے افسانوں کا مجموعہ « دید و بازدید » کےنام سے ۱۳۲۷ش میں شائع ہوا تھا ۔ بعد میں « سہ تار» «ن و القلم» و «مدیر مدرسہ» بھی شائع ہوئے ۔ اس مصنف کا اسلوب بھی خاص ہے ۔ یہ بھی سوم اور نچلے طبقہ کے طرز تفکر کا شارح ہے ۔ خاص کر ان کے مذہبی رجحانات بیان کرنے میںخاص مہارت رکھتا ہے ۔

نوری

دیگر معاصر لکھنے والوں میں نوری کا نام آتا ہے ۔اس کے افسانوں کے تین مجموعے شائع ہوچکے ہیں .« قوس قزح» ، «خون بہاش'اور «خاطرات خدا »، ان کے علاوہ ایك طویل مختصر افسانہ پرسیلا کے نام سے الگ بھی شائع ہوا ہے ۔ نوری کی اکثر کہانیوں کا موضوع ترغیبات جنسی ہے وہ خاص خاص شخصیتوں کا مطالعہ کرتا ہےاور انسان کے جنسی تقاضوں اور ان کے انحرافات کو بیان کرتا ہے ۔ یہ تمام افسانے عام نفسیات کی روشنی میں لکھے گئے ہیں کیونکہ نوری امریکہ میں نفسیات کا طالب علم تھا اور اس کے اکثر افسانوں کی فضا امریکائی ہے ۔ افسانہ نگاری کے لئے رجحانات میں نوری کا نام قابل توجہ ہے اس میں اپچ موجود ہے ۔ اس کے مشاھدات لطیف ہیں . اس کے موضوعات

میں وسعت آ جانے سے اس کے افسانے مقبولیت عامه حاصل کرنے کے عناصر اپنے اندر رکھتے ہیں ۔ ویسے متعصب حلقوں میں اس پر کڑی تنقید ہوتی رہی ہے ۔

نئے لکھنے والوں میں رسول پرویزی ، بہرام صادقی ، جمال میر صادقی اور صمد بہرنگی ،فریدون تنکابنی سر فہرست ہیں . یه ادیب بھی افسانے کی نئی تکنیك سے آشنا ہیں ۔

جمال میر صادقی

۱۳۱۲ ھ ش / ۱۹۳۳ء میں پیدا ہوئے ۔ دبیرستان تك تعلیم حاصل کرنے کے بعد معلم بن گئے اور ساتھ ہی زبان و ادبیات فارسی میں بی. اے کیا ۔ معلمی و تدریسی کے بعد وہ کتابخانه دانشسرائے عالی میں کام کرتے رہے . سازمان اموراداری و استخدامی میں کام کیا اور کچھ عرصه سے سازمان اسناد ملی میں متخصص کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں ۔

تألیفات

شاهزاده خانم سبز چشم - مشتمل بر ۱۲ افسانے ، چشم های من خسته - مشتمل بر ۱۰ افسانے ، شبهای تماشا و گل زار - مشتمل بر ۸ افسانے ، درازنای شب (ناول) ، ابن شکسته ها - مشتمل بر۶ افسانے ، سوی گلهای شن ، نه آدمی نه صدای مطالعه ای،در شناخت ادبیات داستانی و نگاهی کوتاه به داستان نویسی معاصر ایران ۱۳۶۰۔

صمد بہرنگی

۱۳۱۸ ش/۱۹۲۹ء کو تبریز میں پیدا ہوئے . ۱۸ سال کی عمر میں معلم روستان آذربائیجان مقرر ہوئے وہ اپنی زندگی کے اختتام تك دیہاتی بچوں کی رہنمائی میں مصروف رہے ۔ اور ان کے لئے ساده و سہل زبان میں کتابیں لکھتے رہے ۔

انہوں نے عوامی قصوں کہانیوں کو قلمبند کرکے محفوظ کیا ۔

تألیفات

کند و کاو (مسائل تربیتی) - ۱۳۴۴ ش، مثلها و چیستانها (با بهروز دهقانی) -۱۳۴۴ش، پسرك لبو فروش - ۱۳۴۶ ش، کچل کفتر باز - ۱۳۴۶ ش، عروسك سخنگو - ۱۳۴۶ ش، افسانهای محبت - ۱۳۴۶ش، ماهی سیاه کوچولو - ۱۳۴۷ش، کلاغ سیاهه و چند قصهٔ دیگر برای کودکان -۱۳۴۸ ش، کوراوغلو و کچل حمزه - ۱۳۴۸ ش، الدوز و کلاغها - ۱۳۴۸ ش، ۲۲ ساعت در خواب و بیداری -۱۳۴۸ش، خرابکار،قصه های از چند نویسنده (ترجمه)- ۱۳۴۸ش، مجموعهٔ مقاله ها-

۱۳۴۸ ش ، یك هلو و هزار هلو - ۱۳۴۸ ش، تلخون و چند قصهٔ دیگر - ۱۳۴۹ ش، قصه های بهرنگ(چاپ سوم)- ۱۳۵۶ ش ۔

فریدون تنکابنی

۱۳۱۶ میں پیدا ہوئے ۔ ادبیّات ایران میں فارغ التحصیل ہوئے ۔ وہ علمی و تعلیمی کاموں کے ساتھ ساتھ افسانے اور دوسرے تنقیدی مضامین لکھتے رہے ۔ اور ان کی مندرجه ذیل کتابیں شائع ہوچکی ہیّں :

مردی در قفس - ۱۳۲۰ش ، اسیر خاك - ۱۳۲۱ش ، پیاده شطرنج - ۱۳۲۳ش ، ستاره های شب تیره - ۱۳۳۷ش، یادداشتهای شهر- ۱۳۴۸ش اور، پول ، تنها ارزش و معیار ارزشها - ۱۳۰۰ش ۔

اس کی کہانیاں زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہیں ۔ اس کے لہجے میں طنز ہے ۔ وہ واضح و صریح نقشه کھینچتا ہے ۔ اس کی نثر ساده و رواں ہے ۔

معاصر نثر کا اسلوب

عصر حاضر کی فارسی نثر میں ہم کئی قسم کے اسلوب دیکھتے ہیں لیکن عام طور پر ساده نثر لکھنے کا رواج ہے ۔ عوام کی زبان، رسائل و جرائد کی زبان اور افسانه ناول اور ڈرامه کی زبان بالعموم ساده اسلوب رکھتی ہے ۔ یعنی عبارت لفظی آرائشوں سے پاك ہے ۔ بیان میں الجھاؤ نہیں ۔ البته شاعرانه نثر کے نمونے دیکھنے میں آتے ہیں ۔ ادیب اپنے احساسات و کیفیات ذہنی کو بیان کرنے کے لئے تخیل اور جذبات کی آمیزش سے کام لیتا ہے جس سے ادب لطیف وجود میں آتا ہے ۔ محمّد حجازی اورعلی دشتی کی تحریروں میں اس قسم کے نمونے جا بجا ملتے ہیں ۔ علمی کتابوں کی نثر کا انداز جدا ہے ۔ سائنس اور فلسفه کی معلومات اور مسائل کو سمجھانے کے لئے جزو نگاری کی ضرورت ہے اوراس میں وضاحت بیان لازمی ہے ۔ اس لئے علمی مضامین کی نثر ساده ہونے کے ساتھ ساتھ محکم ہے اور لفظی پیچیدگیوں سے پاك ہے اس علمی نثر سے ملتی جلتی تحقیقی مضامین کی نثر ہے ۔ اس میں تحقیق کے علاوه تبصره و تنقید کے مضامین شامل ہیں ۔ اگرچه ایسی نثر بھی ساده ہے ۔لیکن اس میں تنقید و افکار کے اظہار کے لئے عرؔبی الفاظ کا سہارا لینا پڑتا ہے ۔ یه اسلوب استادوں اور محققوں کی تحریروں میں نمایاں ہے ۔ کہیں کہیں پرانے مدارس کے پڑھے ہوئے ادیبوں کی تحریروں میں عربیت کا زور عیاں ہے ۔ بعض یورپ زده اشخاص انگریزی اور فرانسیسی الفاظ استعمال کرتے ہیں ۔ لیکن اب اس کا

رواج بھی کم ہوتا جاتا ہے البتہ علمی و ادبی کتابوں کے ترجموں میں مغربی انداز تحریر کا اثر نمایاں ہے. الفاظ و محاورات اور جملوں کی ساخت تك یورپی ہے ۔ ۱۹۴۲ء تك فرانسیسی کا اثر زیادہ رہا . علمی ، ادبی کتابوں کے ترجمے براہ راست فرانسیسی زبان سے ہوتے رہے ۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد انگریزی زبان کا اثر زیادہ بڑھا ۔ علوم و فنون کی ترقیات اور اختراعات میں انگلینڈ اورامریکہ کا حصّہ زیادہ رہا اور سیاسی دنیا میں بھی زیادہ غلبہ انہی ممالك کا رہا ۔ اس لئے انگریزی کو بین الاقوامی حیثیت مل گئی ۔ ایران میں ۱۹۴۲ء کے بعد انگریزی زیادہ مقبول ہوئی اور فرانسیسی کو زوال ہوا ۔

فارسی سرہ کے نمونے بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو لوگ عربی کلمات استعمال کرنے سے احتراز کرتے ہیں اور پہلوی اوستا کے نامانوس الفاظ استعمال کرتے ہیں ۔ ان کی نثر میں فصاحت نہیں رہتی اور روانی میں بھی فرق پڑتا ہے ۔

نثر کی ایك اور صورت ہمیں دفتری زبان میں ملتی ہے اس کے لئے خاص تکنیك کی ضرورت ہے ۔ چند ایك خاص اصطلاحیں اور جملے مقرر ہیں جن کے استعمال اور تکرار سے سرکاری اور تجارتی اداروں کے مراسلات لکھے جاتے ہیں ۔

مندرجہ ذیل نثر نگاروں کو چند ایك مروجہ اسلوبوں کا نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے ۔

ا- ادبی نثر لکھنے والے

۱- محمّد حجازی ۔ ۲- محمّد علی جمال زادہ ۔ ۳- صادق ہدایت ۔
۴- دھخدا ۔ ۵- علی دشتی ۔ ۶- حسین قلی مستعان ۔

ب - علمی - اجتماعی اور سیاسی نثر لکھنے والے

۱- محمّد علی فروغی ۔ ۲- سید احمد کسروی ۔ ۳- مرزا ملکم خان .
۴- حسن تقی زادہ ۔ ۵- یوسف اعتصامی ۔

ج - تحقیقی و تنقیدی نثر لکھنے والے

۱- محمّد قزوینی ۔ ۲- محمّد تقی بہار ۔ ۳- رشید یاسمی ۔
۴- سعید نفیسی ۔ ۵- عباس اقبال آشتیانی ۔ ۶- پور داؤد ۔

د- صحافتی نثر لکھنے والے

۱- حسن تقی زادہ ۔ ۲- کاظم زادہ ایرنشہر ۔ ۳- عباس مسعود مدیر روزنامہ اطلاعات ۔ ۴- عبدالرّحمن فرامرزی مدیر روزنامہ کیہان .

اخبار نویسی

دسمبر ۱۹۲۵ء میں مجلس ملی نے رضا خان کو بادشاہ منتخب کر لیا ۔ جو ۱۹۴۱ء تک حکمران رہا ۔ اس نے ایك طرف تو بے لگام اور تیز و تند لکھنے والوں کو روکا اور دوسری طرف ان کی رہنمائی اور ان کے کام کی دیکھ بھال کے لئے ایك خاص اداراہ قائم کیا ۔ پہلے دور کے اخبار بند ہو گئے ۔ ان کے بجائے نئے اخبارات نئے انتظامات کے ساتھ جاری ہوئے ۔ ان میں سے اطلاعات ، ایران ، کیہان ، ستارۂ ایران ، کوشش اور اقدام کثیر الاشاعت تھے اور بعض ابھی تك جاری ہیں ۔

اب اخبار ٹائپ میں چھپتے ہیں ۔ خبروں کی بہم رسانی کے لئے خبر رسانی کی ایجنسیاں قائم ہیں ۔ خبروں کے لحاظ سے بھی اور تنقیدی مطالب کے لحاظ سے بھی اخبار و جراید کا معیار کافی بلند ہوا ۔ ہر قسم کی سادہ و رنگین چھپائی کا انتظام ہوا ہے ۔ غیرملکی اخبارات و رسائل بھی کافی تعداد میں آتے ہیں ۔

بخش یازدهم :

اسلامی انقلاب کے دور میں فارسی ادب کا جائزہ

پس منظر

۱۹۴۰ سے ۱۹۷۹م تک کا زمانہ ایك آزادی پسند زمانہ شمار ہوتا ہے ۔ اس دور میں جہاں سیاسی آزادی کے امکانات بڑھے ، اسی طرح دوسرے شعبوں میں آزادی افکار کی تجدید ہوئی ۔ اشتراکی اصولوں کی تبلیغ ہوئی ، کسانوں ، مزدوروں اور دوسرے طبقات کی اقتصادی حالت کو سدھارنے اور حکومت کی خرابیاں دور کرنے کے خیالات عام ہوئے ۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی ۔ جمہوریت کی فتح ہوئی . ایران نے بھی اقوام متحدہ کا ساتھ دیا ۔ جنگ کے خاتمہ پر سیاسی اور اقتصادی انقلاب رونما ہوا . ان تغیرات کے ساتھ ساتھ ادب بھی ان تغیرات اور اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا ۔ اس عہد میں اخباروں کی عام اشاعت سے شعراء کی توجہ فرد سے ہٹ کر سماج کی طرف مبذول ہوئی ۔

اس دور میں حکومت شاهنشاهی کے خلاف مسلح جدوجہد شروع ہوئی ۔ «فدائیان خلق» اور«مجاہدین خلق» جیسی تنظمیں وجود میں آئیں . اس دور مبارزہ میں غیر ملکی ادب کے ترجمے بھی ہوئے زیر زمین اور گروہی ادب بھی نظر آتا ہے ۔ چنانچہ اس زمانے میں دلاوران جنگی ، مسلح جنگ ، قید خانوں میں اذیت ، مجاہدین کو پھانسی دینے کے متعلق موضوعات پر شعر کہے گئے ۔ یاس و ناامید کے بجائے روشن مستقبل کا امیدوار بنایا گیا ۔ شعراء نے دریا موج ، طوفان ، جنگل ، کوہ ، لالہ ، سرخ ستارہ اور اسلحہ کی باتیں کیں ۔ اس دورکے افکار و احساسات کی جھلك مجموعہ کلام ، «شعر جنبشهای نوین » میں ملتی ہے ۔ جو ۱۳۵۲ ش میں شایع ہوا ۔

شاہ رضا اپنے آپ کو آریائی نسل سے شمار کرنے پر فخر کرتا تھا ، چنانچہ اس نے آریا مہر کا لقب اختیار کیا ۔ ۱۹۷۱/۱۳۵۰ء میں اس نے اپنے آپ کو ایران کی قدیم شہنشاهیت سے وابستہ کرکے ۲۵۰۰ سالہ جشن قدیم شہنشاہی منایا اور کڑوڑوں روپے خرچ کرکے دنیا بھر کے سربراھان سلطنت کو دعوت دی اور سنہ ھجری کو سنۂ شہنشاہی سے تبدیل کیا ۔ وہ کورش ، دارا اور نوشیروان کو زندہ کرنا چاہتا تھا ۔

ایرانی تمدن آشنائے غرب ہوچکا تھا ۔ تجدد پسندی کے روپ میں مغربی تمدن کی تمام خرابیاں معاشرے میں داخل ہوچکی تھیں ۔ رقص و سرود کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں ۔ شراب خانے کھلے تھے ۔ گناہ و عصیاں کی دکانیں کھلی تھی ۔ عریانی کا دور دورہ تھا .

اسلامی ضوابط و احکام کی پروا نہیں تھی ۔ ۱۵ فروری ۱۹۶۳/۱۳۴۲ء کو امام خمینی کی قیادت میں معاشرے کو اسلامی نہج پر لانے اور کفر و اغیار پرستی کے خلاف جہاد کرنے کا عزم بالجزم کیا ۔

شاہ کے خلاف جدوجہد

۱۳۵۰سے ۱۳۵۵ ش/ ۱۹۷۱-۱۹۷۶ء تک شاہ کی مطلق العنان حکومت کے خلاف جدوجہد جاری رہی ۔ حکومت کی طرف سے گرفتاریاں اور مقدمات چلے اور سزائیں ملیں بہت سی عزیز جانیں تلف ہوئیں ۔ ۱۹۷۷/۱۳۵۶ء میں ڈاکٹر علی شریعتی اور مصطفی خمینی کسی سازش کے تحت قتل کئے گئے ۔

۱۲ دی ۱۳۵۶ کو روزنامہ اطلاعات میں ایرانی استعمار سرخ و سیاہ کے عنوان سے مقالہ چھپا. اس میں امام خمینی(رح) کو توہین آمیز الفاظ میں یاد کیا گیا تھا ۔ قم میں اس کے خلاف مظاہرہ ہوا اور پولیس نے گولی چلائی جس کے نتیجے میں بہت سے لوگ جان بحق ہوئے ۔ اس کے بعد تبریز ، شیراز ، اصفہان ، مشہد ، تہران ، اھواز اور یزد میں ان شہداء کا چھلم برپا ہوا ۔

۲۵ فروری ۱۳۵۷ کو قزل حصار جیل میں سیاسی قیدیوں نے اذیت و عقوبت کے خلاف بھوک ہڑتال کی ۔ تہران یونیورسٹی اور پولی ٹیکینک کے طلبہ نے سیاسی قیدیوں کی ہمدردی میں جلوس نکالے اور تعلیم کا بائیکاٹ کیا ۔ اسی دن اصفھان میں مزدوروں نے ہڑتال کی اور عوام بھی اس میں شریک ہوئے ۔ پولیس اور فوج نے گولی چلائی اور بہت سے افراد مارے گئے ۔ اصفھان میں پہلی مرتبہ مارشل لاء نافذ ہوا ۔ ۱۷ شہریور ۱۳۵۷ش/۱۹۷۸ء میں تہران اور دوسرے شہروں میں مظاہرے ہوئے اور فوج نے عوام کو گولیوں کا نشانہ بنایا ۔ تقریباً ۴ ہزار افراد مارے گئے . ہلاک ہونے والوں میں ۶۰۰ عورتیں تھیں .۲۴ مہر ۱۳۵۷ کو امام خمینی(رح) کے حکم پر عام سوگ منایا گیا ۔ ۱۰ مہر ۱۳۵۷ش کو اوّل محرم کی مناسبت سے لوگوں نے چھتوں پر چڑھ کر سیاسی نعرے لگائے اور اللہ اکبر کی صداؤں سے شہر گونج اٹھا ۔ محرم کے دوران میں ہی لاکھوں افراد نے جلوس نکالے ۔ پٹرول کمپنی کے مزدوروں اور طلبہ نے ہڑتال کی تو بہت سے فوجی سپاہی عوام کی جدوجہد میں شریک ہوگئے. بعد کے اہم واقعات کی تفصیل اس طرح ہے ۔

۲۶ دی ۱۳۵۷/ ۱۹۷۹/۱/۱۶ء کو شاہ نے ایران چھوڑ دیا ۔

۱۲ بہمن ۱۳۵۷/ ۱۹۷۹/۲/۱ء ۔ امام خمینی(رح) پیرس سے آ کر ایران میں داخل ہوئے ۔

۲۲ بہمن ۱۳۵۷ - انقلاب اسلامی کی فتحمندی .
۲۸ بہمن ۱۳۵۷ - حزب جمہوری اسلامی کی تشکیل.
۱۵ فروردین ۱۳۵۸ - انجمن مجاہدین انقلاب اسلامی کی تشکیل.
۴ خرداد ۱۳۵۸ - تشکیل جہاد سازندگی .
۱۳ آبان ۱۳۵۸ - سفارتخانہ امریکہ پر قبضہ.
۱۱ آذر ۱۳۵۸ - عوام کی اکثریت نے قانون اساسی (آئین)کی تصدیق کر دی .
۵ بہمن " - پہلے صدر مملکت کا انتخاب .
۲۴- اسفند " - مجلس شوری کے انتخابات .
۵ اردیبہشت ۱۳۵۹/ ۱۹۸۰ء امریکہ نے سفارتی کارکنوں کی رہائی کے لئے ۱۰۰ کمانڈو کے ہمراہ ۶ جہاز اور ۸ ہیلی کاپٹر کو طبس میں اتارا مگر طوفان کی وجہ سے حملہ ناکام ہوا .
۷ خرداد ۱۳۵۹ - مجلس شوری اسلامی کا افتتاح ۔
۳۱ شہریور ۱۳۵۹ - عراق نے سرزمین ایران پر حملہ شروع کر دیا ۔
۲۰ دی " - ۴۴۲۰ دن کے بعد سفارتخانہ کے امریکی کارکن رہا ہوئے ۔
۲۱ خرداد ۱۳۶۰/ ۱۹۸۱ء بنی صدر صدارت سے الگ کر دئیے گئے ۔
۷ تیر ۱۳۶۰ - حزب جمہوری اسلامی کے دفتر میں بم پھٹنے سے ۷۲ بہترین رہنما اور نمائندگان مجلس شہید ہوئے ۔
۲ مرداد ۱۳۶۰ - مجلس شوری اسلامی کے اور صدر کے لئے دوسری مرتبہ انتخابات ہوئے ۔ محمّد علی رجائی صدر منتخب ہوئے ۔
۸ شہریور ۱۳۶۰ - بم پھٹنے سے صدر مملکت محمّد علی رجائی اور وزیراعظم ڈاکٹر با ھنر شہید ہوئے ۔

بنی صدر کی معزولی کے بعد مجاہدین خلق کی جماعت باغیانہ اور دہشت پسندانہ سرگرمیوں میں مصروف رہی اور انقلاب اسلامی کے رہنماؤں کو چن چن کر قتل کرتی رہی ۔ آخر حکومت کی سخت گیری کے پیش نظر مجاہدین خلق سے وابستہ اشخاص گرفتار ہوئے اور اپنی سزا کو پہنچے ۔

عراق ایران جنگ کے درمیان شروع شروع میں عراق کا پلہ بھاری رہا اور انہوں نے بہت سا علاقہ زیر تصرف کر لیا ۔ مگر انقلاب اسلامی سے سرشار نئی منظم ایرانی فوج اور سپاہ پاسداران انقلاب کے صبر و استقامت اور بے نظیر دلیری اور جذبۂ شہادت سے تقریباً تمام مقبوضہ علاقہ واپس لے لیا گیا ۔

امام خمینی(رح) کی بے مثال قیادت کے زیر اثر ایرانی قوم متحد رہی ۔ عوام ان کے فرمان پر جان و مال کی قربانیاں دینے پر آمادہ رہے ۔ انتظامی ادارے قائم کرنے کے ساتھ ساتھ فوجی تنظیم بھی ہوئی ۔ عوام کی فلاح و بہبود کے لئے تعمیرنو کی بنیاد رکھی گئی جس میں زراعت ، صحت ، تعلیم اور سکونت سے متعلق تنظمیں قائم ہوئیں ۔ انقلاب اسلامی کی کمیٹیوں نے امن و امان قائم کرنے ، معاشرے کی اصلاح کرنے ، وطن کی حفاظت کرنے ، انصاف دلانے ، انقلاب اسلامی کے نظریہ کو عام کرنے ، مخالفین کو گرفتار کرنے ، غیر قانونی اسلحہ جمع کرنے اور پاسداران سپاہ کے حوالے کرنے کی غرض سے ملك و ملت کے مفاد میں بہت کام انجام دیئے ۔ دادگاہ ھائے انقلاب اسلامی شریعت اسلامی کی رو سے ارزان اور سریع انصاف مہیا کرنے کے لئے قائم کی گئیں ۔ جنگ میں شہید ، زخمی اور معذور ہونے والوں کے لئے اور ان کے کنبوں کے افراد کے لئے امداد اور پنشن کا انتظام کرنے کے لئے بنیاد شہید قائم کی گئی ۔ مملکت کے ہر شخص کو مکان مہیا کرنے کے لئے «بنیاد مسکن» کے نام سے ایك ادارہ قائم کیا گیا ۔

ایران میں انقلاب اسلامی کے بعد بنیادی تبدیلیاں لانے کی کوشش کی گئی ۔ شہنشاھت کا نام و نشان مٹانے کے لئے اقدامات کئے گئے ۔ بادشاہ کے تمام مجسمے ہٹا دیئے گئے ۔ مغربی تمدن کے خبیثانہ اعمال کو ختم کر دیا گیا ۔ شراب خانے بند ہوئے ۔ ایرانی سفارتخانوں کی شراب نالیوں میں بہا دی گئی ۔ رقص و سرور کی محفلیں ، کابرے ممنوع ہوئے ، سنیما اور تھیٹر کی اصلاح ہوئی ۔ قحبہ خانے بند ہوئے ۔ تمام ملك میں اسلامی پردے کا رواج ہوا ۔ یونیورسٹیاں بند کرکے تمام ضد انقلاب عناصر کو خارج کیا گیا اور اسلامی اصول کے مدّنظر تمام تعلیمی نصاب پر نظرثانی کی گئی اور نئی درسی کتابیں شائع کی گئیں جن درسی کتابوں میں شاہ کا نام آتا تھا ۔ان سب کو منسوخ قرار دیا گیا ۔

نماز جمعہ کی از سر نو تعظیم ہوئی ۔ لاکھوں افراد نماز جمعہ میں شریك ہونے لگے ہیں اور ایك مستند عالم سے خطبہ سنتے ہیں ۔

منشیات کی روك تھام کے لئے سخت سزائیں دی گئیں ۔ شیعہ سُنی اختلاف سے اجتناب ، اسلامی انقلابی قوتوں کے اجتماع اور وحدت اسلامی کے احیاء و فروغ کے لئے تبلیغ کی گئی ۔

رضا شاہ پہلوی کے آخری چند سالوں میں اس کے جور و استبداد کے خلاف اندر اندر چنگاریاں سلگ رہی تھیں ۔ لیکن لوگ کھلے بندوں دل کی بات نہیں کہہ سکتے تھے ۔

شعری کہ چون غرور بلند است و سرکش است
شعـــری کـــــہ آتش است

شعـــــــریســـــــت در دلم
شعری کـه دوست دارم و نتوانمش سرود

فریدون تولّلی نے پہلے ہی انقلاب کی بشارت کی تھی ۔

شیــــــپور انقلاب پرجوش و پر خروش
از نقله هـــای دور می آیـــدم به گوش
می گیردم قـرار
می بخشدم امیـد
می آردم بهـــوش

دکھی دل کی فریاد جاہد کے مندرجہ ذیل اشعار سے عیاں ہے ۔

بنگر ای آسمان ، مرگ بیچارگان ، نیش خونخوارگان
غم یار و جور بیگانه و خویش ، به که گویم از دل و سینه ریش

حکومت کے جور و استبداد سے جب عوام کا خون بہایا گیا تو مہدی اخوان ثالث جو ان کی لاش کو دیکھ کر چیخ اُٹھے ۔

از دشمنان مردم و از جانیان پست روزی رسد که خلق کشد انتقامها
ای پیر زن که تازه جوان تو کشته شد دیدی بلند نامش در بین نامها
بر گوربی نشان تو غمگین نمی رویم این احترام نیست چون آن احترامها
ای کشته ای شهیـد پُر از نغمه ها کنیم بستانسرای گور ترا صبح و شامها

عوام کو امام خمینی(رح) کی رہنمائی حاصل ہو جانے پر شعراء نے عوام کے جذبات کی ترجمانی کی ۔ انہیں اپنی فداکاری کا یقین دلایا اور ملک کو پنجۂ استبداد سے نجات دلانے کی تمنا کی ۔ محمّد حسن حجتی نے لکھا ۔

رهنمای بعد اعصـار و قرآن آمده در مـاندگان را رهنمون
می زند فـریاد کای مستضعفین یورش بر پیـــکر متکبرین
باز گیرید حق خـود را بیدرنگ از ددان پوزه خونین فرنگ
این خیانت پیشگان را وارهید حلقه بر پیرا من قرآن زنید

الف قیام نے کہا :

ای پیر خمین تا ترا یار شدیم پیمان ترا به جان خریدار شدیم
تا مهر ولایت تو بر ما تابید از زمزمهٔ عشق تـو بیدار شدیم

خون است دلم ، سینه صد چاك را صد باغ شگفته خارد خاشاك ترا
وقت است که سر فـدا کنم در پایت وزدست ددان رهـا کنم خاك ترا

جمہوریہ اسلامی ایران وجود میں آ جانے سے ملی ترانے لکھے گئے اور انقلاب کی برکتوں کا ذکر ہوا اور قربانیوں کے بعد آزادی پا کر قلبی مسرت کا اظہار ہوا ۔ ایران عراق جنگ شروع ہوئی تو بے شمار جنگی ترانے لکھے گئے ۔ انقلاب اسلامی اور اس کی کامیابیوں سے متعلق بھی اظہار خیال کیا گیا ۔ مثلاً یہ دو نمونے درج ذیل ہیں :

ما مسلح به الله اکبریم بر صف دشمنان حمـله می بریم
لا اله ، لا اله ، لا اله الاالله وحـده ، وحـده ، وحده وحده
انجز وعده و نصر عبده انجز وعده و نصـر عبده
الله اکبـــر الله اکبـــر خمینـــــــی رهبـــــر

تو هستی و گزینش
انقلاب پرتوان اسلامی سازش امام و امت رزمنده توفنـده را بگزین
و مرگ عزت آور را صـلا در ده که همچو شـاهدان جلوه گاه حق
شهیدان عزیز و سر بلند دوش
در محراب عشق راستین ، روسوی او ، داری (دکتر حسن حبیبی) ۔

ایران میں انقلاب کے بعد اکثر عوام کے ذہنوں پر مذہب کا غلبہ رہا ۔ نوجوان شعراء و شاعرات نے ظہور امام مہدی کے جلد ظہور ، صحیح حکومت اسلامی اور برکتوں کے نزول کے متعلق دعـائیہ نظمیں لکھیں ۔ ان میں سے طاہرہ صفارزادہ کی «انتظار »، سپیدہ کاشانی کی «نور مبارك» اور حمید سبزواری کی ، «اے عدالت موعود » ، قابل ذکر ہیں ۔

بعد میں ترانه های ملّی اور قومی نظمیں لکھنے میں حمید سبزواری کا نام سر برآوردہ رہا ۔ بہمن ۱۳۶۳ کے ایك انٹرویو میں کیہان فرہنگی کو بتایا کہ اس نے تین سو کے قریب قومی ترانے اور نظمیں لکھی ہونگی ۔

حضرت امام خمینی (رح) کی تصانیف کی عرفانی اور حماسی خصوصیات

امام کی عرفانی حماسه سرایی اور دوسرے شعرا کی حماسه سرایی میں نمایاں فرق ہے ۔ حماسه سراؤں نے قابل احترام اشخاص ، وطن ، زبان، تاریخی اساطیر تو روشن کرکے اپنے معاشرے میں حماسی روح زندہ کرنے کی کوشش کی ہے ، مثلاً فردوسی نے رستم جیسی اساطیری شخصیت کو رؤیائی وجود دیا ہے اور شجاعانہ روح کا پیکر بنایا ہے ، امام کے نزدیك قابل احترام اشخاص حقیقی ہیں ، رومانی اور خیالی نہیں ۔ وہ انسان کامل

ہیں ۔ مکتب و دین کے تربیت یافتہ نمونے ہیں ۔ امام کے نزدیک برگزیدہ اشخاص رسول خدا(ص) ، حضرت زهرا(س) ، علی و حسن و حسین(ع) ہیں ۔ ان نمونوں کو پیش کرکے وہ حماسی روح کو مستحکم کرتے ہیں ۔

امام کی حماسۂ عرفانی کی خصوصیات میں شریعت ، طریقت اور حقیقت کو ایک جگہ اکٹھا کرنا ہے کبھی کبھی حامیان شریعت سالکان طریقت اور طالبان حقیقت کے ساتھ مخالفت رکھتے تھے ۔ امام تینوں کو اکٹھا پیش کرتے ہیں اور اس باب کے معتقد ہیں کہ ان تینوں کے بغیر سالك کو وصال دوست میسر نہیں ہو سکتا ۔ اس منزل کو حاصل کرنے کے لیے خود سازی اور انقطاع غیر ضروری ہے ۔ اس کے لیے ریاضات کے علاوہ حق تعالی کی هدایت بھی ضروری ہے ۔ جب تك اندرونی اور بیرونی دنیا کی دلچسپیوں کا حجاب دور نہ ہو وہ خدا تك نہیں پہنچ سکتا ۔ وہ فرماتے ہیں :

تا اسیر رنگ و بوئی ، بوی دلبر نشنوی هر که این اغلال در جانش بود آماده نیست

سیر و سلوك کے مراحل میں خدا کو حاضر و ناظر سمجھنا چاہیے ۔ اور ماسوا سے آنکھیں بند کرلینا چاہیے ۔ امام اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ طریقت کی راہ میں پیر و مرشد مدد کرے ۔ ان کے نزدیك رهبر و مرشد پیغمبر اور ائمۂ اطہار (ع) کی ارواح ہیں ۔ حضرت امام نے ان شخصیتوں کے توسط سے معاشرے میں حماسۂ عرفانی اور عرفان حماسی کی تربیت کی جس کے نتیجہ میں فرزندان ایران میں شہامت و دلاوری پیدا ہوئی اور انہوں نے جان و مال قربان کرنے کے لیے ان کی آواز پر لبیك کہا اور صد سالہ راہ ایك رات میں طہ کرلی ۔ انہوں نے خدا کے ساتھ اپنی جان کا سودا کر لیا ۔

حضرت امام خالص عرفان کا دفاع کرتے تھے ۔ مثبت نظریوں کو رواج دیتے تھے ۔ تاریخ کے طویل عرصے میں صوفیانہ تکلفات اور بے ضابطگیاں داخل ہو گئیں ۔ امام نے هر قسم کی بے ضابطگیوں کو دور کیا اور عرفان ناب کی طرف توجہ کی ۔

امام اپنے عرفان حماسی میں سیاست اور حماسہ کو یکجا پیش کرتے ہیں ۔ روحانیت کے ساتھ حماسہ تخلیق کرتے ہیں ۔ اپنے بیٹوں ، شاگردوں اور مریدوں کی تربیت اور رہنمائی کے دوران میں نماز تہجد کی تاکید کرتے تھے اور ساتھ ہی باطل کے خلاف حق کے محاذوں پر جدوجہد کی تلقین کرتے تھے ۔

امام حلقۂ عرفان میں ، گھر والوں کی محفل میں ، درس و تدریس کی مجلس میں ، اسی طرح وسیع اجتماع میں بالواسطہ اور بلاواسطہ طالبان حق کی رہنمائی فرماتے تھے ۔

حضرت امام کے کلام میں جرأت ، بیباکی ، افشائے راز میں بھی بے باکی ہے لیکن عرفانی نگارشات میں حقایق عرفانی کو اسرار و رموز کی صورت میں پیش کرتے ہیں ۔

امام نہ صرف مسائل عرفانی کی نشاندہی کرتے ہیں بلکہ انہیں واضح و صریح بیان کرتے ہیں تا کہ صوفیہ کے ساتھ عوام بھی مطالب کو سمجھ سکیں ۔

حضرت امام نے معاشرے کے ارتقاء کے لیے ولایت فقیہ کا نظریہ پیش کیا۔ ان کی نظر میں فقیہ فقط احکام شرعی نہیں جانتا بلکہ احکام شرعی کے توسط سے اجتماعی امور پر بھی تسلط ہوتا ہے ۔

شعر و ادب کی حرمت و تقدس کا سوال زیر بحث تھا ۔ امام کی غزلیات نے اس مسئلہ کو حل کردیا اور ثابت کر دیا کہ ھر قسم کی تنقید سے بالا شخص خال ، بال، شراب و ساغر کی بات کر سکتا ہے ۔ اور می و ساغر کو شریعت کے ساتھ متناسب اور صحیح مطابقت دی جا سکتی ہے ۔

سبك شناسی کے اعتبار سے ان کی نظم و نثر کا سبك صراحت ، صداقت و اخلاص سے مالامال ہے وہ اپنے کلام میں خالص عرفانی ، اخلاقی ، اجتماعی اور سیاسی مسائل کو بھی زیر بحث لاتے ہیں ، ان کی نگارشات میں خلوص موجود ہے ۔

شاعری

ڈاکٹر ابوالقاسم رادفر نے شعر انقلاب کی جامع صفات بیان کی ہیں ۔

شعر انقلاب ایك حرکت استفسار اور فریاد ہے ۔ شعر زندگی ہے ، انسانی ہے ، اس میں دردوں اور محرومیوں کا بیان ہے ۔ شعر گریہ ہے ۔ شعر نجات ہے ۔ واقعیت کا حامل ہے مؤثر اور بیدار کرنے والا ہے .اس میں شہدائے کربلا کا ولولہ انگیز جوش بیان ہے ۔ اس میں حمد ، معراج ، غدیر اور عارفانہ مناجات شامل ہیں ۔ عاشورا نے رزمیہ روح پیدا کرنے میں انقلاب کو متأثر کیا ہے ۔

شعر انقلاب پاك و مقدس ہے . اس میں صداقت و اخلاص موجزن ہے ۔ نبرد آزما جانبازوں کے واقعات کا بیان انسانوں کو قوت و حیات بخشتا ہے ۔ مختصر یہ کہ شعر و ادب انقلاب نے انسان سازی کے لیے خدمات انجام دی ہیں ۔

انقلابی ادب میں مندرجہ ذیل مطالب مجموعی طور پر واضح نظر آتے ہیں ۔

۱- ظلم و ظالم کے خلاف ستیزہ کاری ۔

۲- وطن ، ملّت ، اسلامی معتقدات کے ساتھ تعہد و ذمہ داری ۔

۳- سیاسی و اجتماعی مفاسد پر اظہار رائے اور عوام میں احساس و شعور کی بیداری ۔

مہدی رستگار نے دس سالہ جنگ کے دوران میں نئے ادب کا تجزیہ کرتے ہوئے

مندرجہ ذیل رائے قائم کی ہے :

۱- غزل جو تقریباً متروک ہو چکی تھی پھر اصلی حالت میں زندہ ہوگئی ۔

۲- اجتماعی تحولات کی بنا پر یاس و پژمردگی اور غیر معقول اہداف و مقاصد کا اظہار اس دور کی شاعری میں نہیں ملتا۔

۳- شخصی تمناؤں اور شکوہ و شکایت کی بجائے شعرا میں اجتماعی سوچ پیدا ہوئی ہے ۔ شاعر نزدیک کو بھی دیکھتا ہے اور دور پر بھی نظر رکھتا ہے ۔

۴- شعراء نے اپنے آپ کو کسی خاص ہیأت اور بحور و اوزان تک محدود نہیں کیا ۔ لیکن انہوں نے ہزار سالہ ادبی اصالت کو ترک نہیں کیا ۔

۵- تشابیہ اور استعارات فکر بکر پر دلالت کرتے ہیں ، اور تقلیدی اور فرسودہ تعبیرات کو نہیں لاتے ۔

۶- اصل ایمان و عرفان نے پھر جگہ پائی ہے ۔ مغرب زدہ افکار کو ترک کیا ہے ۔ سہراب سپہری نے « من مسلمانم » لکھ کر ابعاد اسلامی کو آشکار کیا ہے ۔

۷- تخیلی دنیا سے نکل کر حقیقت کو اپنایا ہے۔ محسوس واقعیت سے ناطہ جوڑا ہے . جنگ ، شہادت ، مشیت ، معاشرتی امور کا اظہار کیا ہے ۔ متکبر ستمگر اقوام عالم کے خلاف مبارزت کا اعلان کیا ہے ۔

۸- قدیم ایرانی روایات و قصص کو چھوڑ کر ایرانی و مذہبی تلمیحات کو استعمال کیا ہے ۔ (۱)

انقلاب ادب کے شعراء کو مندرجہ ذیل طبقات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔

۱- وہ شعراء ہیں جو کلاسیکی روایات کے پابند ہیں اور قدیم وزن و ہیأت میں لکھتے ہیں ۔

۲- نیما کے پیرو شاعر جو ہیأت و وزن میں تغییرات کرتے ہیں ۔

۳- وہ شعراء جو کلاسیکی ہیأت کے پابند ہیں ، لیکن زبان و بیان اور فکر و اندیشہ میں جدید تصویر کشی کرتے ہیں اور نیمائی اوزان اور شعر آزاد کی طرف بھی میلان رکھتے ہیں ۔

۴- وہ شعراء جو وزن و قافیہ کی پروا کیے بغیر لکھتے ہیں ۔

۵- وہ شعراء جو کبھی نیم موزوں اور کبھی کاملاً بے وزن ہیں اور تصویر سازی میں افراط پسند ہیں .

۱- مجموعہ مقالات سمینار ، بررسی ادبیّات انقلاب اسلامی ، تہران ، ۱۳۷۳ ۔

۶- وہ شعراء جو مغربی فکر و نظر اور قالب و ہیأت کے پیرو ہیں۔ گویا اس کے ترجمان ہیں ۔ ان کی اپنی شعری ادبی اساس محکم نہیں ۔

اسلامی انقلابی ادب کا ایک حصّہ ان مضامین سے متعلق ہے ۔ جو ایران و عراق جنگ کے مخصوص حالات میں پیدا ہوئے ۔ شعراء نے غیرت ملّی کو بیدار کرنے ، وطن عزیز کے دفاع میں جان دینے ، مجاہدین کو جنگ میں صبر و استقامت سے کام لینے اور نبرد آزماؤں اور نوجوانوں میں دشمن کو نیست و نابود کرنے اور ان میں جوش و ولولہ پیدا کرنے کے لیے نظمیں لکھیں اورجو تمام ملت پر اثر انداز ہوئیں اور حماسی جذبہ بیدارکرنے کے کام آئیں ۔ مثلاً : (۱)

نصر اللّٰہ مردانی

سمند صاعقه زین کن سواره باید رفت　　به عرش شعلهٔ سحر با ستاره باید رفت

حمید سبز واری

جانان من برخیز و آهنگ سفر کن　　گر تیغ ببارد ، گو ببارد ، جان سپر کن

حسین فهمیده

چو خصم تاخته برخاك ما به پا خیزید　　برای یاری دین خدا به پا خیزید
ز دل نهیب کشم و بر تن کفن پوشیم　　کفن در عرصه یك جنگ تن به تن پوشیم

شعراء نے واقعۂ کربلا ، شہادت حسین ، عاشورا ، جان بازی اور ایثار جیسے متعلقہ مضامین سے بھی استفادہ کیا ہے ۔ مثلاً :

محمّد رضا سہرابی نژاد

پیکار علیه ظالمان پیشهٔ ماست　　اندر رهِ دوست مرون اندیشه ماست
هرگز ندهیم تنِ به ذلت هرگز　　در خون زلال کربلا ریشهٔ ماست
میراث شهیدان را هرگز ندهیم از کف　　کاین شیوه به نام ما ثبت است به دیوانها

حسنی حسینی

می دوم ما در که اینك کربلا می خواندم　　از دیار دور یار آشنا می خواندم
بانگ « هتل بن ناصر» از کوی جماران می رسد　　در طریق عاشقی روح خدا می خواندم

نعش شہید پر سوگ و تعزیت :

باز از جبهه حق نعش شهید آوردند　　ورقی پاره ز قرآن مجید آوردند
چاوشان حرم در علقه خوزستان　　جسم بی دست ابوالفضل رشید آوردند

۱- دکتر غلام رضا رحمدل « حماسه در شعر انقلاب» ۔

اس دور کا شاعر ذہین ہے ۔ اس کی قوت متخیلہ محکم ہے ۔ وہ نئی سے نئی تشابیہ اور استعارات اور نئی تراکیب لاتا ہے ۔ جو اسے کلاسیکی شاعری سے ممتاز کرتی ہے ۔ اور شعر نوکا طرۂ امتیاز بنتی ہے ۔ یہ چند اشعار ملاحظہ کیجئیے : (۱)

در طلوع خندۂ گل عطر ناب هستیم گرچه در خواب نجیب غنچۂ پنهانیم ما
سیلی موجیم بر هر ساحل مرد خموش بر تن بحر ستم شلاق طوفانیم ما
چراغ صبر ما فانوس راه باد نیست آسمان عشق را خورشید تابانیم ما

نام نورانی تو در افق باد شکفت روح خورشید در آیینۂ میعاد شکفت
بادۂ سبز دعا در خم جوشندۂ دل تا در اندیشۂ ما شور نو افتاد شکفت
سینۂ سرد زمین صاعقۂ عشق شکافت بر لب خشك زمان چشمۂ فریاد شکفت

دمید بهمن و شب لحظه لحظه پر پر شد فضای صبح ز عطر ظفر معطر شد

خواتین شعراء

اس انقلاب اسلامی دور میں خواتین میں بھی انقلابی روح بیدار ہوئی ۔ انہوں نے تاریخ اسلام سے اپنی شخصیت کو پہچانا اور « شمع محفل » والی شخصیت کو رد کیا ۔

۱- سیمین دخت وحیدی نے عورت کی شناخت کا نقشہ پیش کیا ہے ۔

تویی ای زن زبان عاشورا زینب کاوان عاشورا
جلوۂ سایۂ خدایی تو پرتو بزم شیوایی تو
دلی از درد ملتهب داری مادری ، مادر وهب ، آری
یار درد آشنای فاطمه ای تو پیام رسای فاطمه ای

اسیر و بستۂ تقدیر اجیر این و آن هرگز
من این وابستگی را ریشه از بنیاد خواهم زد

۲- فاطمه راکعی - از مجموعۂ شعر « سفر سوختن »

دانند گوهر شناسان غواص دریای عشقم
هم سعی نستوه هاجر آن پای پویان عشقم

۱- شعر جنگ از انتشارات وزارت ارشاد ، مردانی ، نصر الله ، قیام خون ، خون نامۂ خاك ، حمید سبزواری ، سرودۂ سپیده ۔

دست کریم خدیجه در کار احیای عشقم
من خشم زیبای زهرا یعنی که غوغای عشقم
تفسیر آیات دردم تفسیر معنای عشقم

۳- صدیقه وسمقی - از مجموعهٔ شعر « نماز باران »

آن قدر که نور سر کشیدیم خورشید شدیم ما شبانه
ما چشمهٔ آتشیم و خورشید از سینهٔ ما کشد زبانه
شب را همه ما سبو سبو نور شستیم ز روی این کرانه

۴- مہین زورقی (شاعره دزفولی) - حق پرستوں اور ملك و ملّت کیلئے جان دینے والوں کی تعریف میں کہتی ہیں :

ز هشیاران و از مستان خدایید طلوع فجر اخلاص و صفایید
غروب فصل بی باران ظلمت طلوع ماجرای کربلایید
نمی گنجید در حجم تصور که شوق پا و ادراك مایید

نثر

انقلاب اسلامی کے بعد نئے مدارس اور یونیورسٹیاں قائم ہوئیں ۔ فارسی ادب کی طرف بھی توجه مبذول ہوئی ۔ نثر و نظم پر عمومی رنگ آگیا ۔ اخباری نثر کا زیادہ رواج ہوا ۔ ادبی تحقیقات ، تنقید اور تجزیه و تحلیل کتب و رسائل میں تجدد کے آثار نمودار ہوئے ۔

اس دور میں ساده اور بے تکلف نثر لکھنے کا زیادہ رواج ہوا ۔ مذہبی ، سیاسی ، اور ثقافتی موضوعات پر ساده و صریح زبان میں مضامین لکھے گئے ۔ حضرت امام خمینی کی تقریریں ، مکالمے اور تحریریں عموماً دوسروں کے لیے اس نثر کا نمونه شمار ہوتی ہیں ۔ نئی نثر کے ساتھ ساتھ نئے مفاہیم و مطالب کے اظہار کے لئے نئی تراکیب وجود میں آئیں ۔ مثلاً ولایت فقیه ، انقلاب فرهنگی ، حجاب اسلامی ، خود کفایی ، ابر قدرت ، بسیج آزادگان وغیره .

اس دور میں جنگ اور انقلاب میں شریك ہونے والوں نے آپ بیتیاں اور یادداشتیں لکھنے کی طرف توجه کی ۔ ریڈیو ، ٹیلی ویژن کی رپورٹوں اور رویدادوں میں ساده اور بے تصنع زبان استعمال ہونے لگی ۔ مجاہدین اور شہداء کے وصیت نامے عبرت آموزی اور شجاعت آمیزی کے اعتبار سے ادب عالی میں شمار ہونے کے لایق ہیں ۔

اسلامی احکام ، ترجمه و تفسیر قرآن مجید ، اخلاق ، بزرگان دین کے احوال لکھنے میں بھی قابل توجه تبدیلی آئی ہے ۔ مدارس کی درسی کتابوں میں علمی و دینی

مضامین فصیح اور رواںِ نثر میں لکھے گئے ہیں ۔

فلمی کہانیوں ، ڈراموں ، ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں مقامی بولیوں کے الفاظ اور قصے کہانیوں میں ضرب الامثال کے استعمال سے قومی اور ملی ورثہ کا تعارف ہوا ہے ۔

دینی اور اسلامی کتابوں کے تراجم میں بھی سادہ اور فصیح نثر لکھنے کا التزام کیا گیا ہے ۔

افسانہ نویسی

افسانوں کی چار قسمیں تجویز کی جا سکتی ہیں ۔ مثلاً :

۱- رزمیہ جس میں جنگ و نبرد کے مضامین آتے ہیں ۔

۲- بزمیہ جس میں عام محبت آمیز مضامین ہوتے ہیں جیسے خانم تجار کے افسانے ۔

۳- حزنیہ ، مثلاً احمدی کے افسانے ۔

۴- طنزیہ - جیسے سید مہدی شجاعی اور احمد عربلو کی کہانیاں ۔

افسانوں کی ایك اور تقسیم بندی بھی ہو سکتی ہے ۔

۱- بچوں کے لیے کہانیاں ۔

۲- نوجوانوں کے لیے کہانیاں ۔

۳- جوانوں اور بڑوں کے لیے کہانیاں ۔

پہلی اور دوسری قسم کی کہانیاں لکھنے والوں میں حمید گروگان، محمّد میر کیانی، مصطفی رحماندوست ، ناصر ہراتی ، سیّد مہدی شجاعی ، فریدون عموزادہ ، رضا شیرازی ، محسن سلیمانی ، رضا رہگذر ، مجید راستی کے نام لیے جا سکتے ہیں ۔

تیسری قسم میں اکبر خلیلی ، جواد مجابی ، قاسم علی فراست ، بہرام بیضائی ، محسن مخملباف ، محمود اسعدی کے نام آسکتے ہیں ۔

عراق ، ایران جنگ کے دوران میں افسانوں کے موضوعات کو اس طرح متعارف کیا جاسکتا ہے :

۱- جنگی واقعات سے متعلق کہانیاں ۔

۲- ہمسایہ ممالك سے جنگیں - انقلاب اسلامی سے پہلے اندرونی خلفشار ۔

۳- اجتماعی ، سیاسی اور تاریخی مسائل سے متعلق کہانیاں ، انقلاب اسلامی سے پہلے ۔

۴- جنگ سے متعلق سیاسی ، تاریخی اور اجتماعی احوال و نظریات سے متعلق افسانے ۔

۵- اخلاقی ، دینی اور انسانی موضوعات پر افسانے ۔

۶- بیرون ملك مقیم ایرانیوں سے متعلق افسانے ۔

بعض ایسے بھی افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں کے مجموعوں میں مختلف موضوعات پر کہانیاں موجود ہیں ۔ رزمیہ داستانیں لکھنے والوں میں ایسے افراد شامل ہیں جو جنگ کے محاذوں میں شریك ہوئے ۔ اس لیے ان کے افسانوں میں سچے جذبات کے ساتھ ساتھ واقعیت بھی ہے اور تأثیر بھی ۔ ایسے اشخاص میں قاسم علی فراست ، محمود اسعدی ، ابراہیم حسن بیگی ، غلام رضا عیدان ، صادق گرمبار ، مصطفی جمشیدی ۔

جنگ سے متعلق افسانوں کے مجموعے :

باران کی می بارید = حسن احمدی ۔

شب ملخ = دکتر جواد مجابی ۔

نرگسہا = راضیہ تجار۔

قصہ خانہ ٔ ما = محمّد میر کیانی ۔

فریاد در خاکستر = صادق گرمبار ۔

خدا حافظ برادر = رضا رهگذر ۔

مرغهای دریایی این سوی آنها می میرند = مصطفی جمشیدی ۔

کوه و گودال = ابراهیم حسن بیگی ۔

مندرجہ ذیل تمام کے تمام افسانے جنگ سے متعلق ہیں :

خط ها و سایه ها = عبدالمجید حسینی زاد ۔

کی می رسد باران = غلام حسن کاویانی ۔

یادگارها = حسن احمدی ۔

ناول یا ناولٹ

معنوی لحاظ سے ناول نگاروں کی کوشیش قابل تحسین ہیں ۔ لیکن فنی لحاظ سے ان پر گفتگو ہو سکتی ہے ۔ جنگ کے متعلق مندرجہ ذیل ناول لکھے گئے :

نخلهای بی سر = قاسم علی فراست ۔

ترکه های درخت آلبالو = اکبر خلیلی ۔

فردا پسرم بر می گردد = رحیم مخدومی ۔

طلوعی در مغرب = رنجبر گل محمدی ۔

راه بی کناره = ناصر ایرانی ۔

اسماعیل اسماعیل = محمود گلابدره ای ۔

خواتین افسانہ نگار

۱- افسانہ نویسی میں خواتین نے بھی حصّہ لیا ۔ ایک گروہ ان خواتین کا ہے جو انقلاب اسلامی سے پہلے بھی لکھتی تھیں لیکن ان کے موضوعات انقلاب اسلامی اور ایران عـراق جنگ سے مختلف تھے ۔ ان میں ڈاکٹر سیمین دانشور ، شہر نوش پارسی پور، روانی پور، فرشتہ مولوی ، فرشتہ ساری ۔

۲- دوسرا گروہ ان خواتین کا ہے جو انقلاب اسلامی کے کامیاب ہونے پر افسانہ نویسی کی طرف مائل ہوئیں ۔ ان میں راضیہ تجار ، مریم جمشیدی ، سمیرا اصلان پور ، فاطمہ خرامانی ، زہرا زواریان کے نام لیے جا سکتے ہیں ۔ ان میں راضیہ اور سمیرا زیادہ کامیاب ہیں ۔

اخبار نویسی

۱۹۷۸ء میں رضا شاہ کے خلاف جدوجہد کے موقع پر اخبارات کی تعداد میں اضافہ ہوا . ۱۹۷۹ء میں چار سو تک اخبار شایع ہوئے ۔ ایران و عراق جنگ کے دوران میں اخبارات کی تعداد کم ہوگئی ۔ ۱۹۸۹ء میں جنگ کے اختتام پر اخبارات کی تعداد میں اضافہ ہوا اور تعداد ۵۶۰ تک پہنچ گئی ۔ تعداد اخبار کے ساتھ تعداد اشاعت بھی بڑھ گئی ۔ ۱۹۹۲ء میں ایک جائزے کے مطابق ۱۳ اخبارات کی تعداد اشاعت ۱،۵۰۰،۰۰۰ سے لے کر ۱،۸۶۰،۰۰۰ تک ہوگئی تھی ۔ تقریباً ۸۰ فی صد اخبار فارسی میں چھپتے ہیں ۔ دوسری زبانوں میں چھپنے والوں کی تعداد حسب ذیل ہے :

انگریزی = ۹

عربی = ۷

آذربائیجان ، ترکی ، ارمنی، کردی، اردو ، بریلی = ۱ یا ۲

دو زبانی

انگریزی، فارسی = ۵۹

فارسی ، ترکی = ۱۰

فارسی، عربی = ۴

فارسی کردی ، فارسی فرانسیسی ، انگریزی فرانسیسی ، انگریزی عربی = ایک ایک ۔

سہ زبانی

فارسی، انگریزی، فرانسیسی = ۲

ترکی، روسی، (کریل = ۱

۱۹۸۶ء میں اخبارات سے متعلق ایك قانون نافذ ہوا ۔ اس قانون کی شق ۴ کے مطابق ہر قسم کی خبریں شایع کرنے کی اجازت ہے ۔ شق ۳۴ کے مطابق قانون کی خلاف ورزی کی صورت میں عدالت تحقیق کرے گی ۔ اخبارات پر سنسر نہیں ۔ قانونی محیط کے اندر رہ کر اخبارات کو کام کرنے کی اجازت ہے ۔

آج کل ایران میں تقریباً ۳۰ روزنامے ، ۱۳۴ ہفتہ وار اور ۳۵۴ ماہنامے شایع ہوتے ہیں ۔ (۱)

انقلاب اسلامی کے دَور میں ادب کی تفصیل کے لئے دیکھیئے : مقالات دربارۂ ادبیات انقلاب اسلامی ، مترجم دکتر ظہور الدّین احمد ، زیر اہتمام خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران ، لاہور ۱۳۷۴ ش /۱۹۹۵م.

۱- مجلۂ ایرانشناسی، لاہور، شمارہ ۵ ، ص ۹۰ ۔

بخش دوازدهم :
اسالیب شعر و نثر

سبک
سبک کے لغوی معنی پگھلی ہوئی دھات کو سانچے میں ڈھالنا ہے ۔ لیکن اصطلاحاً سبک سے مُراد کسی ادیب یا شاعر کا اپنے فکر و نظر کے بیان کا ایک مخصوص اور منفرد انداز ہے ۔ لیکن یہ اندازِ بیان ہمیشہ یکساں نہیں رہ سکتا ۔ یہ انداز ایک خاص شخص سے متعلّق ہوتا ہے اور دوسروں سے بہت مختلف ہوتا ہے ۔ فارسی شاعری میں پانچ سبک مشہور ہیں ۔

(۱) سبکِ خراسانی ۔ (۲) سبکِ عراقی ۔ (۳) سبکِ ھندی ۔
(۴) سبکِ بازگشت ادبی ۔ (۵) سبکِ تجدّد و انقلاب ۔

اگرچہ یہ سبک مقامات (خراسان ، عراق ، ھند وغیرہ) سے وابستہ ہیں لیکن تحوّل شعر میں مکان کا تعلّق نہیں بلکہ اس کا تعلّق زمان سے ہے یعنی مُعیّن تاریخی ادوار سے ہے ۔ چونکہ ہر سبک ایک خاص علاقے میں پیدا ہوا اور وہیں اس میں توسیع و ترقی ہوئی ، اس لیے اسی علاقے سے منسوب رہا ۔ سبک خراسانی کو سبک ترکستانی اور سبک عراقی کو سبکِ اصفہانی بھی کہتے رہے ہیں ۔ بہت سے سیاسی ، اقتصادی ، اجتماعی اور ادبی عوامل کی بنا پر ایک سبک میں تغیر و تحوّل پیدا ہوا ۔ اور پھر دوسرا سبک وجود میں آیا ۔ شعرا شعری قوالب ، معانی ، محسوس الفاظ اور دوسری مُشترک خصوصیات کی بنا پر ایک سبک میں شمار ہوتے ہیں ۔

سبک خراسانی
سبک خراسانی کا زمانہ صفّاری ، سامانی، غزنوی اور ابتدائی سلجوقی دور پر محیط ہے ۔ یعنی ۲۵۲ ھ سے تقریباً ۵۰۰ ھ تک ۔

دورِ صفّاری میں فیروز مشرقی ، ابو سلیک گرگانی اور محمّد ابنِ وصیف سگزی (سجزی) جیسے شعراء کے نام ملتے ہیں چونکہ ان کے شعر بہت کم تعداد میں باقی رہ گئے ہیں اس لیے انہی کے مطالعے سے مندرجہ ذیل خصوصیات معلوم کی جا سکتی ہیں ۔

سب سے قدیم شعر محمّد بن وصیف نے کہا ۔ اس دور میں مثنوی نہیں کہی گئی ۔ اشعار کے موضوع مدح ، پند اور مُعاشقہ ہیں ۔ قرآنی آیات کی تلمیحات پائی گئی ہیں ۔

شاعر نجوم و طبیعات کے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کرتا ہے۔ تشبیہات عموماً سادہ ، لطیف اور حسّی ہیں ۔ غیر ذی روح اسماء کے لیے بھی فعل کو جمع لاتے ہیں . ایک حرفِ اضافہ کی بجائے دو حرفِ اضافہ لاتے ہیں ۔ مثلاً :

قولِ خداوند بخوان فَاستَقِمْ مُقتدی شو و برآن بر بایست

کہیں کہیں پہلوی کے الفاظ اور عربی ترکیبات بھی نظر آتی ہیں .

دورۂ حکومتِ سامانی (۲۶۱- ۳۸۹ ھ) میں لُغت فُرسِ اسدی میں ۷۵ شُعراء کے نام آئے ہیں ۔ لیکن ایک ایک دو دو اشعار کے علاوہ کچھ محفوظ نہیں ۔ اس دور میں رُودکی اور اس کے معاصر شعراء میں سے ۳۶ شعراء کے نام لیے جا سکتے ہیں ۔ ان میں رُودکی ، ابو شکور بلخی ، شہید بلخی ، مسعودی مَروَزی ، ابو المؤید بلخی اور آغاچی بخاری زیادہ معروف ہیں ۔ ان شعراء کے صرف دو ہزار اشعار باقی رہ گئے ہیں ۔ اس دَور کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں :

(۱) اس دَور میں عربی صَرف و نحو اور بلاغت کے قوانین کا اثر کم ہوا ۔

(۲) مثنوی نویسی کا رواج زیادہ ہوا ۔ رُودکی ، ابو شکور بلخی ، اور مسعودی مروزی کی مثنویاں مشہور ہیں ۔

(۳) عربی الفاظ کا استعمال کمتر ہوا ۔

(۴) موضوعات شعری میں وسعت پیدا ہوئی ۔ پُرانی داستانیں ، قصّے اور رزمیہ کہانیاں منظوم ہوئیں ۔

(۵) اشعار میں پُختگی آئی ۔ آرایشاتِ شعری کی طرف میلان بڑھا ۔ بحور میں بھی تنوّع پیدا ہوا ۔

(۶) قصیدہ کے آغاز میں نسیب و تشبیب کے طور پر عشقیہ مضامین کا آغاز ہوا . جذبات و احساسات کا اظہار عام ہوا ۔ مناظرِ قدرت کا بیان بھی آنے لگا ۔ اجتماعی تربیت کے مضامین بھی داخل ہوئے ۔

(۷) ہجو و هزل کا بھی رواج ہوا ۔

اس دور میں لفظی اعتبار سے قدامت کے آثار موجود ہیں ۔ مثلاً :

(۱) پہلوی الفاظ - ایدر ، ایدون اور ابا کا استعمال ۔

(۲) الف اطلاقی کا زیادہ استعمال ۔

(۳) مصرعوں کے اوّل واؤ عطف کا استعمال ۔

(۴) امالہ و اشباع ۔

(۵) عربی جمع کے ساتھ ، فارسی جمع کی علامت کا اضافہ ، مثلاً فضایلها ۔

(۶) تخفیفِ مشدّد اور تشدیدِ مخفّف۔
(۷) نامانوس بحروں کا انتخاب۔
(۸) کافِ تصغیر کا استعمال۔
(۹) خارج از عروض اشعار بھی نظر آتے ہیں۔

اس دور میں بھی شعراء اپنی قابلیت کا اظہار کرتے ہیں۔ قرآن ، حدیث اور ضرب المثل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ صنائع بدیعی کا استعمال عام ہوا۔

دورۂ غزنوی کا عروج ۳۸۸ سے ۴۳۱ ھ تک رہا۔ ۴۲۱ ھ اور ۴۳۷ ھ کے درمیان سلجوقیوں کے ہاتھوں غزنوی سلطنت کے تمام علاقے مفتوح ہوگئے۔ سلاطینِ غزنوی کے جانشین ۵۸۲ تک لاہور میں سلطنت قائم رکھ سکے۔ اس دور میں تقریباً دو سو شعراء کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے فردوسی ، فرّخی ، منوچہری ، عنصری ، رشیدی ، غضائری ، عسجدی ، لبیبی ، مسعودِ سعدِ سلمان اور ابو الفرج رُونی زیادہ معروف ہیں۔ اس دَور کی شاعری میں تنوّع اورتازگی آئی ہے۔ بحور بھی نرم و ملائم استعمال ہوئیں۔ الفاظ و تراکیب کے انتخاب میں تناسبِ معنی کا خیال رکھا گیا۔ موضوعات بھی نئے داخل ہوئے۔ عشق اوراس کے لوازم ، مناظرِ قدرت اور اس کی رنگارنگی ، چھوٹی بڑی رزمیہ ، عشقیہ ، حکمت آمیز اور عارفانہ داستانیں لکھی گئیں۔

اس دَور میں مُخلِّ فصاحت الفاظ ، وزن سے خارج مصرعے اور دوسرے عیوب کم ہوئے۔ سبک خراسانی کے ممیّزات میں قدامت کے آثار میں سے وہی چیزیں پائی جاتی ہیں جن کا ذکر دورۂ سامانی میں ہوا۔ لفظی و بدیعی صنائع کے استعمال میں اضافہ ہوا۔ دکتر جعفر محجوب نے ۶۸ قسم کے صنائع کی نشاندھی کی ہے۔ مضامین شعری میں مدح ، ہجو و ہزل ، تغزّل ، پند و حکمت ، توصیف اور مطالب زاہدانہ کا اضافہ ہوا۔

قصیدے کی تشبیب میں مناظر فطرت کے علاوہ محبوب کے چہرے ، گیسو اور رُخسار کی تعریف، ہجر کا شکوہ ، وصال کا سُرُور، سفر ، چراگاہوں ، کھنڈروں کا بیان ، کبھی کبھی زہد و تقوی اور ترکِ دُنیا کا سبق ، ممدوحین کی بزم نشاط ، شکار، میدانِ جنگ اور دُور دراز منازلِ سفر کا حال بیان ہوتا ہے۔

اِس زمانے میں شاعر کا معشوق تُرکی سپاہی ، خُتَنی و خطائی محبوب یا ستار نواز کنیز ہے۔ ابھی عشقِ عارفانہ عشقِ محبوبِ ازلی اور عشق عالم سوز آتش پیدا نہ ہوا تھا۔ اشعار زاہدانہ و اخلاقی اور عقایدِ دینی کسائی مروزی کے توسّط سے رائج ہوئے۔

غزنویوں کی حکومت غزنہ اور برِّصغیر تک محدود رہ گئی اور ۴۳۱ ھ سے سلاجقۂ خراسانی ری ، اصفہانی اور ایشیائے کوچک تک قابض ہوگئے۔ سلجوقی فرمانروا ، شعر و

شاعری سے کمتر رغبت رکھتے تھے ۔ وہ صوفیاء عُرفا اور ائمّہ سے زیادہ عقیدت و ارادت رکھتے تھے ۔ اس لیے ۵۰۰ ھ تك ایران میں جو سبك خراسانی کا زمانہ ہے ۔ شاعری میں وہی خصوصیّات موجود ہیں جو عہد غزنوی کے شعراء میں موجود تھیں ۔ رفتہ رفتہ ان میں تغّیر آتا رہا اور بعد میں وہاں سبكِ عراقی کے نام سے ایك نیا سبك وجود میں آیا ۔ اس دور کے معروف شعـــراء میں ازرقی ، سنائی ، حسن غزنوی ، اسعد گرگانی ، اسدی طُوسی ، قطران تبریزی ، حکیم ناصر خســـــرو اور حکیم عُمر خیّام کے نام لیے جا سکتے ہیں ۔

اسی دور میں اصنافِ سخن میں سے رُباعی ، دوبیتی ، ترجیع بند ، ترکیب بند اور مُسمَّط کا بھی رواج رہا ۔ ترجیع بند اور ترکیب بند میں مدح کے علاوہ مرثیہ اور مضامینِ عارفانہ بھی شامل ہوئے ۔ رزمیہ مثنویوں کے علاوہ عشقیہ اور ناصر خسرو کی حکمت آمیز مثنویوں کا اضافہ ہوا ۔ سنائی کی حدیقہ اور دوسری مثنویاں تصوّف و عرفان کے موضوعات پر بے نظیر ہیں. مسعود سعد سلمان کا مستزاد بھی یادگار ہے ۔ اس کی حبیسہ نظمیں اور « شہر آشوب » فارسی ادب میں اوّلیت کا درجہ رکھتی ہیں ۔

سبك عراقی

سبك خراسانی جو عموماً سامانی اور غزنوی ادوار کے شعراء سے منسوب و مربوط رہا۔ اپنے سادہ اور فطری اسلوبِ نگارش کی وجہ سے معروف رہا ۔ ایران میں دورۂ سلجوقی کے آغاز سے ایران کے بعض حصّوں خصوصاً اصفہان ، ری اور آذربائیجان میں علمی و ادبی فضا میں خاصا تحوّل پیدا ہوا ۔

(۱) عربی علوم و ادبیّات کا بڑا چرچا ہوا ۔ فضیلت کا معیار زبانِ عربی میں تسلّط کے علاوہ طب، نجوم ، ہیئت ، تفسیر ، فقہ اور دیگر قرآنی علوم میں مہارت ٹھہرا ۔

(۲) علمی اصطلاحات کا عام رواج ہوا ۔

(۳) عربی الفاظ کی کثرت ہوئی ۔

(۴) عربی ادبیّات کا اثر و نفوذ بڑھا ۔

(۵) شعر میں علوم عقلی و نقلی اور تاریخی واقعات کی تلمیحات شامل ہوئیں ۔

اس دور میں قصیدہ ، غزل اور رباعی کو خوب ترقی ہوئی ۔ شعراء کے اسلوب میں بعض ایسی خصوصیات شامل ہوئیں اور ایك مجموعی تأثر پیدا ہوا جسے سبك عراقی کے نام سے روشناس کرایا گیا ۔ اس کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں ۔

(۱) شعراء نے اپنے علم و فن و فضائل پر فخر و مباہات کرنا اپنا شیوہ ٹھہرا لیا۔ مثلاً : جمال الدّین اصفہانی فرماتے ہیں :

تُو بقدر چو خاکِ من منگر هُنَرم بین که بی حساب شده است

(۲) گردشِ روزگار ، بختِ واژگون اور فلکِ دوّار کے خلاف شکوہ و شکایت ، انوری نے کہا ہے :

اگر محوّلِ حالِ جهانیان نه قضاست چرا مجاریِ احوال بر خلافِ رضاست
آمد نصیبِ من ز همه مردمان دو چیز از دشمنان خصومت و از دوستان ریا

(۳) سبکِ عراقی کے شعراء اپنی علمی فضیلت کے اظہار کے لیے علمی ، تاریخی و فلسفیانہ معلومات کا اظہار کرتے ہیں اور علمی اصطلاحات کی وجہ سے عوام کے لیے ان کا کلام سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے ۔ انوری و خاقانی کے کلام میں اکثر اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں ۔ مثلاً:

گر ثور چو عقرب نشدی ناقص و بی چشم بر قبضۂ شمشیر نشاندی دبران را
گفتم اغلوطه مده این چه دوئی باشد گفت دوئی عقل که هم شاهد و هم مشهود است

(۴)سبکِ عراقی کے شعراء تکلّفاتِ ادبی کی طرف مائل تھے ۔ قُدرتِ کلام اور قُدرتِ طبع کا زور دکھانے کے لیے مشکل الفاظ لاتے ۔ دشوار قوافی اور ردیف لا کر اپنی مہارت دکھاتے ۔ نت نئے مضامین پیدا کرتے ۔ مثلاً قصیدہ انوری کی یہ ردیف دیکھیے :

ای از رُخَت فگنده سپَر ماه و آفتاب طعنه زده جمالِ تو بر ماه و آفتاب

خاقانی نے کہا ہے :

دَرعِ حکمت پُوشم و بی ترس گویم القتال خوانِ حکمت سازم و بی بُخل گویم الصّلا

(۵) صنائع لفظی و معنوی کا استعمال کثرت سے ہوا ۔ رشید الدّین وطواط نے اس فن پر ایک کتاب تألیف کی جس کا نام « حَدائقُ السِّحر فی دَقائقُ الشّعر » ہے ۔ شعراء کے اس رُجحان کی وجہ سے ان کے کلام میں تشبیہاتِ غریب ، کنایاتِ غیر بلیغ اور استعارات نامانوس دیکھنے میں آتے ہیں ۔ قطران تبریزی ، رشید الدّین وطواط ، عبدالواسع جبلی اور عُمعُق بخاری کے کلام میں اس قسم کے نمونے موجود ہیں ۔ مثلاً :

یافت از دریا دیگر ابر گوهر بار بار باغ و بُستان یافت دیگر ز ابر گوهر بار بار
شیره بارد همیشه دیدۂ من از غمِ آن دو خوشۂ انگور

(۶) سبکِ عراقی قصائد ہی سے مختص نہیں بلکہ مثنوی میں بھی نمایاں ہے ۔ نظامی گنجوی کی مثنویاں اس کی عمدہ مثال ہیں ۔ تشبیہات و استعارات دقیق و بعید ہیں. عبارات میں تکلّف ہے ۔ صنــــائع بدائع کا استعمــال بکثرت ہے ۔ خیالات میں ابہام و

پیچیدگی ہے . مطالب کا سمجھنا دشوار ہے .

ز باریدنِ ابرِ کافور بار سَمَن رُسته از دستهایِ چنار
نسب نامهٔ دولتِ کیقباد ورق بر ورق هر سوی برد باد
(نظامی)

(۷) رُباعیات میں بھی تصوّف ، فلسفه و الہیات کے مضامین داخل ہوگئے تو ان کے اندازِ بیان میں بھی آہسته آہسته سبکِ عراقی کی جھلك نمایاں ہوگئی. رباعیاتِ خیّام میں اس کی مثالیں موجود ہیں . مثلاً :

در دائره ای که آمدن و رفتنِ ماست آن را نه بدایت نه نهایت پیداست
کسی می نزند دمی درین معنی راست که این آمدن ز کجا و رفتن به کجاست
(خیّام)

(۸) غزل میں حافظ کو سبك عراقی کا نمائندہ کہا جاسکتا ہے . اس نے غزل میں صنائع بدیعیه کا استعمال کیا ہے. تشبیہات ، استعارات اور کنایات کو ایسے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے که تکلّف و تصنّع معلوم نہیں ہوتا . ایہام کی مثال دیکھیے :

گفت طبیب از سرِ حسرت چو مرا دید هیهات که دردِ تو ز قانون شفا رفت
با صبا در چمنِ لاله سحر می گفتم که شهیدانِ که اند این همه خونین کفنان

(۹) تصوّف کی اصطلاحات اور مے و میکده سے متعلق الفاظ کو بھی تصوّف و عرفان کے مطالب کے لیے استعمال کیا گیا چنانچه مجازی و حقیقی معانی کا امتزاج حافظ کے ہاں بدرجهٔ کمال موجود ہے :

مقامِ اصلیِ ما گوشهٔ خرابات است خداش خیر دهد آنکه این عمارت کرد

ما در پیاله عکسِ رُخِ یار دیده ایم ای بی خبر ز لذّتِ شُربِ دوام ما

(۱۰) سبك عراقی کا دَور پانچویں صدی کے وسط سے آٹھویں صدی کے اواخر یعنی دورهٔ تیموریانِ ایرانی تك محدود کیا جاسکتا ہے . سبكِ خراسانی سے ہٹ کر اس دور میں قصیده و مثنوی کے علاوہ غزل کو تخصّص اور تنوّع نصیب ہوا . غزل کو زبان میں نرمی و ملائمت اور پُختگی آ گئی . تصوّف کی آمیزش سے اور بھی دلنشینی پیدا ہوئی . عشقیه واردات و کیفیّات بر ملا بیان ہونے لگیں . صوفی شعراء نے اپنے جذبوں کی مستی و شوریدگی کو بھی شامل کیا تو غزل دو آتشه ہوگئی . غزلیں محافل سماع میں پڑھی جاتیں تو سامعین پر وجد و کیف طاری ہوجاتا . مولانا روم ، سعدی ، عراقی اور حافظ کی غزلیات ان خصوصیات سے مالا مال ہیں اور غزل کا یه انداز سبکِ عراقی کا

طرّۂ امتیاز ہے ۔ رومی ، سعدی اور عراقی کا ایک ایک شعر پیش ہے ۔ ہر ایک شعر اس روش کو اجاگر کرتا ہے :

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تُست تا نپنداری کہ تنہا می روی
(سعدی)

به طوافِ کعبه رفتم به حرم رهم ندادند که برونِ در چه کردی که درونِ خانه آئی
(عراقی)

چه کُنم تُرا طلب خانه بخانه در بدر چند گُریزی از برم گُوشه بگُوشه کُو بکُو
(رومی)

(۱۱) سبک عراقی کے دَور کو ایک اور خصوصیّت نمایاں کرتی ہے وہ ہے اخلاق و موعظت ، تنبیہ و تحذیر کے موضوعات ۔ شعراء نے قصائد ، غزلیات ، قطعات اور مثنویوں میں اس خاص موضوع پر طبع آزمائی کی ہے ۔ ناصر خسرو ، خاقانی ، عطّار ، سعدی اور رومی خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ خاقانی کا بلند پایہ طویل قصیدہ شاہکار ہے ۔

خاقانی کا یہ شعر ملاحظہ ہو :

دلِ من پیر تعلیم است ، من طفلِ زباندانش دمِ تسلیم سر عُشر و خم زانو دبستانش

ناصرخسرو نے اپنا کلام اخلاقی ، ادبی اور فلسفی عقائد کو بیان کرنے میں صرف کیا ۔ سعدی کی اخلاقی شاعری بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے ۔

سبک هندی

نویں صدی ہجری کے اواخر میں شعراء سادہ اور عام فہم شعر کہنے سے اُکتا گئے اور پھر عالمانہ تشبیہات اور استعارات کی طرف مائل ہوئے ۔ ابتدا امیر علی شیر نوائی اور عبدالرّحمن جامی کی مجالس سے ہوئی۔ پھر فغانی شیرازی نے غزل میں اس کی پیروی کی ۔ فغانی نے بہت شہرت پائی ۔ اس کے معاصرین میں سے اہلی شیرازی ، خواجہ آصفی اور امیر شاہی نے بھی اسی اسلوب میں لکھا۔ پھر لسانی، شریف تبریزی، مُحتشم کاشی ، ضمیری اصفہانی اور وحشی بافقی نے پیروی کی اور یہ سبک ایران ، برّصغیر اور توران میں مقبول ہوگیا ۔ بعد میں میرزا قلی میلی ، خواجہ حُسین ثنائی ، ولی دشت بیاضی ، حاتم کاشی ، الہی قُمی اور حضوری قمی وغیرہ نے اس اسلوب میں مبالغہ کیا ۔ برّصغیر میں عرفی نے اس میں جدّتیں پیدا کیں ۔ عُرفی کی پیروی میں فیضی، رُکنای مسیحی ، حکیم شفائی نے اس کی تقلید کی ۔ صائب تبریزی اس اسلوب کے اُستاد مانے

گئیے ۔ تیرھویں صدی تک یہ سبک مقبول و مروّج رہا ۔

صفویّہ دَورِ میں مذہبی و دُنیوی علوم کی طرف زیادہ توجّہ دی گئی اور قصیدہ سرائی کی بجائیے مناقبِ ائمّہ اور شہدائیے کربلا کے مرثیے لکھنے کی تشویق کی گئی ۔ درباری شعراء شاہی سرپرستی سے محروم ہوگئیے تو انہوں نے برّصغیر کا رُخ کیا ، جہاں شاھانِ تیموری کی فیّاضیاں عروج پر تھیں ۔ عرفی ، نظیری ، طالب آملی ، کلیم همدانی اور صائب جیسے ذھین اور بلند پایہ شعراء وہاں گئیے ۔ اور انہوں نے اس نئیے اسلوب کو کمال عروج تک پہنچا دیا ۔ متأخّرین میں بیدل ، غنیمت اور غالب اس اسلوب کے نمائندہ شعراء شمار ہوئیے ۔

سبکِ ھندی کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں :

۱- متقدّمین عموماً اپنی بات کو سادہ اور فطری انداز میں ادا کرتے تھے ۔ البتہ ادبی پیرائیے میں اور قریب الذّھن تشبیہات و استعارات کے ساتھ ۔ لیکن سبک ھندی کے شعراء اپنے مطالب کو غرابت اور ابہام سے بیان کرتے تھے جس سے ذھن اور طبیعت میں ایک تحرک پیدا ہوتا ۔ مثلاً سعدی ایک بات کو سادہ اور صریح بیان میں کہتا ہے :

دیدار می نمائی و پرهیز می کُنی بازارِ خویش و آتشِ ما تیز می کُنی

صائب نے اسی بات کو نئیے انداز میں کہا :

به پُرکاری نظر می پوشد از عشّاقِ سودائی دکان داریست در جوشِ خریداران دکان بستن

۲- سبکِ ھندی کے شعراء کی یہ کوشش رہی ہے کہ نئے سے نیا مضمون اورعجیب سے عجیب خیال لائیں ۔ اسی کو تازہ گوئی اور مضمون آفرینی کہتے ہیں ۔ اُن کی دقّتِ نظری، باریک بینی اور معنی آفرینی سے آدمی حیران رہ جاتا ہے .صائب نے خود کہا ہے :

عشرتِ ما معنیِ نازک بدست آوردن ست عیدِ ما نازک خیالان را هلال این است و بس

کلیم نے کہا :

می نهم در زیرِ پای فکر کُرسی از سپهر تا به کف می آورم یک معنیِ برجسته را

خیال بافی اور مضمون آفرینی کا ایک عُمدہ نمونہ یہ شعر ہے :

نرگس از چشمِ تو دم زد در دهانش زد صبا دردِ دندان دارد اکنون می خورد آب از قلم

۳- سبک ھندی کے شعراء کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ بڑے سے بڑے مضمون کو ایک شعر میں سمو دیں اور جہاں تک ہو سکے ایجاز سے کام لیں ۔ وہ اکثر اپنے کلام میں موضوع کو حذف بھی کر جاتے ہیں اور قاری یا سامع بڑی کوشش سے قرائن کی مدد سے تہ مطلب تک پہنچتا ہے ۔ بعض جگہ اس قدر ابہام و تعقید پیدا ہوجاتی ہے کہ شعراء ایک مُعمّا بن جاتا ہے ۔

شمع را بر سر نمی دانم ہوای رُوی کیست ؟ بُویِ گُل می آید از دردِ پرِ پروانه ام

۴- سبك ھندی میں تشبیہات و استعارات بھی دقیق، غریب ، بعید اور خیال انگیز ہوتے ہیں ۔ مثلاً نظیری نے کہا ہے :

ما ز آغاز و ز انجام جهان بی خبریم اوّل و آخرِ این کُهنه کتاب افتاده است

۵- سبك ھندی کے اشعار میں عامیانہ کلمات ، ترکیبات اور اصطلاحات بھی داخل ہوگئی ہیں جو غیر فصیح اور مُبتذل بھی ہیں ۔ لیکن عمومی محاورہ کے نزدیك ہیں . مثلاً ناخن زدن ، آب در شیر کردن ، بُویِ شیر از دهان آمدن یك قلم ، یکدست ، که چه ، بی پیر قسم کے محاورات دیکھنے میں آتے ہیں ۔

اگر نه تیرگی آرد طمع ، چرا سائل چراغ می طلبد روزِ روشن از مردم

با شرابِ تازه زاهد ترشرویی می کند کُو جوانمردی که سازد کارِ این بی پیر را

۶- سبك ھندی کی ایك نمایاں خصوصیت اشعار میں ارسال المثل کا استعمال ہے ۔ شاعر ایك مصرع میں اپنے موضوع کا ذکر کرتا ہے ۔ دوسرے مصرع میں اس کی تائید یا اثبات کے لیے ایك مثال پیش کرتا ہے ۔ نظیری ، کلیم ، صائب ، غنی اسے بڑی مہارت سے استعمال کرتے ہیں ۔ مثال میں تازگی ، شگفتگی اور دلنشینی پیدا کرنے کیلئے غائر مشاہدے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ نمونے کے طور پر شعر حاضر خدمت ہے :

مقسومِ اهل علم عذابیست در جهان رسمیست در شکنجه کشیدن کتاب را

۷- سبك ھندی کے اشعار میں عموماً صنعت تقابل (تضاد) اور مراعات النظیر سے اکثر کام لیا جاتا ہے ۔ مثلاً :

ز خاك افسرده تر از باد سرگردان ترم صائب علاجِ دردِ من از آب آتش رنگ می آید

۸ - متقدمین عموماً غزل میں عشقیه مضامین لاتے تھے ۔ سعدی نے اس میں اخلاق ، وعظ و تنبیه کے مضامین شامل کیے ۔ حافظ نے تصوّف و عرفان کے موضوعات کا اضافه کیا ۔ سبك ھندی کی غزل میں ان مذکورہ موضوعات کے علاوہ اجتماعی ، اخلاقی اور معاشرتی موضوعات کا بھی اضافه ہوا ہے اور بعض ایسے مضامین آئے ہیں که قدیم شعراء کے اشعار میں ان کا کوئی نمونه نظر نہیں آتا ۔ مثلاً:

در مجالس حرفِ سرگوشی زدن با یکدگر در زمینِ سینه ها تخمِ نفاق افشاندنست

چونکه تازه گوئی اور مضمون آفرینی سبك ھندی کا امتیازی وصف ہے ۔ اس لیے غزل کے ہر شعر میں متنوّع مضامین لانے کی کوشش کی گئی ہے اور یه وصف قُدماء کی غزلوں سے اُسے ممتاز کرتا ہے ۔ اگرچه کہیں کہیں مُتحّد الموضوع غزلیں بھی مل جاتی ہیں لیکن بہت کم ۔ غزل کے عمـــوماً سات سے چوده تك اشعار ہوتے ہیں ۔ لیکن

سبک هندی کے شعراء نے بیس بیس اشعار کی غزلیں بھی کہی ہیں اور قوافی بھی مکرّر لائے ہیں۔

۹- سبک هندی کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ شعراء نے ہر قسم کی حالت، کیفیت اور فکر کے بیان میں افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ اس لیے اکثر اشعار میں معانی مبالغہ آمیز نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

زند پهلو به گردون کوهِ عصیانی که من دارم　　به صد دریا نگردد پاك دامانی که من دارم

۱۰- وہ ایرانی شعراء جو برّصغیر میں آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ ان میں سے بعض یہاں کے رسم و روایت اور فلسفۂ فکر سے بھی متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنے اشعار میں ان خیالات کو مُنعکس کیا۔ اس طرح سبک هندی کو یہ بھی نمایاں خصوصیت شمار ہونے کے لائق ہے۔ مثلاً نظیری کا یہ شعر:

شهودِ بُت ز پراگندگیم باز آورد　　دلیل راهِ حقیقت برهمنی ست مرا

اسالیب نثر

دورۂ سامانی

۱- نثر ساده و روان۔
۲- اصالت زبان قدیم۔
۳- عربی الفاظ و اصطلاحات کم تعداد میں داخل ہیں۔
۴- نثر مساوات۔

دورۂ غزنوی

۱- آیات قرآنی و امثال کا استعمال۔
۲- عربی الفاظ کی کثرت۔
۳- تألیفات بو علی سینا اور البیرونی میں سبک علمی وجود میں آیا۔
۴- تاریخ بیهقی اور رسائل مشکان میں اطناب عبارات موجود ہے۔

دورۂ سلجوقی

۱- قابوسنامه، چهار مقاله، کیمیای سعادت، سیاست نامه کا اسلوب ساده و روان۔
۲- تاریخ بیهقی، مرزبان نامه کا اسلوب مصنوع۔
۳- اصطلاحات علمی و فلسفی کا اضافہ۔
۴- اشعار اور ضرب المثل زیادہ ہوئے۔
۵- ترکیبات عربی، مشکل الفاظ، مترادفات و متجانس کا استعمال۔

۶- جملہ ہائے طویل ۔
۷- صنایع لفظی و معنوی کا استعمال ۔
۸- مسجع عبارات کا استعمال زاد العارفین ، کنز السالکین ، صد پند از عبداللہ انصاری اور مقامات حمیدی ہیں ۔

دورۂ ایلخانی

۱- مغولی و ترکی عسکری اور اجتماعی اصطلاحات داخل ہوئیں ۔
۲- تصوف و عرفان کی اصطلاحات کا استعمال ۔
۳- الفاظی و عبارت آرائی ۔
۴- صنایع لفظی و معنوی کا استعمال ۔
۵- عبارات مغلق و غامض ۔
۶- اطناب ۔

یہ اسلوب تاج المآثر ، تاریخ جہانگشای جوینی ، تاریخ وصاف ، مرزبان نامہ میں نمایاں ہے ۔

نثر متوسطہ

گلستان ، اخلاق ناصری ، اوصاف الاشراف ، جامع التواریخ ۔

دورۂ تیموری

۱- سادہ - لطائف الطوائف ، رشحات عین الحیات ۔
۲- متوسط - مطلع السعدین ، ہفت اقلیم ۔
۳- مصنوع - انوار سہیلی ، اخلاق جلالی ۔
۴- علمی - اختیارات ، دانشنامہ جہان ۔
۵- ادیبانہ - بہارستان ، تذکرۃ الشعراء ۔

دورۂ صفوی

۱- مصنوع - عالم آرای عباسی ، منشآت میرزا طاہر وحید ۔
۲- علمی - کلمات مکنونہ ، اسرار الحکم ۔
۳- سادہ - تحفۂ سامی و لطایف نامہ ۔

دورۂ قاجاری - بازگشت ادبی ۔

۱- سادہ ، رواں ، چھوٹے جملے ، واضح ، صریح ، سفرنامہ ناصر الدّین شاہ ۔
۲- عوامی زبان کا استعمال ، حاجی بابا اصفہانی ۔

۳- اخباری زبان کا رواج ۔
۴- درسی اسلوب - تفہیمی ، کتاب احمد ۔

اسلوب

موجودہ انتقادی ادب میں نظم و نثر کا اسلوب نگارش پرکھنے اور جانچنے کیلئے نئی روش اپنائی گئی ہے ۔ نثر یا شعر کا اسلوب دیکھنے کیلئے مندرجہ ذیل تین صفات کو مدّنظر رکھ کر رائے قائم کی جاتی ہے ۔

۱- صفات جذباتی ۔ ۲- صفات تخیلاتی ۔ ۳- صفات جمالیاتی ۔

۱- صفات جذباتی میں دیکھا جاتا ہے کہ مصنف کے بیان میں قوت اور توانائی ہے ، گرمی اور اخلاص ہے ، یا طرز تحریر پھیکا ، ناگوار اور سپاٹ ہے ۔ بقول اقبال : اس میں خون جگر کی آمیزش ہے ۔

۲- صفات تخیلاتی: میں غور کیا جاتا ہے کہ مصنف کا بیان واضح ہے ۔ یعنی اس کے تخیل میں پیچیدگی یا گنجلک تو نہیں ۔ جو کچھ اس کے ذہن میں ہے وضاحت سے بیان کررہاہے ۔ جو الفاظ استعمال کر رہا ہے ۔ ان میں صراحت ہے ۔ ابہام تو پیدا نہیں ہوتا . کیا اس کے خیالات دقیق اور مشکل ہیں ۔ قاری کے ذہن سے بالاتر تو نہیں ۔ مصنف کے تخیل میں کوتاہی ہے یا قاری اپنی کم علمی کی وجہ سے سمجھنے سے قاصر ہے ۔

۳- صفات جمالیاتی : مصنف عبارت آرائی کرتا ہے ۔ حسین الفاظ استعمال کرتاہے ۔ جن سے کلام میں موسیقیت پیدا ہوتی ہے ۔ کچھ مصوتوں اور صامتوں کی تکرار سے ترنم پیدا ہوتا ہے ۔ کبھی جملوں کے در و بست سے آہنگ یا توافق صدا پیدا ہوتاہے یعنی اوّل الذکر سے Melody اور مؤخر الذکر سے Harmony پیدا ہوتی ہے ۔ مقفی و مسجع عبارتیں بھی یہی کام دیتی ہیں مثلاً گلستان کی نثر ۔

بخش سیزدهم :
اصناف سخن کا ارتقاء

قصیده
معنی و مفهوم
قصیده ، قصّہ سے مشتق ہے ۔جس کے ایك معنی «اشعار و بیان را واضح کردن » ہیں (منتہی الارب) اسی طرح شعر قصیدہ کے معنی عمدہ و نفیس شعر ۔قصیدہ میں تائے تانیث واحد کیلئے آتی ہے . قصد کے ایك معنی شاعر کو صلہ دینا بھی ہے ۔ (منتخب اللّغات) ۔ چنانچہ قصیدہ میں اچھا اور پاکیزہ شعر کہنا اور صلہ دینا بھی شامل ہے.

ھیئت
قصیدہ غزل کی طرح ایك نظم ہے ۔ جس میں سولہ سے زیادہ اشعار ہوتے ہیں . پہلا شعر یعنی مطلع ہم قافیہ و ردیف ہوتا ہے ۔ باقی اشعار میں دوسرے مصرعے ہم قافیہ و ردیف ہوتے ہیں ۔ بحور کی کوئی قید نہیں ۔

موضوعات
قصیدہ ایك بڑی نظم ہے ۔ اس میں گوناگون موضوعات سما سکتے ہیں ۔ عموماً سلاطین ، امراء و بزرگان دین کے لئے مخصوص رہا ہے ۔ لیکن مدحیہ کے علاوہ تصوّف و عرفان، پند و نصایح ، مسائل معاشرت و سیاست اور وصفیہ عشقیہ ، بہاریہ اور خمریہ مضامین بھی آ جاتے ہیں ۔ اس لیے شاعر نظم جلیلہ کے لیے صلہ و انعام کی توقع رکھتا ہے ۔

اجزائے ترکیبی
قصیدہ کے اجزاء مندرجہ ذیل ہیں ۔

۱- تشبیب یا نسیب : تمہید یعنی قصیدہ کی ابتدا میں عشقیہ ، بہاریہ ، خمریہ مضامین لائے جاتے ہیں ۔

۲- گریز یا مخلص : تشبیب اور مدح کے درمیان منطقی رابطے کی کڑی ہے . شاعر ایسے خوبصورت طریق سے تشبیب سے مدح کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے کہ انداز شگفتہ ہوتا ہے ۔

۳- مدح : نظم کا یہ حصہ بنیادی ہوتا ہے ۔ یہاں شاعر ممدوح کے اوصاف بیان کرتا ہے .

۴- حسن طلب : شاعر اپنی حاجت بیان کرکے صلہ کی خواہش کرتا ہے ۔
۵- دعا : آخر میں شاعر ممدوح کی درازی عمر ، خوشحالی اور سلطنت کی آبادانی و پایداری کے لیے دعا کرتا ہے ۔

ارتقاء

صفاری دور میں محمّد بن وصیف سگزی کے ایک قصیدے کا سراغ ملا ہے جو اس نے ۲۵۳ ھ میں فتح قندھار پر یعقوب بن لیث کو مخاطب کرکے لکھا تھا :

ای امیری که امیران جهان خاص و عام

سامانی دَور

اس دور میں اپنے زمانے کے نامور شاعر ہونگے لیکن ان کا کلام محفوظ نہیں رہا ۔ دربار سے وابستگی کی وجہ سے انہوں نے ضرور مدحیہ قصاید لکھے ہونگے ۔ اس دور کا سب سے نامور شاعر رودکی ہے جسے آدم الشعرا کہا جاتا ہے ۔ اس کے قصاید کی تشابیب میں عشقیہ ، خمریہ اور بہاریہ مضامین ملتے ہیں ۔ مدح میں مبالغ نہیں آیا ۔ تشابیہ بھی سادہ اور زیادہ حسی ہیں. زبان بھی سادہ ہے اور صنایع لفظی و معنی کا استعمال بھی کم ہے ۔ حکیمانہ نصایح بھی شامل موضوع ہیں ۔

غزنوی دَور

اس دور میں قصیدہ سرائی کو عروج حاصل ہوا ۔ بادشاہ مربی شعراء فیاض تھے ۔ اور ملك الشعراء عنصری، فرخی ، منوچھری نامور قصیدہ سرا ہوئے ۔ عنصری علمی فضیلت ، پروانہ تخیل اور مضمون آفرینی اور تسلط زبان کی وجہ سے سرآمد روزگار تھا ۔

فرخی بیان کی سادگی ، خلوص اور بحور میں نغمگی کی وجہ سے مقبول تھا . شاعری کے متعلق اس کا نقطہ نظر یہ تھا ۔

با کاروانْ حله برفتم ز سیستان　　با حلّه ای شنیده ز دل یافته ز جان
هر تار او برنج برآورده از ضمیر　　هر پود او بجهد جدا کرده از روان

منوچھری ابتدا میں سبك عرب کا پیرو تھا۔ عربی کے تقبل الفاظ استعمال کرتا اور تلمیحات عرب لاتا لیکن بعد میں روش تبدیل کرلی ۔ اپنے علم و فضل اور اشعار میں غنائیت کیوجہ سے کافی شہرت پائی ۔

سلجوقی دَور

اس دور کے ابتدا میں غزنوی دور کا اسلوب جاری رہا ۔ قطران تبریزی، صابر ترمذی ، مختاری غزنوی وغیرہ نے غزنوی قصیدہ سرانوں کی تقلید کی ۔ آخری دور میں انوری ، معزی اور خاقانی جیسے شعرائے قصیدہ کو سبك خراسانی سے سبك عراقی میں منتقل

کر دیا اور قصاید کو شکوہ حاصل ہوا ۔ علوم و فنون کی اصطلاحات ، قرآن ، حدیث اور تاریخ کی تلمیحات ، صنایع لفظی و معنوں کی آرایشات اور اپنے علمی فضایل پر مباہات کا استعمال زیادہ ہوا ۔مدحیہ قصاید کے علاوہ دوسرے موضوعات کے قصاید نے بھی ادبی دنیا میں عالمگیر شہرت حاصل کی ۔ انوری کا «اشك ھای خراسان» اور «سوگند نامه »، خاقانی کا «مرآة الصفا » اور« ایوان مدائن» مشہور قصاید ہیں ۔

ایلخانی دَور

اس دور میں مدحیہ قصیدہ گم ہوگیا ۔ ایلخانی و تاتاری زبان و شعر سے نابد تھے ۔ اس لیے دربار کی سرپرستی نہ ہوئی تو قصیدہ سرائی بھی ختم ہو گئی ۔ اگر سعدی نے حکمران فارس کا قصیدہ لکھا ہے تو آدھے سے زیادہ قصیدے میں عدل و انصاف اور رعایا پروری کے نصایح ہیں ۔ عبید زاکانی نے قصاید سے طنز و تعریض اور ہجو و ہزل سے کام لیا ہے ۔

تیموری دَور

اس دور میں قصیدہ پھر زندہ ہوا ۔ لیکن متوسط درجے کے شعراء زیادہ ہوتے ۔ اس لیے کوئی قصیدہ گو شاعر کی حیثیت سے نامور نہیں ۔ دو بڑے شاعر حافظ اور جامی ہوئے ۔ انہوں نے قصاید بھی لکھے ہیں لیکن ان کا اصل مقام غزل میں ہے ۔ سلمان ساوجی بغداد میں بیٹھا قصیدہ لکھتا رہا اورعلم و فن میں کچھ نام پایا ۔

صفوی دَور

اس دور کے بادشاہ تشیع مذہب رکھتے تھے ۔انہوں نے اپنی مدح سرائی کی بجائے ائمہ اثنا عشری اور شہدائے کربلا کے مدایح و مناقب لکھنے پر توجہ کی ۔ اس لئے مرائی لکھنے کا رواج ہوا ۔ قصیدے کی ہیأت میں مراثی اور مناقب لکھے گئے ۔ محتشم کاشی اور حکیم شفائی کے مراثی مقبول ہوئے ۔

قاجاری دَور

چونکہ دَور سلاطین درباری کا عہد تھا ۔ اس لیے قصاید سرائی کو پھر تقویت ملی ۔ اور دوسرے اصناف سخن کے ساتھ دربار سے متعلق اور انعام کے خواھان شعرا قصاید بھی لکھتے رہے ۔

یہ دَور متقدمین کے قصیدے کی تقلید کا دَور کہا جا سکتا ہے ۔ بعض شعراء نے خاقانی جیسے پر تکلف و تصنع قصاید لکھے ۔ بعض نے فرخی اور منوچھری کی تقلید کی ، ایك گروہ نے رودکی اور قطران کے شیوۂ سخن کو پسند کیا ۔ ایك جماعت نے عنصری ، مسعود سعد، ابوالفرج رونی کی پیروی کی ۔

سحاب اصفہانی، مجمر اصفہانی ، وصال ، سر دستی، محمود خان ، ماہر قصیدہ گو شعراء تھے ۔ حبیب قاآنی نے قصیدہ میں زبان کی چمك دمك سے موسیقیت پیدا کرکے نام حاصل کیا ۔

عہد مشروطیت

اس دور میں دو نامور شعراء کا ذکر کافی ہے ۔ ادیب الممالك امیری (م - ۱۳۳۵ھ) ابتدائی دور میں سلاطین و امراء کے مدح سرا تھے ۔ بعد میں وطن پرستی اور آزادی طلبی کے احساسات کو عام کرنے کے لیے قصیدہ کو ہی کام میں لائے ۔ محمّد تقی بہار بھی ہیأت قصیدہ کو خوب کام میں لائے ۔ مدحیہ کے علاوہ وطنی اور اجتماعی مضامین کو بھی متانت اور صلابت کے ساتھ استعمال کیا ۔ قصیدہ «دماوندیه» ، اور «در وصف مازندران » ان کے بے نظیر قصاید ہیں ۔ پروین اعتصامی کے قصاید پند و موعظت بھی جو سعدی کے تتبع میں کئے گئے ہیں قابل ذکر ہیں ۔

دورۂ پہلوی

چھوٹے بڑے شاعروں نے رضا شاہ پہلوی کے بے شمار قصاید لکھے ہیں ۔ صادق سرمد اس دَور کے ملك الشعراء تھے ۔ مدحیہ قصاید کے علاوہ سیاسی ، اجتماعی اور بین الاقوامی موضوعات پر بھی زبان کی قدرت و طلاقت کے ساتھ قصیدہ کی ہیئت کو زندہ رکھا ہے ۔

دورۂ انقلاب اسلامی

اس زمانے میں بھی اس ہیئت کو استعمال کیا ہے ۔ لیکن مطالب و موضوعات و تعبیرات گوناگوں ہیں ۔ دیکھیے دورۂ انقلاب اسلامی ، عنوان شاعری .

غزل

لغت میں غزل کے معنی ہیں :

« حدیث زنان و حدیث عشق کردن و سخن که در وصف زنان و عشق زنان گفته آید ».

شمس قیس رازی نے المعجم فی معاییر اشعار العجم میں نئے معانی کا انکشاف کیا ہے ۔ اس کا بیان ہے ۔

« چون سگ در صید به آهو رسد و آهوك بیچاره گردد ، بانگ ضعیف بکند تا از ترس جان سگ را رقتی پیدا شود و از وی باز ایستد و به چیزی دیگر مشغول شود و همانا آهورا غزال ازین جا نام نهاده اند » ۔

اس طرح غزل کے معنی ہوئے دردناك فریاد ۔ عاشق غزل میں معشوق کے دل کو نرم

کرنے کے لئے اپنے دل کی فریاد اس تک پہنچاتا ہے ۔

عرب اپنے قصاید کی تمہید میں محبوب کو مخاطب کرکے حسن و عشق کی باتیں لکھتے تھے جسے تشبیب یا نسیب کہا جاتا ہے ۔ یہی روایت ایرانی شعراء میں منتقل ہوئی چنانچہ فارسی قصاید میں تشبیب لانے کا رواج ہوا اسے غزل بھی کہتے تھے ، چنانچہ رودکی کی تشبیب کو عنصری نے غزل ہی کہا ہے ۔

غزلهای رودکی نیکو بود غزلهای من رودکی وار نیست

غزل کی ہیئت

غزل کے پہلے شعر کو مطلع کہتے ہیں اور آخری شعر کو مقطع، جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے ۔ پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ و ردیف ہوتے ہیں اور باقی اشعار کے دوسرے مصرعے ہم قافیہ و ردیف ہوتے ہیں ۔ غزل میں اشعار کی تعداد پانچ سے پندرہ تک ہوتی ہے ۔

ابتدا

قدیم شعراء کے کلام کی عدم موجودگی میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کس دَور میں غزل کے مضامین کی ابتدا ہوئی ۔ ابو حفص سغدی سمرقندی کا ایک شعر ہے :

آهوی کوهی در دشت چگونه بوذا یار ندارد بی یار چگونه دوذا

اس سے ظاہر ہے کہ مضامین غزل قدرتی اظہار چاہتے تھے اور دوسرے شعراء کے کلام میں اسی قسم کے اشعار موجود ہوں گے ۔ صفاری عہد (۲۵۴-۲۹۰ ھ) میں فیروز مشرقی اور ابو سلیک گرگانی نے صفاری حکمرانوں کے قصاید لکھے ۔ ممکن ہے بعض میں تشبیب یا غزل لکھی ہو .

سامانی دور

سامانی دور میں رودکی نامور شاعر ہے جس کا ضخیم دیوان لیکن اب دستبرد زمانہ سے بہت کم اشعار باقی رہ گئے ہیں . بعض قصاید کے ابتدائیوں میں تشبیب /غزل کے آثار ملتے ہیں ۔ رودکی کی تشبیب میں غزل کی تمام خوبیاں موجود ہیں .وصف محبوب ، ہجر و فراق ، گلہ و شکوہ اس نے ایسے مضامین بڑے سلیقے سے بیان کیے ہیں ۔ اور ان میں جوش و جذبہ بھی موجود ہے ۔ مثلاً یہ اشعار :

ای مایهٔ خوبی و نیک نامی روزم ندهد بی تو روشنایی

ع - بتو باز گردد غم عاشقی نگارا

پیشم آمد بامدادان آن نگارین از کدوخ دو رخ از باده لعل و با دو چشم از سحر شوخ

غزنوی دَور

غزنوی دَور بھی قصیدہ سرائی کا دَور ہے ۔ اس میں بھی غزل تشبیب کی شکل میں موجود ہے ۔ عنصری ، منوچہری اور فرخی کے کلام میں تغزل کے مضامین موجود ہیں ۔ اس دَور میں سنائی ایک ایسا شاعر ہے جس نے غزل کو ایک علیحدہ صنف سخن کی حیثیت سے لکھا اور مرتب دیوان میں جگہ دی ۔ سنائی کا محبوب ترک و سپاہی زادہ ہے ۔ اس لیے اس کے اوصاف کیلئے جنگی آلات یا ابزار شکار سے تشبیہات لی گئی ہیں ۔ اس کی غزلوں میں شاید دو جگہ معشوق کی بجائے معشوقہ بھی آیا ہے وگرنہ دوسری غزلوں میں دلبر ، جانی ۔ یار ، پسرا اور دوست جیسے کلمات سے محبوب کو مخاطب کیاگیاہے ۔

سلجوقی دَور

سلجوقی دور میں عالی رتبہ قصیدہ سرا مثلاً انوری ، ظہیرفاریابی اور خاقانی کے مرتّبہ دواوین میں غزلیں موجود ہیں ۔ غزلیں روایتی مضامین لیے ہوئے ہیں ۔ زبان بھی سادہ و صریح ہوگئی ہے ۔ چھوٹی بحر میں بھی غزلیں ہیں اور عاشق کے ذہنی و قلبی احساسات کی آئینہ دار ہیں ۔

ایلخانی دَور

اس دور میں عطار، رومی اور سعدی جیسے برگزیدہ شعراء پیدا ہوئے ہیں جن کی برکت سے غزل کو کمال عروج حاصل ہوا ۔ سعدی کی غزل میں مسجع معنوں میں تغزل وارد ہوا ۔ اس نے عشقیہ حکایات و واردات کو سوز و گداز سے بیان کیا ہے ۔ غزل میں فقط سراپا ہی بیان نہیں کیا بلکہ غزل کی کسک اور فریاد بھی موجود ہے ۔

سرو سیمینا بہ صحرا می روی نیک بدعہدی کہ بی ما می روی
دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست تا نہ پنداری کہ تنہا می روی

تصوّف و عرفان کے مضامین آ جانے سے غزل دو آتشہ ہوگئی ۔ عشق حقیقی کو لوازم محبوب و اسباب می و جام کے ذریعے بیان کرنے سے تأثیر میں اضافہ ہوا ۔ عطار اپنی غزلوں میں عشق کی نوعیت ، کیفیت ، اور اس کے حصول کیلئے اصول و رموز بتاتا ہے ۔

مولانا روم کی غزلوی میں عاشق وارستہ ، صوفی مجذوب کا جوش اور مستی موجود ہے ۔ عشق و فلسفہ کا امتزاج اور اندرونی جذبہ کسی دوسرے کی غزل میں موجود نہیں ۔ اس کی غزلیات احساسات و جذبات کا ایک طوفان ہے ۔ جو امڈا چلا آتا ہے ۔ عراقی نے بھی وحدت الوجود کے مسائل کو مجازی رنگ میں پیش کیا اور سوز و مستی کے امتزاج سے غزل کو وجد و کیف آور بنا دیا ۔

تیموری دَور

اس دور میں بھی غزل کا ارتقاء جاری رہا ۔ خواجوی کرمانی اور سلمان ساوجی نے غزل کی روایت کو اور مستحکم کیا ۔ فکر و جذبہ کی آمیزش سے غزل کو اور ترقی ہوئی .ان دو شعراء کے تسلسل میں حافظ جیسا شیرین سخن پیدا ہوا جس کی وجہ سے غزل اپنے کمال عروج پر پہنچی ۔ حافظ نے عشق مجازی و عشق حقیقی کے موضوعات کو ایسی ہنرمندی اور سلیقے سے بیان کیا کہ عامی اور صوفی ان سے لطف اندوز ہوئے . حافظ مرصع کار ہے جو لفظوں کو اشعار میں نگینوں کی طرح جڑتا ہے ۔ آرایشات لفظی کے ساتھ ایك شعر میں جہان معنی سمونا حافظ جیسے قادر الکلام سے ہی ممکن ہے ۔ حافظ کا علم فن ، دل کا گداز ، جذبات کا ولولہ ، احساسات کا اخلاص وہ عناصر ہیں جو کلام کا جزو ہو کر منفرد بنا گئے ہیں ۔ حافظ کہتے ہیں ۔

ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ به قرآنی که اندر سینه داری

تیموری دور کا جامع الصفات شاعر جامی ہے .یہ سعدی، رومی اور حافظ کا تتمہ ہے ۔ اس کی غزلوں میں تصوف و عرفان ، الہیات ، عشق مجازی ، توحید و نعت رسول جیسے موضوعات شامل ہیں ۔ جامی نے اپنے کلام کی خود تعریف کی ہے :

جامی الفاظ دلآویز تو نیشی است نفیس پود آن حسن ادا ، لطف معانی تارش

صفوی دَور

صفوی تشیع مشرب رکھتے تھے ۔ منقبت ائمہ اور مراثی شہدائے کربلا کو پسند کرتے تھے . مدحیہ سرائی کو نا پسند اس لئے شعراء کی عدم سرپرستی کی وجہ سے اکثر نامور شعراء تیموریان ہند سے انعام و اکرام حاصل کرنے کے لیے برّصغیر چلے گئے اور نجی طور پر غزل کا رواج رہا ۔ وحشی ، شفائی غزل پر طبع آزمائی کرتے رہے اس دَور کا معروف غزلگو شاعر فغانی ہے جس نے تازہ گوئی یا مضمون آفرینی کی طرف قدم اٹھایا ۔ جو روش بعد میں ترقی پا کر سبك ہندی کا نام پا گئی ۔ فغانی نے وقوع گوئی اور واردات و معاملات کے بیان کرنے میں غزل کو ایك اور نہج بخشا ۔ وہ « سوز فغانی حزین » اور «آہ سوز ناك فغانی » کہہ کر اپنے دل کی کیفیت بیان کرتا ہے ۔ اس سے اس کے کلام میں تأثیر پیدا ہوئی ہے ۔ وہ کہتا ہے :

بلبلی ، صبح ، فغانی ، غزلی خواند غریب گریه آورد مگر نسخهٔ دیوان داشت
چه جان گداز فغانی فسانه ای داری بگو که سوخته حرف جانگداز توام

قاجاری دَور

اس دَور کو دورۂ بازگشت ادبی کہتے ہیں . تکلف و تصنع سے ہٹ کر پھر سبك خراسانی

کی سادگی کی طرف لوٹ آئے ۔ مضامین پرانے ہیں ۔ عشق و محبت کے علاوہ تصوف و عرفان کی جھلکیاں نظر آتی ہیں ۔ حافظ کی پیروی عام ہے ۔ کوئی شاعر ایسا نہیں جو صرف اپنی غزلیات کے لحاظ سے ممیز ہو ۔ قصیدہ سرائی زیادہ عام رہی ۔ اس دَور کے نامور شعراء میں عبدالوهاب نشاط ، محمّد شفیع وصال ، قائم مقام فراهانی، فروغی بسطامی ، ابو الحسن یغما اور قاآنی شہرت رکھتے ہیں ۔

دورۂ قاجار کے دوسرے حصے میں تجدد کا رجحان عام ہوا ۔ آزادی خواہی اور مشروطہ طلبی کیلئے جدوجہد ہوئی ۔ شعراء نے بھی روش بدلی ۔ ہیأت و موضوع میں بھی تبدیلی آئی ۔ لیکن کلاسیکی شعراء کے اتباع میں لکھنے والوں نے قصیدہ ، مثنوی اور غزل کو بھی قائم رکھا۔پرانے لکھنے والوں میں سے محمّد حسین صفای (م-۱۳۲۲ھ) حاجی محمّد تقی شوریدہ (م - ۱۳۴۵ ھ) ، ادیب نیشابوری (م - ۱۳۴۴ ھ)، نظام وفا (م - ۱۳۴۳ ھ) اور بعض دوسرے شعراء نے غزل کو جاری رکھا اور اپنے اپنے مزاج کے مطابق غزل میں رنگ بھرا ۔

پرانی طرز میں غزل لکھنے والوں میں سے بعض دورۂ پہلوی میں بھی زندہ رہے ۔ مثلاً : رهی معیری ، محمّد تقی بہار ، شہریار ۔

بہار نے غزل میں نئے موضوعات کو بھی داخل کیا اور سیاسی اصطلاحات کو بھی استعمال کیا ۔ شہریار نے جور و استبداد کے خلاف اور حق و انصاف قانونی عملداری اور انقلاب اسلامی کی حمایت کو بھی موضوع سخن بنایا ۔

دورۂ انقلاب اسلامی کیلئے دیکھیے عنوان « شاعری » ۔

مثنوی

مثنوی مثنی سے منسوب ہے جس کے معنی دو دو کے ہیں ۔ صفتِ نسبی بناتے وقت الف واؤ سے تبدیل ہوگیا ۔ اصطلاح میں وہ ابیات ہیں جن کا وزن متحد اور قوافی مختلف ہوں ۔ لیکن ہر بیت کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں ۔

مثنوی دیگر اصنافِ سخن کی نسبت زیادہ مفید اور همه گیر ہے ۔ اس میں جذبات انسانی ، مناظر قدرت اور واقعات کو آسانی سے بیان کیا جاسکتا ہے ۔ عموماً رزمیہ یا بزمیہ داستانیں بیان کی جاتی ہیں ۔ اس بنا پر اس میں تاریخی واقعات اور معاشرتی کوائف بیان کئے جاتے ہیں ۔ اخلاق و فلسفہ اور تصوف جیسے سنجیدہ مضامین بھی اس میں سما سکتے ہیں ۔ غرض رزمیہ داستانیں ہوں یا عشق و محبت کے طویل قصّے ہوں یا عرفان و اخلاق کے تمثیلی تذکرے ان سب کیلئے مثنوی ایک انتہائی موزوں اور مناسب صنفِ سخن ہے ۔

ایران میں سب سے قدیم رزمیہ تاریخی مثنوی مسعودی مروزی کا «شاهنامہ» ہے ۔ دورۂ حکومت سامانی میں ابو شکور بلخی نے چار مثنویاں لکھیں جن میں ایک « آفرین نامہ » ہے (۱) جو ۳۳۳ ھ کی تألیف ہے ۔ اسی دور میں دقیقی نے گرشاسپ اور ارجاسپ کی داستان منظوم کی تھی کہ موت نے آلیا . ۱۰۵۴ ابیات پر مشتمل یہ پسندیدہ کہانی اس قدر جاذب تھی کہ فردوسی نے اسے اپنے شاهنامہ میں شامل کر لیا ۔ سب سے نامور شاعر رودکی نے «کلیلہ و دمنہ» کو عربی سے فارسی مثنوی کے روپ میں منتقل کیا ۔ اس کے کچھ اشعار باقی رہ گئے ہیں ۔ اسی عہد میں ابو شکور بلخی نے سب سے پہلے «قصّہ یوسف و زلیخا » کو منظوم کیا .

غزنوی دَورمیں زیادہ تر قصیدہ سرائی کو رواج ہوا لیکن اسی دَور میں سب سے نامور رزمیہ مثنوی « شاهنامہ » تخلیق ہوئی ۔ جس کی شہرت اب تک عالمگیر ہے ۔ اور اس کے خالق فردوسی کا نام بھی زندہ ہے ۔ اسی زمانے میں عنصری کی لکھی ہوئی تین عشقیہ مثنویوں کےنام ملتے ہیں ۔ «سرخ بت و خنگ بت» ،« شاد بہر و عین الحیات» اور «وامق و عذرا » . مؤخر الذکر مثنوی کا ناقص دریافت شدہ نسخہ ڈاکٹر مولوی محمّد شفیع کے اہتمام سے پاکستان میں شایع ہوچکا ہے . «گرشاسپ نامہ» مصنفہ اسدی اسی دَور کی یادگار ہے ۔ «ورقہ و گلشاہ» کے نام سے ایک اور مثنوی دریافت ہوئی جس کے مصنف عیوقی ہیں (۲) شاهنامہ فردوسی کے اتباع میں مختاری غزنوی نے « شہریار نامہ» (شہریار پسر برزو پسر سہراب) لکھا ۔ اور خواجہ عمید بن یعقوب عطائی نے «بیژن نامہ» اور «برزو نامہ» دو مثنویاں لکھیں ۔ قدیم عشقیہ داستانوں میں ایک اور نام «ویس و رامین» قابل ذکر ہے ۔ جسے فخر الدّین اسعد گرگانی نے مثنوی کی صورت میں منظوم کیا ۔ دولت شاہ سمرقندی نے ایک مثنوی «قوسنامہ» قطران تبریزی(م. ۴۶۵) سے منسوب کی ہے . لیکن یہ صحیح نہیں ۔ قطران ترمذی کے نام سے ایک اور شاعر ہے ۔ جس نے یہ مثنوی محمّد بن ابوبکر بن قماج حاکم سنجر و بلخ کے نام منسوب کی .

سلجوقی عہد میں مثنوی کو موضوع کے اعتبار سے ایک اور رخ ملا یعنی اسے تصوّف و عرفان ، فلسفہ و حکمت ، پند و موعظت اور عقاید دینی کے اظہار کا ذریعہ بنایا گیا . اس سلسلے میں ناصر خسرو نے اسماعیلی عقاید کی تبلیغ کے لئے «روشنائی نامہ» اور«سعادت نامہ» کے نام سے مثنویاں لکھیں ۔ سب سے اہم مثنوی «حديقة الحقيقة»

۱- تاریخ نظم و نثر در ایران و در زبان فارسی ، سعید نفیسی ، تهران ، ۱۳۴۴ ، ص ۲۱.

۲-تاریخ ادبیات در ایران ، ذبیح اللّه صفا ، تهران ، ۱۳۴۱ ، ص ۴۰۱ و مجلّه دانشکدهٔ ادبیات ، شماره ۱۴ سال اول ، تهران ۱۳۳۴.

ہے . جس کے مصنف ابو المجد مجدود حسن سنائی ہیں ۔ یہ مثنوی تصوف و عرفان کے عقاید بیان کرنے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے ۔ سنائی کی دوسری مثنویاں «سیر العباد الی المعاد »، «کارنامه »، «عشق نامه » اور «عقل نامه » اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں ۔ سنائی نے حکایات اور تمثیلات کے ذریعے مطالب کو واضح کرنے کی رسم ڈالی جو کہ بعد کے دَور میں قابل تقلید نمونه ثابت ہوئی ۔

اس عہد کا اور بعد میں آنے والے زمانوں کا بے نظیر مثنوی نگار نظامی گنجوی ہے . جس نے پانچ مثنویوں کی صورت میں سرمایۂ حیات پیش کیا ۔ «مخزن الاسرار » ، «خسرو و شیریں » ،« لیلی مجنوں » ، «هفت پیکر » اور« سکندر نامه »، یہ مثنویاں اپنے مطالب ، ساخت اور اسلوب بیان کی وجہ سے اس قدر مقبول ہوئیں کہ آنے والے زمانے کے شعراء نے ان سے بہتر لکھنے کا چیلنج قبول کیا اور اس کی تقلید میں مثنویاں لکھیں .نامور شعراء میں سے جنھوں نے خمسۂ نظامی کا تتبع کیا امیر خسرو،خواجوی کرمانی ، عبداللہ ہاتفی اور عبدالرحمن جامی معروف ہیں ۔

مخزن الاسرار ، اخلاقیات ، پند و موعظت اور تصوف کے مضامین پر مشتمل ہے ۔ ایک اندازے کے مطابق ۶۵ سے زیادہ شعراء نے ایران اور برصغیر میں اس کے تتبع میں مثنویاں لکھیں ۔ اس عہد کی ایک اور قابل ذکر مثنوی خاقانی کی «تحفة العراقین » ہے جو اس کے سفر حجاز کی یادگار ہے ۔

دولتشاہ اور رضا قلی ہدایت نے لکھا ہے ۔ کہ عمعق بخاری (۴- ۵۴۳) نے «یوسف و زلیخا » لکھی تھی مگر اس کا کوئی وجود نہیں .

دولتشاہ نے ایک اور شاعر فصیحی جرجانی کا نام لیا ہے جس نے مثنوی وامق و عذرا لکھی ۔ یہ شاعر عنصر المعالی کیکاؤس کے دربار سے وابستہ تھا ۔ بہمن نامه ایک اور مثنوی ہے جو ایرانشاہ بن ابی الخیر نے لکھی اور محمود و احمد پسران ملکشاہ سلجوقی کے نام منسوب کی (۱).

ایلخانی دَور میں عرفانی مثنویوں کو کامل عروج حاصل ہوا . فرید الدّین عطار نے سنائی کی مثنویوں کے مدّنظر بہت سی مثنویاں لکھیں ۔ اس کی مثنوی «منطق الطیر » بہت مشہور ہے ۔ اس کے علاوہ «اسرار نامه » ، «الهی نامه » ، «مصیبت نامه » اور «اشتر نامه » وغیرہ معروف مثنویاں ہیں ۔ اس دَور کی سب سے طویل اور جامع مثنوی «مثنوی معنوی » مولانا روم ہے جو چھ جلدوں (دفتروں) پر مشتمل ہے ۔ اور جو اپنے مطالب مفاہیم ، حکایات و تمثیلات ، تشکیل و تکوین ، فکر و نظر ، حیات و ممات کے

۱- مجمل التواریخ و القصص - صص ۵۳- ۵۴ ۔

نظایر اور عشق و محبت کے اسرار و رموز کے لئے بے مثال مثنوی شمار ہوتی ہے ۔

مولانا روم کے فرزند سلطان ولد نے «ولد نامہ» کے عنوان سے مثنوی لکھی جس میں عرفانی دقایق بیان کیے ۔

اسی زمانے کی ایک اور مثنوی جسے اخلاق و تربیت ذہن و فکر کے سلسلے میں عالمگیر شہرت حاصل ہوئی وہ سعدی کی« بوستان» ہے ۔ عرفان و تصوف کے فلسفیانہ فکر پر محمود شبستری کی «گلشن راز» اور اوحدی مراغی کی «منطق العشاق» اور «جامِ جم» قابل ذکر ہیں ۔

خواجوی کرمانی نے بھی مندرجہ ذیل پانچ مثنویاں لکھیں جن کے عنوانات اس طرح ہیں : ھما و ھمایون ، گل‌ونوروز ، روضۃ الانوار ، کمال نامہ اور گوھر نامہ ۔

تیموری دَور میں بھی بے شمار مثنویاں لکھی گئیں ، لیکن چند ایک کو ہی شہرت نصیب ہوئی . سب سے نامور شاعر عبدالرّحمن جامی ہوئے جن کی سات مثنویاں «ھفت اورنگ» کے نام سے معروف ہیں ۔ پانچ تو خمسۂ نظامی کے جواب میں ہیں ۔ ان میں سے «تحفۃ الاحرار» اور «یوسف زلیخا » کو بہت شہرت حاصل ہوئی . باقی مثنویوں کے نام یہ ہیں ۔ «سبحۃ الابرار» ،« لیلی مجنون» ، « سلامان و ابسال» اور«سلسلۃ الذھب» ۔ اسی زمانے میں عبداللّٰہ ھاتفی اور مکتبی شیرازی نے بھی نظامی گنجوی کے تتبع میں مثنویاں لکھیں ۔

صفوی دَور میں مثنوی نگاروں کے نام سربرآوردہ ہیں ۔ مثلاً: ہلالی چغتائی ، اہلی شیرازی ، زلالی خوانساری ۔ زلالی خوانساری کی سات مثنویاں «سبعہ سیارہ » کےنام سے معروف ہیں.اور شعری محاسن کی وجہ سے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں ۔ مثنوی نگاروں اور ان کی مثنویوں کے نام حسبِ ذیل ہیں :

ہلالی چغتائی : شاہ و درویش ، صفات العاشقین ۔

اہلی شیرازی : سحر حلال ، شمع و پروانہ ۔

زلالی خوانساری : محمود و ایاز ، شعلۂ دیدار ، آذر و سمندر ، حسن گلو سوز ، ذرہ و خورشید، میخانہ ، سلیمان خانہ ۔

خاندان قاجار کے دَور حکومت میں نامور شعراء نے مثنوی پر قلم اٹھایا ہے اور رزمیہ ، بزمیہ اور اخلاقی مثنویوں میں کمال ہنر دکھایا ہے ۔ لیکن آج ان کا قاری نہیں ملتا۔ ان شعراء کے نام اور ان کی مثنویاں حسب ذیل ہیں ۔

فتح علی خان صبا : شاھنشاہ نامہ ، خداوند نامہ ، عبرتنامہ ، گلشن صبا ۔

وصال شیرازی = بزم وصال ، فرھاد و شیریں ۔

سروش اصفہانی = ساقی نامہ ، الہی نامہ ۔

دورہ مشروطیت

قاجاری خاندان کے دوسرے دَور میں بھی مثنوی کا رواج رہا ۔ لیکن روایتی مثنویوں سے الگ موضوعی مثنویاں لکھی گئیں اور زبان و بیان اور اخلاص کے اعتبار سے بہت مؤثر رہیں . مثلاً :

ایرج میرزا = عارف نامہ ، زهره و منوچهر .
وحید دستگردی = سرگذشت اردشیر .
بہار = چهار خطابه .

پروین اعتصامی کی چھوٹی چھوٹی مثنویاں خواتین اور یتیم بچوں سے متعلق درد بھرے جذبات کی عکاسی کرتی ہیں ۔

رباعی

رباعی کی تعریف

فارسی اصناف سخن میں رباعی چار مصرعوں کی مختصر نظم ہوتی ہے ۔ بڑے بڑے فلسفیانہ مسائل ، دقیق سے دقیق اخلاقی نکات اور پیچیدہ سے پیچیدہ مطالب جو صفحات میں نہیں سماتے ۔ دو سطروں میں بیان ہو جاتے ہیں ۔

رباعی عربی زبان کا لفظ ہے ۔ جس کے معنی « چار دانے » کے ہیں عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے چونکہ یہ چار مصرعوں سے مرکب ہوتی ہے اس لئے اس کو رباعی کہتے ہیں ۔ چنانچہ دولتشاہ نے « تذکرة الشعراء » میں یہی وجہ بیان کی ہے ۔

« تا فضلاء لفظ دو بیتی را نکو ندیدند ، گفتند که این چهار مصرع است ، رباعی می شاید گفتن»

لیکن «محمّد بن قیس رازی » نے جس کی تألیف و تصنیف کا عہد ۶۱۴ ھ سے ۶۳۵ ھ تک ہے ۔ اپنی مشہور تصنیف « المعجم فی معاییر اشعار العجم » میں کہتے ہیں :

« اهل عرب آن را رباعی خوانند از بهر آنك بحر هزج در اشعار عرب
مربع الاجزاء آمده است ۔ بس هر بیت از این وزن دو بیت عربی باشد »

رباعی کو ترانہ یا دو بیتی بھی کہا جاتا تھا ترانہ اس لئے کہ ساز کے ساتھ گائی جاتی ہے ۔

رباعی کے اوزان

بحر ہزج کے بارہ اخرم اور بارہ احزب اوزان جن کی میزان چوبیس ہوتی ہے ۔ اوزان رباعی کہلاتے ہیں ۔ رباعی کا اطلاق انہی اوزان پر محدود ہے کیونکہ ادبی اورعروضی نقطہ نظر سے بلکہ رواجاً بھی رباعی وہی ہے جو بحر ہزج کے اخرب و اخرم شجروں کے چوبیس اوزان مقررہ میں سے ہو ۔ خواہ چاروں مصرعوں کا وزن ایك ہو اور خواہ چاروں کا مختلف مگر انہی چوبیس اوزان میں سے ہو نیز ان چاروں مصرعوں میں سے تین ہم قافیہ بھی ہوں اگر تیسرا بھی ہم قافیہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں بلکہ چوتھے مصراع میں قافیہ ہونا اچھا سمجھا جاتاہے ۔ لیکن اگر کوئی چار مصرع ان چوبیس اوزان کےعلاوہ کسی اور وزن پر ہوں اور ان میں سے تین یا چاروں کے چار مصرعے ہم قافیہ ہوں ۔ انہیں رباعی کہنا درست نہیں لیکن عہد حاضر کے بعض شعراء اس پابندی کے قائل نہیں ۔

اخرب = م اور ن کو گرانا - مفاعیلن سے فاعیل

اخرم = م گرانا - مفاعیلن سے فاعیلن

رباعی کی خصوصیات

شعر انسانی احساسات اور قلبی کیفیات کے موزوں اظہار کا نام ہے ۔ اور اس کی موزونیت ہی اس کے مؤثر ہونے کی ضامن ہے ۔ شدت جذبات میں جب دل کی آواز تخاطب کی خاطر الفاظ کی شکل اختیار کرتی ہے ۔ تو قدرت کی تناسب گزینی یا حسن پروری اس کو ایسی موزونیت بخشتی ہے جو شعر یا نظم کا نام پاتی ہے ۔ اصناف سخن میں ایسی موزونیت پیدا کرنا قدرے مشکل ہے ۔ خاص طور پر رباعی میں کہنا اور بھی مشکل کام ہے ۔ اس لئے کہ بظاہر تو دو شعر ہوتے ہیں ۔ لیکن ان کو خوبصورت اور پر اثر بنانے کیلئے ایك جہان معنی آباد کرنے کی ضرورت ہے ۔ وہاں کسی عمیق خیال کو جب تك بلاغت کے ساتھ گہرے شدید یا لطیف جذبے کو ایجاز و اختصار سے پیش نہ کیا جائے تو بات نہیں بنتی ۔

شعر کہنا تو شاعر کیلئے مشکل نہیں لیکن ایسے اشعار جو سچے جذبے کے حامل ہوں ۔ اُن کو پُر اثر انداز میں بیان کرنا مشکل ہے ۔ رباعی چار مصرعوں سے تجاوز نہیں کرتی ۔ اس لئے ضروری ہے کہ رباعی اس طرح ختم ہو کہ ذہن پر دیرپا اثر چھوڑے ۔ رباعی کا اصل مفہوم دوسرے شعر یا چوتھے مصرعے میں بیان ہوتا ہے ۔

رباعی کے موضوعات

رباعی میں جہاں تك موضوع کا تعلق ہے ۔ اس میں بہت وسعت ہے ۔ ہر خیال اورجذبے کو رباعی میں پیش کیا جاسکتا ہے :مثلاً عشق و محبت ، فلسفہ ، تصوف و عرفان اور

ہنگامی تاثرات ۔ رباعی کی نشو و نما ہمیں بتاتی ہے کہ شعراء نے اسے مختلف خیالات اورجذبات کیلئے استعمال کیا ۔ رباعی کو نہ صرف فکر اور جذبے کے اظہار کیلئے استعمال کیا گیا بلکہ فی البدیہہ رباعی کہنے کا بھی رواج رہا ہے ۔

رباعی کا آغاز و ارتقاء

بعض اہل ادب اور اہل تذکرہ کے نزدیك رباعی کسی شخص کی ایجاد کا نتیجہ نہیں بلکہ وہ ارتقاء یافتہ شکل ہے ۔ لیکن جن کا خیال ہے کہ رباعی اتفاقیہ ایجاد کا نتیجہ ہے . اس کے متعلق ایك قصہ بیان کرتے ہیں ۔ کہ سجستان کے کسی شہر میں چند لڑکے گولی کھیل رہے تھے ۔ ایك گولی لڑھکتی ہوئی سوراخ کے پاس آئی ۔ اس پر خوشی کے عالم میں ایك لڑکے کے منہ سے بیساختہ نکلا ۔

« غلطاں غلطاں همی رود تا بن گو »

رباعی کا آغاز جدید تحقیق کے مطابق سامانی دور سے شروع ہوتا ہے ۔ سب سے پہلے رباعی گو شاعر ابو شکور بلخی شمار ہوتے ہے ۔

سامانی دَور میں پہلا رباعی گو شاعر رودکی ہے ۔ عوفی نے اس کی رباعیات کی تعداد چھ بتائی ہے ۔ رودکی کے مطبوعہ دیوان میں رباعیات کے تحت دو دو شعر کے بیس منظومات ہیں ۔ جن میں عشقیہ ، حکیمانہ ، اخلاقی اور خمریہ مضامین ہیں ۔ مگر وزن و قافیہ کے اعتبار سے ان میں صرف دو منظومات ایسے ہیں جو رباعی ہیں بقیہ قطعے ہیں ۔

رودکی کے علاوہ سامانی دور میں کچھ اور شعراء کے ہاں ایك آدھ رباعی ملتی ہے ۔ مثلاً لباب الالباب مین عوفی نے عمارہ مروزی کی ایك رباعی نمونہ کے طور پر دی ہے ۔ اسی طرح ابو شکور بلخی کی رباعی کا واحد نمونہ بھی مذکور ہے ۔

غزنوی دور میں رباعی کی خاص ترقی نہیں ہوئی ۔ لیکن پھر بھی مجمع الفصحاء کے مصنف رضا قلی ھدایت نے عنصری کی بیس اور عسجدی کی دس رباعیات درج کی ہیں ۔

سلجوقی دَور

غزنوی دَور سے ذرا آگے بڑہیں تو اس دَورمیں پہنچتے ہیں جو رباعی کے شباب کا زمانہ ہے ۔ یہ پانچویں صدی کا زمانہ ہے ۔ سلجوقی دور میں عمر خیام ، شیخ عبداللہ انصاری ، بابا طاھر عریاں ، شیخ ابو سعید ابوالخیر اور شیخ عطار جسے رباعی گو پیدا ہوئے انہوں نے رباعی کو مستقل صنف کی شکل دی ۔ پہلے شعراء نے تفنن طبع کیلئے رباعی کو اختیار کیا ۔ اس دَور میں رباعی مقبول ہوئی ۔ ان شعراء نے رباعی میں زندگی کے

واقعات کو پیش کیا ۔ اور اس صنف کو دوسری اصناف کے ساتھ پیش کیا ۔

تصوّف و عرفان اس دور کے رباعی گو شعراء کا خاص موضوع رہا ۔ شیخ ابو سعید ابوالخیر نے جذب و شوق سے عشق و معرفت کے مضامین کو بیان کیا ہے ۔

جنون تو کوه را ز صحرا نشناخت دیوانۂ عشق تـو سر از پا نشناخت
هر کس به تو ره یافت ز خود گم گردید آن کس که ترا نشناخت خود را نشناخت

بابا طاہر نے رباعی کیلئے اپنی مقامی زبان لُری کا انتخاب کیا تا کہ ان کے جذبات و افکار دوسروں تک پہنچ سکیں ۔ لیکن بابا نے بحر ہزج کے قیود کی پروا نہیں کی. مثلاً :

مو آن رندم کے نامم بی قلندر نه خون دیرم نه مون دیرم نه لنگر
چو روز آید بگردم گرد گیتی چو شو گردد به خشتی وا نهم سر

شیخ عبداللہ انصاری نے حرف مجاز کو حقائق کیلئے استعمال کیا ۔ ان کے علاوہ اسی دور کے مشہور مفکر امام محمّد غزالی نے بھی رباعیات کہی ہیں ۔ دوسرے شعراء میں عنصر المعالی کیکاؤس صاحب « قابوس نامه » بھی رباعیات کہتے تھے ۔ رباعیات میں اپنے بیٹے کو زندگی کے نشیب و فراز سمجھائے ہیں.سلجوقی دور پانچویں اور چھٹی صدی ہجری پر محیط ہے ۔ اسی صدی میں بہت مشہور رباعی گو شاعر ہوئے ۔ رباعی گو کی حیثیت سے جس نے سب سے بڑا نام پایا وہ عمر خیام ہے ۔ جس کے فلسفیانہ اور خمریہ مضامین کا بڑا چرچا ہوا ۔ وہ آغاز و انجام کائنات سے بے خبری ، ناپائیداری دنیا اور زندگی کا عبرتناک انجام یاد دلا کر عیش و نشاط کی دعوت دیتا ہے ۔ وہ اپنے حسن اسلوب کی وجہ سے بھی بہت مقبول ہوا ۔ اس کی ایک رباعی درج ذیل ہے :

برخیز بتا بیا و بهر دل ما حل کن به جمال خویش مشکل ما
یك کوزه شراب تا بهم نوش کنیم زان پیش که کوزه ها کنند از گلِ ما

تصوّف و عرفان میں شیخ عطار کی رباعیاں بعد میں آنے والوں کیلئے قابلِ تقلید ہوئیں .عطار نے « مختار نامه » کے عنوان سے پانچ ہزار رباعیات کا مجموعہ مرتب کیا .

ایلخانی دَور

اس دَور میں ہم مولانا روم کے دیوان میں سولہ سو رباعیات دیکھتے ہیں . اس دَور میں مجدد الدّین(رومی اور سعدی کے معاصر) کی رباعیات میں انتہا درجے کی عریانی ہے۔

تصوف و عرفان اور فلسفه و حکمت کے موضوعات پر اسی دور میں بابا افضل کاشانی (م . ۶۶۷ھ) کا نام قابل ذکر ہے ۔ اپنے علم کے متعلق ان کی یہ رباعی بہت مشہور ہے :

هرگز دلِ من ز علم محروم نشد کم بود ز اسرار که مفهوم نشد

هفتاد و دو سال فکر کردم شب و روز معلوم نشد که هیچ معلوم نشد

تیموری دَور

تیموری دَور کے دو نامور شعراء حافظ اور جامی ہیں ۔ انہوں نے بھی رباعیات لکھی ہیں ۔ موضوعات میں فقہ و تصوف و عشق نمایاں ہیں ۔

صفوی دَور

فارسی میں کوئی ایسا شاعر نہیں جس نے رباعی نہ کہی ہو ۔ اگر طبع رواں ہو تو شاعر کیلئے رباعی کہنا مشکل نہیں ۔ اس دَورمیں سحابی استرآبادی نے سولہ ہزار رباعیات کہی ہیں ۔ سحابی کی رباعیات کے اکثر موضوعات پیری ، حیات و ممات ، سخن و خاموشی ، توحید و رحمت الٰہی ، جبر و اختیار و توبہ ہیں ، سحابی کے بعد کوئی رباعی گو شعراء اس کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکا ۔

قاجاری دَور

قاجاری عہد میں بھی شعراء نے رباعیات پر طبع آزمائی کی ہے ۔ ان کی کلیات میں رباعیات بھی درج ہیں ۔ مثلاً یغما ، نشاط ، قاآنی کے دیوانوں میں رباعیات موجود ہیں اور موضوعات میں تنوعِ موجود ہے ۔

دورۂ مشروطیت

اس دور میں اکثر موضوعاتی نظمیں لکھنے کا رواج ہوا ۔ شعر کے نئے نئے پیمانے اپنائے گئے ۔ قصیدہ ، مثنوی اور غزل کا بھی چلن رہا ۔ رباعی کی طرف کم توجہ رہی۔ کہیں کہیں خاص مواقع پر رباعیاں بھی کہی گئیں ۔ عارف اور فرخی نے بھی رباعیاں کہی ہیں ۔ کرنل محمّد تقی کے قتل پر عارف نے رباعی کہی جو شہید کے ماتھے پر باندھی گئی ۔

این سر که نشان سرپرستی است آزاد و رها ز قید هستی است
با دیدۂ عبرتش به بینید که این عاقبت وطن پرستی است

پہلوی دَور

دورۂ پہلوی میں دو نام ملتے ہیں جنہوں نے اظہار مطالب کیلئے رباعیات کہی ہیں ۔ سیاؤش کسرائی ، ملک الشعراء صادق سرمد(دو بیتیاں) اور :

دورۂ انقلاب اسلامی

رباعی لکھنے والوں میں سے دو نام سربرآوردہ ہیں :

محمّد حسن حجتی اور الف قیام۔

ان کی رباعیات کے موضوعات زمانے کے نئے رجحانات اور نئے تحولات کے مطابق ہیں۔

اشاریه

۱- اشخاص
۲- کتب و رسایل و اخبارات

مرتبه : انجم حمید

اشخاص

پ

ش

ف

ق

ك

گ

کتب و رسایل و اخبارات

ز

ص

ض

ط

ع

Nectre of Grace 65

فهرست انتشارات مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان

شماره ردیف	نام کتاب	مولف، مصحح ،مترجم شاعر	تاریخ چاپ	زبان
۱	فهرست نسخه های خطی کتابخانهٔ گنج بخش (ج ۱)	دکتر محمد حسین تسبیحی	۱۳۵۰هـ ش	فارسی
۲	احوال و آثار شیخ بهاء الدین زکریاملتانی و خلاصة العارفین	دکتر شمیم محمود زیدی	۱۳۵۳ هـ ش	فارسی
۳	فهرست نسخه های خطی خواجه سناء الله خراباتی	دکتر محمد حسین تسبیحی	۱۳۵۱هـ ش	فارسی
۴	چهار تقویم از دو سال و در یک شهر	دکتر علی اکبر جعفری	۱۳۵۱هـ ش	فارسی
۵	مثنوی مهر و ماه	جمالی دهلوی / پیر حسام الدین راشدی	۱۳۵۳هـ ش	فارسی
۶	شش جهت	روپ نراین/ دکتر علی اکبر جعفری	۱۳۵۲هـ ش	فارسی
۷	داد سخن	سراج الدین علی آرزو/ دکتر اکرم شاه	۱۳۵۲هـ ش	فارسی
۸	فارسی گویان پاکستان (از گرامی تا عرفانی(ج ۱)	دکتر سبط حسن رضوی	۱۳۵۳ هـ ش	فارسی
۹	تحقیقات فارسی در پاکستان	دکتر علی اکبر جعفری	۱۳۵۲ هـ ش	فارسی
۱۰	تاریخ روابط پزشکی ایران و پاکستان	حکیم نیر واسطی	۱۳۵۳ هـ ش	فارسی
۱۱	فهرست نسخه های خطی کتابخانهٔ گنج بخش (ج ۲)	دکتر محمد حسین تسبیحی	۱۳۵۳ هـ ش	فارسی
۱۲	شعر فارسی در بلوچستان	دکتر انعام الحق کوثر	۱۳۵۳ هـ ش	فارسی
۱۳	راج ترنگینی (تاریخ کشمیر)	دکتر صابرآفاقی	۱۳۵۳ هـ ش	فارسی
۱۴	رسالهٔ قدسیه	خواجه محمد پارسابخاری/ ملک محمد اقبال	۱۳۵۴ هـ ش	فارسی
۱۵	جواهر الاولیاء(مقدمه)	دکتر غلام سرور	۱۳۵۵ هـ ش	فارسی
۱۶	جواهر الاولیاء(متن)	باقر بن عثمان بخاری / دکتر غلام سرور	۱۳۵۵ هـ ش	فارسی
۱۷	پیوندهای فرهنگی (مجموعه ۲۶ مقاله)	بشیر احمد دار		ف.ا.ا

شماره ردیف	نام کتاب	مولف، مصحح ،مترجم شاعر	تاریخ چاپ	زبان
۱۸	تذکرهٔ ریاض العارفین (جلد اول)	آفتاب رای لکهنوی / پیر حسام الدین راشدی	۱۳۵۵هـ ش	فارسی
۱۹	گرایش های تاره درزبان فارسی	دکتر عبد الشکور احسن	۱۳۵۵هـ ش	ف.انگ
۲۰	فهرست نسخه های خطی کتابخانهٔ گنج بخش(ج۳)	دکتر محمد حسین تسبیحی	۱۳۹۶هـ ش	فارسی
۲۱	قران السعدین(چاپ عکسی)	امیر خسرو دهلوی / دکتر احمد حسن دانی	۱۳۵۵هـ ش	فارسی
۲۲	کلیات فارسی شبلی نعمانی	دکتر محمد ریاض خان	۱۳۵۶هـ ش	فارسی
۲۳	کتابخانه های پاکستان (جلد اول)	دکتر محمد حسین تسبیحی	۱۳۵۵هـ ش	فارسی
۲۴	احوال و آثار میرزا اسد الله خان غالب	محمد علی فرجاد	۱۳۵۶هـ ش	فارسی
۲۵	اقبال لاهوری و دیگر شعرای فارسی گوی	دکتر محمد ریاض خان	۱۳۵۶هـ ش	فارسی
۲۶	کارنامه و سراج منیر	منیرلاهوری،آرزو/ دکتر اکرم شاه	۱۳۵۶هـ ش	فارسی
۲۷	کشف الابیات اقبال	دکتر محمد ریاض خان	۱۳۵۶هـ ش	فارسی
۲۸	گلدستهٔ قلات(اشعار) دیوان شعر	میر محمد حسن خان بنگلزئی		فارسی
۲۹	کشف المحجوب(چاپ عکسی)	علی هجویری جلابی/ علی قویم	۱۳۵۶هـ ش	فارسی
۳۰	الاوراد(عربی و فارسی)	بهاء الدین زکریا ملتانی	۱۳۵۶هـ ش	ف.عر
۳۱	کلیات میرزا عبد القادر بیدل (چاپ عکسی)	میرزا عبد القادر بیدل دکتر غروی	۱۳۵۶هـ ش	فارسی
۳۲	سیر الاولیاء(احوال و ملفوظات چشتیه	محمد بن مبارک علوی کرمانی	۱۳۵۶هـ ش	فارسی
۳۳	گلشن راز(منثوی عرفانی) انگلیسی و فارسی	شیخ محمود شبستری / وینفلد	۱۳۵۶هـ ش	ف.انگ
۳۴	رسالهٔ ابدالیه (اردو و فارسی)	یعقوب بن عثمان چرخی / محمد نذیر رانجها	۱۳۹۸هـ ش	ف.ار
۳۵	مثنوی مولوی(دفتر اول) (فارسی و اردو)	مولوی جلال الدین بلخی/ سجاد حسین	۱۳۵۷هـ ش	ف.ار
۳۶	مثنوی مولوی(دفتر دوم) (فارسی و اردو)	مولوی جلال الدین بلخی/ سجاد حسین	۱۳۵۷هـ ش	ف.ار

شماره ردیف	نام کتاب	مولف، مصحح ،مترجم شاعر	تاریخ چاپ	زبان
۳۷	مثنوی مولوی(دفتر سوم) (فارسی و اردو)	مولوی جلال الدین بلخی/ سجاد حسین	۱۳۵۷هـ ش	ف.ار
۳۸	مثنوی مولوی(دفتر چهارم) (فارسی و اردو)	مولوی جلال الدین بلخی/ سجاد حسین	۱۳۵۷هـ ش	ف.ار
۳۹	مثنوی مولوی(دفتر پنجم) (فارسی و اردو)	مولوی جلال الدین بلخی/ سجاد حسین	۱۳۵۷هـ ش	ف.ار
۴۰	مثنوی خموش خاتون(داستان منظوم)	دکتر سید مهدی غروی	۱۳۵۸هـ ش	فارسی
۴۱	تذکرهٔ ریاض العارفین(ج ۲)	آفتاب رای لکهنوی / پیر حسام الدین راشدی	۱۳۵۵هـ ش	فارسی
۴۲	فهرست نسخه های خطی کتابخانه گنج بخش (ج ۱)	احمد منزوی	۱۹۸۰م	فارسی
۴۳	اسلامی جمهوری ایران کا آئین(اردو)	محسن علی نجفی	۱۹۸۰م	اردو
۴۴	بیسوین صدی کی اسلامی تحریکین(اردو)	مرتضی مطهری(شهید) دکتر ناصر حسین نقوی	۱۹۸۰م	اردو
۴۵	نخستین کارنامه	دکتر مهدی غروی	۱۳۵۷هـ ش	فارسی
۴۶	لوایح جامی(عرفان و تصوف)	نور الدین عبد الرحمن جامی	۱۹۷۲م	فارسی
۴۷	فهرست نسخه های خطی کتابخانهٔ گنج بخش (ج ۲)	احمد منزوی	۱۳۵۷هـ ش	فارسی
۴۸	فهرست نسخه های خطی کتابخانهٔ گنج بخش (ج ۳)	احمد منزوی	۱۹۸۰م	فارسی
۴۹	علامه اقبال(احوال و آثار)	سید مرتضی موسوی / احمد ندیم قاسمی	۱۹۷۷م	ف.ار
۵۰	علامه اقبال، اسلامی فکر کی عظیم معمار(اردو)	دکتر علی شریعتی / دکتر محمد ریاض خان	۱۹۸۲م	اردو
۵۱	میاسه و مقداد (فارسی،داستان)	معز الدین محمد حسین بهاء الدین وکیلی	۱۳۶۴هـ ش	فارسی
۵۲	دیوان حافظ شیرازی (فارسی و اردو)	حافظ شیرازی / عباد الله اختر	۱۳۹۹هـ ش	فارسی
۵۳	انقلاب ایران (سندی)	محمد عثمان دیپلائی	۱۹۸۱م	سندی
۵۴				

شماره ردیف	نام کتاب	مولف، مصحح ،مترجم شاعر	تاریخ چاپ	زبان
۵۵				
۵۶				
۵۷	مثنوی مولوی (دفتر ششم) (اردو و فارسی)	جلال الدین محمد بلخی سجاد حسین	۱۳۵۸هـ‌ش	فارسی
۵۸				
۵۹				
۶۰				
۶۱	ایران اور مصر مین کتب سوزی (مسلمانون پر عائد الزامکا تاریخی تجزیه	مرتضی مطهری (شهید)/ عارف نوشاهی (مترجم)	۱۴۰۱هـ‌ق	اردو
۶۲	فهرست نسخه های خطی کتابخانهٔ گنج بخش (ج ۴)	احمد منزوی	۱۴۰۲هـ‌ق	فارسی
۶۳	دو اثر در علوم قرآنی (المستخلص)	حافظ الدین محمد بخاری	۱۳۶۱هـ‌ش	فارسی
۶۴				
۶۵	اخلاق عالم آرا(اخلاق محسنی)	محسن فانی کشمیری/ خ.جاویدی	۱۳۶۱هـ‌ش	فارسی
۶۶	جامی(احوال و آثار جامی) (اردو)	علی اصغر حکمت / عارف نوشاهی	۱۹۸۳هـ‌ش	اردو
۶۷	کلمات الصادقین (تذکرهٔ صوفیان دهلی)	محمد صادق دهلوی / محمد سلیم اختر	۱۴۰۲هـ‌ق	ف.انگ
۶۸	فهرست مشترک نسخه های خطی فارسی پاکستان (ج ۱)	احمد منزوی	۱۹۸۲م	فارسی
۶۹	رسالهٔ انسیه (فارسی و اردو)	یعقوب بن عثمان چرخی / محمد نذیر رانجها	۱۳۶۲هـ‌ش	فارسی
۷۰	بررسی لغات اروپایی در فارسی	دکتر مهر نور محمد خان	۱۳۶۲هـ‌ش	ف.انگ
۷۱	فهرست نسخه های خطی فارسی موزهٔ ملی پاکستان	سید عارف نوشاهی	۱۳۶۲هـ‌ش	فارسی
۷۲	به یاد شرافت نوشاهی	سید عارف نوشاهی	۱۳۶۲هـ‌ش	فارسی
۷۳	فهرست نسخه های خطی فارسی انجمن ترقی اردو(کراچی)	سید عارف نوشاهی	۱۳۶۳هـ‌ش	فارسی
۷۴	تذکرهٔ علمای امامیه پاکستان	سیدحسین عارف نقوی	۱۳۶۳هـ‌ش	اردو

شماره ردیف	نام کتاب	مولف، مصحح ،مترجم شاعر	تاریخ چاپ	زبان
۷۵	سه رساله شیخ اشراق (فارسی و عربی)	شهاب الدین یحیی سهروردی	۱۳۶۳هـ‍ش	ف.عر
۷۶	گلستان سعدی (انگلیسی و فارسی)	میجر آر پی آنڈرسون (مترجم)	۱۳۶۳هـ‍ش	ف.انگ
۷۷	خزاین الاسرار(اردو) به ضمیمهٔ چهار بهار	محمد هاشم تهرپالوی / شرافت نوشاهی	۱۳۶۳هـ‍ش	اردو
۷۸	دیوان حافظ شیرازی (فارسی و اردو)(چاپ عکسی)	حافظ شیرازی / سجاد حسین (قاضی)	۱۳۶۳هـ‍ش	ف.ار
۷۹	صیدیه و بخش صید وذباحه واطعمه و اشربه ...	سعد الدین هروی‌محقق حلی / محمد سرفراز ظفر	۱۳۶۳هـ‍ش	فارسی
۸۰	جهاد نامه (مولف ناشناخته) ظلم نامه	غزالی (امام محمد) / عارف نوشاهی	۱۳۶۳هـ‍ش	فارسی
۸۱	منشور فریدون بیگ گرجی	دکتر سید مهدی غروی	۱۳۶۳هـ‍ش	فارسی
۸۲	لمحات من نفحات القدس	محمد عالم صدیقی/ رانجها	۱۳۶۵هـ‍ش	فارسی
۸۳	فهرست مشترک نسخه های خطی فارسی پاکستان (ج۲)	احمد منزوی	۱۴۰۵هـ‍ق	فارسی
۸۴	فهرست مشترک نسخه های خطی فارسی پاکستان (ج۳)	احمد منزوی	۱۴۰۵هـ‍ق	فارسی
۸۵	فهرست چاپهای‌آثارسعدی در شبه قاره‌و...	سید عارف نوشاهی	۱۳۶۳هـ‍ق	فارسی
۸۶	شرح مثنوی (جلد اول)	شاه داعی شیرازی/ رانجها	۱۳۶۴هـ‍ش	فارسی
۸۷	شرح مثنوی (جلد دوم)	شاه داعی شیرازی/ رانجها	۱۳۶۴هـ‍ش	فارسی
۸۸	تکملة الاصناف (فرهنگ عربی به فارسی	علی بن محمد الادیب الکرمینی	۱۳۶۴هـ‍ش	عر.ف
۸۹	سعدی بر مبنای نسخه های خطی پاکستان	احمد منزوی	۱۳۶۳هـ‍ش	فارسی
۹۰	رساله نوریه سلطانیه	عبد الحق محدث دهلوی، دکتر سلیم اختر	۱۳۶۳هـ‍ش	ف .ا
۹۱	خلاصة جواهر القرآن فی بیان معانی لغات القرآن	ابو بکر اسحاق ملتانی / دکتر ظهور الدین احمد	۱۳۶۴هـ‍ش	ف.عر
۹۲	تاریخ عباسی(اردو)(نصف آخر)	شریف احمد شرافت نوشاهی (سید)	۱۳۶۴هـ‍ش	اردو

شماره ردیف	نام کتاب	مولف، مصحح ،مترجم شاعر	تاریخ چاپ	زبان
۹۳	فهرست مشترک نسخه های خطی فارسی پاکستان(ج۴)	احمد منزوی	۱۳۶۴هـش	فارسی
۹۴	گلستان سعدی، کریما (ضمیمه گلستان سعدی)	سید غلام مصطفی نوشاهی محمد سرفراز ظفر	۱۴۰۵ هـق	ف. پ
۹۵	شرح احوال و آثار میر سید علی همدانی	دکتر محمد ریاض خان	۱۳۶۴هـش	فارسی
۹۶	تاریخ پیشرفت اسلام	دکتر شهین دخت کامران مقدم صفیاری	۱۳۶۴هـش	فارسی
۹۷	گلستان سعدی (فارسی و انگلیسی)	سعدی شیرازی،آندرسون	۱۳۶۴هـش	ف.انگ
۹۸	از گلستان عجم (ترجمه با کاروان حلّه)	زرین کوب، دکترکلثوم سید دکتر مهرنور محمد خان	۱۳۶۴هـش	اردو
۹۹	کتاب شناسی اقبال	دکتر محمد ریاض خان	۱۳۶۴هـش	فارسی
۱۰۰	اقبال لاهوری و دیگر شعرای فارسی گوی	دکتر محمد ریاض خان	۱۳۶۴هـش	فارسی
۱۰۱	جهانگشای خاقان (تاریخ شاه اسماعیل)	دکتر الله دتا مضطر	۱۳۶۴هـش	فارسی
۱۰۲	فهرست مشترک نسخه های خطی فارسی پاکستان (ج۵)	احمد منزوی	۱۳۶۵هـش	فارسی
۱۰۳	فهرست مشترک نسخه های خطی فارسی پاکستان (ج۷)	احمد منزوی	۱۳۶۵هـش	فارسی
۱۰۴	ترجمه های متون فارسی به زبان های پاکستان	اختر راهی	۱۳۶۵هـش	فارسی
۱۰۵	فهرست نسخه های خطی فارسی بمبئی کتابخانهٔ کاما، گنجینه مانکجی	دکتر سید مهدی غروی	۱۳۶۵هـش	فارسی
۱۰۶	فهرست نسخه های خطی آذر، لاهور	سید خضر عباسی نوشاهی	۱۳۶۵هـش	فارسی
۱۰۷	مجموعهٔ قانون جزایی اسلامی ایران (ترجمهٔ انگلیسی)	دکتر سید علی رضانقوی (مترجم)	۱۳۶۵هـش	انگلیسی
۱۰۸	فهرست کتابهای فارسی چاپ سنگی و کمیاب کتابخانهٔ گنج بخش(ج ۱)	سید عارف نوشاهی	۱۳۶۵هـش	فارسی
۱۰۹	فهرست مشترک نسخه های خطی فارسی پاکستان(ج ۶)	احمد منزوی	۱۳۶۶هـش	فارسی
۱۱۰	فهرست مشترک نسخه های خطی فارسی پاکستان (ج۸)	احمد منزوی	۱۳۶۶هـش	فارسی

شماره ردیف	نام کتاب	مولف، مصحح ،مترجم شاعر	تاریخ چاپ	زبان
۱۱۱	فهرست مشترک نسخه های خطی فارسی پاکستان (ج۹)	احمد منزوی	۱۳۶۶هـش	فارسی
۱۱۲	فهرست مشترک نسخه های خطی فارسی پاکستان (ج۱۰)	احمد منزوی	۱۳۶۶هـش	فارسی
۱۱۳	یادداشتهای پراکندهٔ علامه اقبال	علامه اقبال / دکتر محمد ریاض	۱۳۶۷هـش	فارسی
۱۱۴	فهرست نسخه های خطی فارسی کتابخانهٔ همدرد (کراچی)	سید خضر عباسی نوشاهی	۱۴۰۹هـق	فارسی
۱۱۵	مثنوی شمس و قمر	خواجه مسعود قمی / آل داود	۱۳۶۷هـش	فارسی
۱۱۶	فهرست مشترک نسخه های خطی فارسی پاکستان (ج۱۱)	احمد منزوی	۱۳۶۹هـش	فارسی
۱۱۷	ثلاثهٔ غسّاله(کتاب شناسی)	حبیب‌الرحمن / عارف نوشاهی	۱۳۶۸هـش	فارسی
۱۱۸	فهرست کتاب های فارسی چاپ سنگی و کمیاب کتابخانهٔ گنج بخش(ج۲)	سید عارف نوشاهی	۱۳۶۹هـش	فارسی
۱۱۹	فهرست مشترک نسخه های خطی فارسی پاکستان (ج۱۲)	احمد منزوی	۱۳۷۰هـش	فارسی
۱۲۰	فهرست آثار چاپی شیعه در شبه قاره (بخش اول)	سید حسین عارف نقوی	۱۴۱۱هـق	ار.ف
۱۲۱	شرح احوال و آثار میر سید علی همدانی (چاپ دوم)	دکتر محمد ریاض خان	۱۳۷۰هـش	فارسی
۱۲۲	فهرست انتشارات مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان	دکتر محمد حسین تسبیحی	۱۳۷۰هـش	فارسی
۱۲۳	فرهنگ فارسی - اردو	دکتر سید باحیدر شهر یار نقوی	۱۳۷۰هـش	ف.ار
۱۲۴	مونس العشاق(منظومه)	عربشاه یزدی دکتر محموده هاشمی	۱۳۷۰هـش	فارسی
۱۲۵	تسهیل پیام مشرق	احمد جاوید		ف.ار
۱۲۶	فهرست مشترک نسخه های خطی فارسی پاکستان(ج۱۳)	احمد منزوی	۱۳۷۰	فارسی

شماره ردیف	نام کتاب	مولف، مصحح ،مترجم شاعر	تاریخ چاپ	زبان
۱۲۷	خلاصة الالفاظ جامع العلوم	مخدوم‌جهانیان جهانگشت/ دکتر غلام سرور	۱۳۷۱	فارسی
۱۲۸	شرح احوال و آثار عبد الرحیم خانخانان	دکتر سید جعفر حلیم	۱۳۷۱	فارسی
۱۲۹	تأثیر زبان فارسی بر زبان اردو	دکتر محمد صدیق خان شبلی	۱۳۷۱	فارسی
۱۳۰	مخزن الغرائب (ج۳)	دکتر محمد باقر	۱۳۷۱	فارسی
۱۳۱	مقدمه خلاصة الالفاظ جامع العلوم جامع العلوم	دکتر غلام سرور	۱۳۷۱	فارسی
۱۳۲	فلسفهٔ اخلاقی ناصر خسرو و ریشه های آن	شیر زمان فیروز	۱۳۷۱	فارسی
۱۳۳	مخزن الغرائب (ج۴)	احمد علی سندیلوی/ دکتر محمد باقر	۱۳۷۱	فارسی
۱۳۴	مخزن الغرائب(ج۵)	احمد علی سندیلوی/ دکتر محمد باقر	۱۳۷۲	فارسی
۱۳۵	فرهنگ اردو-فارسی(چاپ دوم)	دکتر سید با حیدر شهر یار نقوی	۱۳۷۲	فارسی
۱۳۶	اسئله و اجوبهٔ رشیدی(ج اول)	رشید الدین فضل الله همدانی	۱۳۷۱	فارسی
۱۳۷	اسئله و اجوبهٔ رشیدی(ج دوم)	رشید الدین فضل الله همدانی	۱۳۷۱	فارسی
۱۳۸	فهرست نسخه های خطی قرآن مجید در کتابخانهٔ گنج بخش	محمد نذیر رانجها	۱۳۷۲	فارسی
۱۳۹	دستور نویسی فارسی در شبه قاره	دکتر سیدحسن صدر الدین حاج سید جوادی	۱۳۷۲	فارسی
۱۴۰	شیخ شرف الدین احمد بن یحیی منیری	دکتر مطیع الامام	۱۳۷۲	فارسی
۱۴۱	مقام شیخ فخر الدین ابراهیم عراقی در تصوف اسلامی	محمد اختر چیمه	۱۳۷۲	فارسی
۱۴۲	مجموعهٔ سخنرانیهای نخستین سمینار پیوستگیهای فرهنگی ایران و شبه قاره(ج ۱)	دکتر شعبانی	۱۳۷۲	فارسی

شماره ردیف	نام کتاب	مولف، مصحح ،مترجم شاعر	تاریخ چاپ	زبان
۱۴۳	مجموعهٔ سخنرانیهای نخستین سمینار پیوستگیهای فرهنگی‌ایران و شبه قاره(ج۲)	دکتر شعبانی	۱۳۷۲	فارسی
۱۴۴	شعرای اصفهانی شبه قاره	دکتر ساجد الله تفهیمی	۱۳۷۲	فارسی
۱۴۵	دوبیتی های تاجیکی	دکتر عنایت الله شهرانی	۱۳۷۳	فارسی
۱۴۶	شاه همدان، میر سید علی همدانی	دکتر آغا حسین همدانی/ دکتر محمد ریاض	۱۳۷۴	فارسی
۱۴۷	مفتاح الاشراف لتکملة الاصناف (فرهنگ فارسی - عربی)	محمد حسین تسبیحی	۱۳۷۲	عر.ف
۱۴۸	نقد شعر فارسی در شبه قاره	دکتر ظهور الدین احمد	۱۳۷۴	فارسی
۱۴۹	خلاصة المناقب	نور الدین جعفربدخشی دکتر سیده اشرف ظفر	۱۳۷۴	فارسی
۱۵۰	کشف المحجوب	هجویری جلابی / دکتر محمد حسین تسبیحی	۱۳۷۵	فارسی
۱۵۱	فرهنگ اصطلاحات علوم ادبی	دکتر ساجد الله تفهیمی	۱۳۷۵	ف / ار
۱۵۲	تحول نثر فارسی در شبه قاره	دکتر محموده هاشمی	۱۳۷۵	فارسی
۱۵۳	ایرانی ادب	دکتر ظهور الدین احمد	۱۳۷۵	اردو

